تیسرا ایڈیشن
نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی

لغات روزمرہ

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی فہرست و تنقید
کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

شمس الرحمن فاروقی

لغات روزمرہ

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی فہرست و تنقید
کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی

لغات روزمرہ

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی فہرست و تنقید، کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

ISBN 969-9397-30-4

اشاعت اول، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۳

اشاعت دوم، کراچی، جولائی ۲۰۰۳

اشاعت سوم، نئی دہلی، ۲۰۱۱

اشاعت چہارم، کراچی، ۲۰۱۲

زیر اہتمام

آج کی کتابیں

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: (92-21) 35650623, 35213916

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

فہرست

اردو زبان کے سچے خدمت گذار اور

مطالعات اردو ادب کے ہر میدان کو اپنے نقوش پا سے روشن کرنے والے

بابائے اردو مولوی عبدالحق

کی روح باوضوح کو خراج عقیدت کے طور پر

کہ بابائے اردو کی تحریریں اب بھی ہماری رہنما ہیں

خورشید خرا امید و فروغے بہ نظر ماند

پیش لفظ اشاعت اول

اردو کی ادبی اور لسانی تہذیب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں لسان روزمرہ کی درستی، اظہار کی صفائی، محاورے کی صحت، اور بیان کی چستی پر تحریر و تقریر میں مسلسل غور کیا گیا ہے۔ شیخ احمد گجراتی مثنوی ''یوسف زلیخا'' (تاریخ تصنیف ۱۵۸۰ / ۱۵۸۵) میں کہتے ہیں کہ وزن کی درستی کی خاطر کسی کلمے کا تلفظ بگاڑنا ٹھیک نہیں، اور نہ ہی عبارت میں کسی قسم کی بے ربطی مستحسن ہے:

نہ بھوتک وزن تیں بولاں کو توڑوں   عبارت کو نہ گل سرپاؤں جوڑوں

شیخ احمد کی ''یوسف زلیخا'' کے کوئی ربع صدی بعد ملا وجہی نے مثنوی ''قطب مشتری'' (تاریخ تصنیف ۱۶۰۹ / ۱۶۱۰) میں یہ اصول بیان کیا کہ زبان وہی ٹھیک ہے جس میں اساتذۂ لسان کے عمل کی پابندی کی گئی ہو:

اسی لفظ کو شعر میں لیا ئیں توں   کہ لیایا ہے استاد جس لفظ کوں

میر عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' (تاریخ تصنیف، غالباً ۱۶۹۰) کو بنیاد بنا کر خان آرزو نے ''نوادرالالفاظ'' لکھی (زمانۂ تصنیف ۱۷۳۶ / ۱۷۳۸) جس میں بعض لسانی مسائل بھی معرض گفتگو میں آئے۔ پھر شاہ حاتم نے اپنے مختصر لیکن اہم دیباچہ ''دیوان زادہ'' (۱۷۵۵) میں معیاری زبان کے کچھ معاملات پر ضمنی اشارے کئے۔ سید انشا اور مرزا قتیل کی ''دریائے لطافت'' (تاریخ تصنیف، ۱۸۰۷) ہماری پہلی کتاب ہے جس میں زبان کے اکثر پہلوؤں پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے کچھ پہلے مولانا باقر آگاہ نے اپنی مثنوی ''گلزار عشق'' (۱۷۹۴) کے دیباچے میں، اور احمد علی خاں یکتا نے ''دستورالفصاحت'' (زمانۂ تصنیف ۱۷۹۸ تا ۱۸۱۵) میں بھی کچھ لسانی تاریخی بحثیں اٹھائی تھیں۔

ان کتابوں کے بعد ایک طویل سلسلۂ تصنیفات و مقالات ہے جن میں لسان روزمرہ اور محاورۂ اہل زبان کو موضوع بنایا گیا۔ میرا خیال ہے دنیا کی کم زبانیں ایسی ہوں گی جن کے بولنے والے

اس قدر خود آگاہ ہوں، جو معیاری اور غیر معیاری زبان کے بارے میں بیدار افکار کے خالق و حامل ہوں، اور جو اپنی زبان، خاص کر ادبی زبان اور روزمرہ کے انتخاب میں اس قدر توغل و انہماک رکھتے ہوں۔

اردو زبان اس وقت کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہے۔ اس میں سے ایک مسئلہ جس پر کماحقہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے، غیر زبانوں کے دباؤ کا ہے۔ آج اردو تحریر و تقریر میں انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اور طریق استعمال بے دریغ برتے جا رہے ہیں، [illegible] اس سے کہ ان الفاظ و طریق کو اردو سے کوئی مناسبت ہے کہ نہیں، یا اردو کو ان کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں۔ اچھے اچھے، سبک اور پاکیزہ و ٹکسالی اردو الفاظ و کلمات کی جگہ غیر اردو الفاظ و کلمات کو راہ دی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ "بلاغت"، جو زبان کا بنیادی خاصہ اور ضرورت ہے، یعنی مقتضائے کلام کے لئے مناسب الفاظ کا استعمال، اس پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ بے شک نئے استعمالات کا داخلہ کسی بھی زبان کی وسعت اور گیرائی کا ضامن ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان مصطلحات و استعمالات میں اتنی قوت اور صلاحیت ہے بھی کہ نہیں کہ انھیں زبان کی مملکت میں کوئی جگہ مل سکے۔ جو نئے مصطلحات بنائے اور استفسار کی کسوٹی پر کھرے اتریں گے، یا جن میں کوئی انوکھی خصوصیت اور دلربائی ہوگی، وہ رائج ہو جائیں گے، دوسروں کو تاریخ کے حاشیے پر بھی جگہ شاید نہ مل سکے۔

شمس الرحمن فاروقی کی یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنے مخصوص طرز کو کام میں لاتے ہوئے الفاظ و کلمات کی ایک بڑی تعداد کو علم، شعور زبان اور منطقی مشاہدے کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اگر انھوں نے غلط استعمالات کی مخالفت بے خوفی سے کی ہے تو پرانے بتوں کو توڑنے میں بھی انھوں نے کوئی کم ہمتی نہیں کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ فاروقی صاحب کی بات توجہ سے سنی جائے گی اور ان کے فیصلوں اور سفارشات سے اکثر اتفاق کیا جائے گا۔

بابائے اردو نے اردو لغت نگاری کے میدان میں بعض بنیادی اہمیت کے کام خود کئے تھے، اور دوسروں کو بھی لغت نگاری کے گر سکھائے تھے۔ انجمن کے صد سالہ جشن کے موقعے پر شمس الرحمن فاروقی کی اس کتاب کی اشاعت بابائے اردو کی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں ایک کاوش ہے۔ یقین ہے کہ اس حیثیت میں بھی اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

اردو گھر، نئی دہلی

خلیق انجم

فروری ۲۰۰۳

پیش لفظ اشاعت ثالث

یہ بات ہم سب کے لئے باعث مسرت ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کی اس قیمتی تصنیف کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ کتاب کا گذشتہ ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا تھا اور پاکستانی ایڈیشن بھی اب کمیاب تھا۔ لہذا شمس الرحمن فاروقی سے کہا گیا کہ وہ اس کا نیا ایڈیشن جلد تیار کر دیں۔ لیکن اس کام میں دیر لگتی گئی۔ اس دیر کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پچھلے ایڈیشنوں کے اغلاط حتی الامکان دور کر دیے گئے۔ بعض اندراجات بڑھائے گئے بعض کو از سر نو لکھا گیا بعض میں اضافے کئے گئے یا تصحیح کی گئی۔ کتاب کے بارے میں جو تبصرے اور مراسلے موصول ہوئے تھے، ان کی روشنی میں بھی فاروقی صاحب نے کتاب پر نظر ثانی کی۔ اس طرح یہ کتاب کم و بیش نئی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔ یقین ہے کہ حسب سابق اس کی بھی پذیرائی ہوگی۔

''لغات روزمرہ'' کے پاکستانی ایڈیشن میں بعض عنوانات جناب اجمل کمال کی فرمائش پر اضافہ کئے گئے تھے۔ اب وہ عنوانات مزید تصحیح یا اضافے کے بعد انجمن کے زیر نظر ایڈیشن میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) دیباچہ طبع ثانی (۲) منتخب کتابیات

(۳) صراحت اعراب (۴) فہرست الفاظ

اب فاروقی صاحب نے ایک اشاریہ اعلام شامل کر کے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

میں نے کتاب کے اول ایڈیشن کے پیش لفظ میں امید ظاہر کی تھی کہ فاروقی صاحب کی سفارشات اور فیصلوں سے اکثر اتفاق کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ امید بڑی حد تک پوری ہوئی ہے۔

خلیق انجم

اردو گھر، نئی دہلی

ستمبر ۲۰۰۹

دیباچہ از مصنف

(طبع اول)

زندہ زبانیں بدلتی رہتی ہیں۔ الفاظ و استعمالات کے رد و قبول کا مسلسل عمل اس تبدیلی، اور اس کے باعث زبان کی زندگی کا ضامن ہے۔ لیکن کسی وقت کسی زبان میں کیا ہو رہا ہے، جو تبدیلیاں آ رہی ہیں وہ کس نوعیت کی ہیں، وہ مستند رجحانات کی آئینہ دار ہیں یا سہل انگاری اور لاعلمی کا نتیجہ ہیں؟ ان سوالوں پر غور کرنا اور نئے پرانے الفاظ و استعمالات کو چھان بین کے عمل سے گذارنا بھی زبان کے سنجیدہ طالب علم کے اہم ترین فرائض میں ہے۔ تبدیلی کو آنکھ بند کر کے قبول کرنا، یا نئے پرانے لفظوں کو کسی مصنوعی تصور اصلاح یا تصور ارتقا کے دباؤ میں آ کر مسترد کرنا، یہ دونوں رجحانات ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والوں کا شیوہ نہیں۔

زیر نظر کتاب میں زیادہ تر بحث ان ناپسندیدہ الفاظ، فقروں، اور لسانی اختراعات سے ہے جو غیر ضروری طور پر، یا لکھنے بولنے والوں کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے باعث ہماری زبان میں در انداز ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں، بہت سے لغات کے مختلف فیہ تلفظ، یا جنس کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کچھ اندراجات ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق جدید روزمرہ سے شاید نہ ہو، لیکن جو لسانی یا تاریخی حیثیت سے دلچسپی کے حامل ہیں اور زبان کے طالب علم، یا اس کے سنجیدہ استعمال کرنے والے کے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ زبان ایک ایسی شے ہے جو بیک وقت ماضی اور حال میں موجود رہتی ہے اور اپنی دونوں حیثیتوں میں ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رواج عام کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، یعنی بالصلاحیت بولنے والوں کے قول اور عمل کو لغتی اور کتابی رایوں پر تفوق دیا گیا ہے۔ اس معاملے میں علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے تصورات

میرے عمومی رہنما رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک سوال استفادہ اور معلومات حاصل کرنے کا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ مہتمم بالشان اردو فارسی لغات کے علاوہ صحت زبان سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں میں امان اللہ (صاحب ''واضح الالفاظ''، ۱۷۰۸ء) اور خان آرزو (بالخصوص ''نوادر الالفاظ''، ۱۷۴۶ء) سے لے کر اثر لکھنوی، شان الحق حقی، اور رشید حسن خاں تک میں نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے۔ کبھی کبھی میں نے ان بزرگوں سے اختلاف بھی کیا ہے، لیکن ان کی دانش اور ان کے علم سے اکتساب نور کئے بغیر اس راہ میں مجھے ایک قدم بھی چلنا ممکن نہ تھا۔ میری گردن ان کے بار احسان سے ہمیشہ خم رہے گی۔ پروفیسر گیان چند اور ذکا صدیقی نے ان اوراق کے بعض مندرجات پر خیال افروز باتیں کہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ جمیلہ نے حسب معمول ہمت افزائی کے ساتھ میری نگہداشت بھی کی۔ لیکن ان کے ساتھ میرا کوئی حساب کم وبیش نہیں ہے، لہٰذا ان کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں علاقائی تلفظ اور استعمالات کو مناسب جگہ دی گئی ہے۔ میں بنیادی طور پر اس تصور کا مخالف ہوں کہ زندہ زبانوں کے معاملے میں کسی ایک شہر، یا علاقے، یا خطۂ ملک میں رائج قول وعمل تمام لوگوں کے لئے حجت کا حکم رکھتا ہے۔ اس غلط تصور کا ایک افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر اقبال کی زبان بہت سے لوگوں کے نزدیک مستند نہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اقبال ''اہل زبان'' نہ تھے۔

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) کے صد سالہ جشن تاسیس کے موقعے پر شائع ہو رہی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو زبان وادب کے دیگر میدانوں کی طرح لغت نگاری میں بھی اہل اردو کو نئی راہیں دکھائی تھیں۔ خدا ان کی تربت کو عنبریں کرے۔ میں یہ کتاب ان کو معنون کر کے اپنا ہی اکرام کر رہا ہوں۔ ان کا حق تو ہم اردو والے سب مل کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔

میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے ارباب حل وعقد، اور خاص کر اس کے صدر جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اور اس کے فعال معتمد عمومی ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو انجمن کے اشاعتی گوشوارۂ عمل میں شامل کیا۔ جناب خلیق انجم ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں کمال رکھتے ہیں، لیکن اس کتاب کی اشاعت کا انتظام وانصرام انھوں اس تعجیل سے کیا کہ علاء الدین کے جادوئی چراغ کا موکل بھی انگشت بدنداں رہ گیا ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

نوٹ

افسوس اور رنج کا مقام ہے کہ اس مختصر دیباچے میں جن بزرگوں کا ذکر زندہ شخصیات کے طور پر کیا گیا ہے، ان میں سے بعض اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اس وقت کے صدر انجمن پروفیسر جگن ناتھ آزاد، رشید حسن خاں، پروفیسر گیان چند، اور ذکا صدیقی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میں ان سب کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

مارچ ۲۰۱۰ شمس الرحمٰن فاروقی

پس نوشت

بعض ناگزیر حالات نے اس کتاب کو مارچ ۲۰۱۰ میں پریس جانے سے روک دیا۔ اب جناب خلیق انجم کے اصرار پر میں نے اس جنگ کو نکالا اور جھاڑ پونچھ کر، مزید تصحیحات کے بعد اسے ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ اضافوں اور تصحیحات کی کچھ تفصیل "دیباچہ طبع ثالث" کے تحت درج ہے۔ اس کتاب کی بھی تکمیل و اشاعت کا اہتمام جناب خلیق انجم کے اصرار پر ممکن ہو سکا ہے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔

مئی ۲۰۱۱ شمس الرحمٰن فاروقی

دیباچہ طبع ثانی

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرے عزیز دوست اجمل کمال نے اپنے موقر ادارے سے اس کتاب کی اشاعت منظور کر لی۔ اس طرح یہ ہندوستان و پاکستان کے اردو دوست حلقوں میں یکساں طور پر دستیاب رہے گی۔ حضرت بابا فرید گنج شکر صاحب نے جب سلطان الاولیا بابا نظام الدین کو اپنے پاس سے آخری بار رخصت کیا تو دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں علم نافع اور عمل مقبول عطا کریں۔ حضرت بابا صاحب کے اخلاف کی خاک پا ہونے کی وجہ سے میں بھی، اگرچہ نااہل ہوں، لیکن خود کو شاید اس دعا کی برکت کا مستحق سمجھ سکتا ہوں کہ اس کتاب کی تصنیف بھی عمل مقبول میں شمار ہو اور جس تھوڑے بہت علم (بلکہ اطلاع) کا صرف اس کتاب میں ہوا ہے، وہ میرے لئے اور میرے پڑھنے والوں کے لئے نافع ہو۔

عہد حاضر میں یہ دعا اردو کے سیاق و سباق میں شاید کچھ زیادہ ہی ضروری ہے کہ ان دنوں اس زبان پر جہاں طرح طرح کے ادبار ہیں، ان میں سب سے نمایاں ایک یہ ہے کہ لوگ صحیح زبان لکھنا اور اچھی زبان پہچاننا بھول گئے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی تنگ نظری اور کم کوشی کے دفاع بلکہ جواز میں کبھی نام نہاد اساتذہ کا حوالہ دیتے ہیں، تو کبھی عربی فارسی سے سند لاتے یا طلب کرتے ہیں۔ یہ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کی آزاد لسانی حیثیت جس طرح اور جس حد تک آج معرض خطر میں ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ اردو زبان کے ادبی محاورے اور روزمرہ کو ارتقا کرتے آج چھ سو برس سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ اس طویل مدت نے ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ لیکن بعض پرانے لفظ اور محاورے اب استعمال میں نہیں بھی رہ گئے ہیں۔ رد اور قبول کا یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہئے۔ لیکن ہمارے یہاں ایک وقت ایسا آ گیا تھا کہ ادبی زبان سے الفاظ کے اخراج کی رفتار بہت

تیز ہوگئی تھی، حتی کہ برآمدات کے مقابلے میں درآمدات کے کم پڑنے اور زبان کا ذخیرہ سکڑنے کا خوف پیدا ہونے لگا تھا۔

آج ہم پر دو طرح کی مصیبتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ''نئے'' الفاظ کے نام پر غیر اردو اور غیر معیاری الفاظ بے تکلف برتے جارہے ہیں۔ اس طرح اردو کے اصل، سبک، اور معنی خیز الفاظ و استعمالات پیچھے دھکیلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ لوگ ان کے وجود سے بھی بے خبر ہوگئے ہیں۔ اور دوسری مصیبت یہ ہے کہ معیاری اردو کا تصور ہمارے ذہنوں سے گم ہوتا جارہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بعض لوگ عربی اور فارسی سے بوجھل اردو کو معیاری قرار دیتے تھے۔ وہ ایک انتہا تھی۔ آج دوسری انتہا یہ ہے کہ اردو کے بعض ثقہ ادبا و علما بھی یہ کہتے ہوئے بیٹھے ہیں کہ لوگ وہی تو لکھیں گے جو وہ بولیں گے، اور وہی تو بولیں گے جو وہ سنیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادبی زبان، عوامی زبان، عامیانہ زبان، بازاری زبان، بازار وزبان، یہ سب فرق جو اہل اردو نے سیکڑوں برس کے ارتقا اور تفتیش و تفحص کے عمل کے نتیجے میں پیدا کیے تھے، اب مٹتے جارہے ہیں۔

بجا کہ زبان کی ترقی اور بقا کا بڑا راز اس کی قوت آخذہ و جاذبہ میں ہے۔ نئے الفاظ اور استعمالات کو ہمارے یہاں جگہ ملتی رہنی چاہیے۔ لیکن یہ الفاظ، محاورات، تراکیب، اور استعمالات وہی ہوں جن کا مرادف ہمارے پاس نہ ہو اور جو ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ عربی فارسی کو اردو پر تفوق دینا، اور اردو کو تلفظ اور استعمال کے معاملے میں عربی فارسی، خاص کر عربی کا پابند ٹھہرانا، اور معنی کے معاملے میں فارسی کا محکوم ٹھہرانا اپنی زبان کے ساتھ ظلم کرنا اور اپنی آزادی کو نا اہل لوگوں کے حوالے کردینا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ کو لکھا کہ آپ نے ''محاکمہ'' کے معنی میں Scrutiny استعمال کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ فارسی میں ''محاکمہ'' بمعنی ''مقدمہ'' (یعنی عدالتی کارروائی) ہے، آپ اسی معنی میں لکھیں تو بہتر ہے۔ ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا، ''آپ نے ''دیہات'' کیسے بول دیا، اور وہ بھی واحد کے طور پر؟ ''دیہ'' تو فارسی ہے، اس پر عربی کی ''ات'' جمع کیونکر لگ سکتی ہے؟ اور اگر لگا بھی لی جائے تو ''دیہات'' کو واحد نہیں، جمع بولنا چاہیے۔

ہمارے یہاں یہ غلط تصور رائج ہوگیا ہے کہ ''زبان تو اہل زبان/ اساتذہ کے گھر کی لونڈی ہے۔'' اس بات سے قطع نظر کہ یہ بات انتہائی توہین آمیز ہے، اس کا نقصان یہ بھی ہوا کہ ہر خود ساختہ

استاد نے زبان میں من مانی تبدیلیاں اور پابندیاں عائد کرنی شروع کر دیں۔ جس نے جو لفظ چاہا متروک قرار دے دیا۔ کیا یہ بات عبرت خیز نہیں کہ اردو کے سب سے معتبر لغت ''نوراللغات'' (مولف نیر کاکوروی) میں شروع کے پورے بارہ صفحات ''متروکات'' کی فہرستوں پر مشتمل ہیں؟ علاوہ ازیں، اردو کی اکثر کتابیں جولسان روزمرہ کے موضوع پر ہیں، مثلاً ''معیارالاملا'' از دیبی پرشاد سحر بدایونی، ''اصلاح''، مع ''ایضاح'' از شوق نیموی، ''افادات'' از خورشید لکھنوی، ''اصلاح سخن'' از صفدر مرزا پوری، ''متروکات سخن'' از حسرت موہانی''، ''غلط الکلام'' اور ''متروک الکلام'' از منیر لکھنوی، ''اقبال کی خامیاں'' از جوش ملسیانی، ''دستورالفصحا'' از حکیم مہدی کمال، ''اصلاح زبان اردو'' اور ''زباندانی'' از عشرت لکھنوی، ''صحت الفاظ'' از بدرالحسن، ''قاموس الالفاظ'' از سید مختار ہاشمی اور مولانا نازؔ ہیں۔ ان سب کا زور ''متروکات'' پر ہے، اور پھر اس بات پر کہ عربی فارسی الفاظ کو ''صحت'' کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ شیام لال کالڑا عابد پشاوری نے ''قاموس الاغلاط'' کا رد لکھا، ان کے زیادہ تر فیصلے ذاتی رائے اور استعمال عام کی روشنی میں تھے۔ عابد پشاوری سے پہلے رشید حسن خاں نے ''قاموس الاغلاط'' پر بہت عالمانہ کلام کیا تھا۔ انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ ''قاموس'' کے اس قدر بااثر ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اردو واحد زبان ہے جس کے علما اور شعرا نے زبان میں اضافہ کرنے پر نہیں، بلکہ اچھے بھلے الفاظ کو متروک قرار دینے پر فخر کیا ہے، اور اکثر علما اور شعرا اس بات پر بھی اڑتے رہے ہیں کہ ''عربی فارسی'' الفاظ کو ایک خاص تقدس حاصل ہے اور ابھی اردو لکھنے اور بولنے والے کو چاہئے کہ وہ اسے کسی بھی طرح مجروح نہ ہونے دے۔

ابھی حال میں ایک بہت ہی معتبر اور معمر شاعر کی کتاب چھپی ہے جس کا عنوان ہے: ''اردو غزل پر ہندی کے اثرات: مکمل جائزہ۔'' مصنف علام نے تمام عربی فارسی الفاظ کو ''اردو'' قرار دیا ہے اور سنسکرت، اپ بھرنش، اور دیگر قدیم زبانوں سے ہمارے یہاں دخیل یا اختراع کئے ہوئے الفاظ کو، خواہ وہ تت سم ہوں یا تدبھو، ''ہندی'' قرار دیا ہے۔ ان کی پوری کتاب ہمیں سکھاتی ہے کہ ''گاؤں، اوتار، بچار، جیون، سپنا، سہاگ، پانی، پیڑ، دھیان، کھڑکی، آنگن، ساگر، کٹھن، چھایا، امرت، جگ، سوکھا، جھنجھٹ، پنگھٹ، کہانی'' وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ ''ہندی'' ہیں، یعنی یہ الفاظ اپنی نوعیت میں اردو نہیں ہیں، ''ہندی'' سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو کیا پتہ کسی وقت کوئی ''استاد''

صاحبان "ہندی" الفاظ کو "متروک" یا "غیر اردو" کا درجہ عطا کر کے انھیں زبان سے باہر نکالنے کا حکم صادر کر دیں۔ اگر یہ آواز موثر ثابت ہوئی تو اردو کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ ہمارے مصنف علام کو کہنا چاہئے تھا کہ اردو کے بیشتر الفاظ کی بنیاد سنسکرت اور پراکرت اور دوسری اپ بھرنشوں پر ہے، اور یہ الفاظ اردو کے الفاظ ہیں، جس طرح مثلاً انگریزی لفظ Chit کی بنیاد اردو لفظ "چٹھی" ہے، لیکن Chit اردو کا لفظ نہیں ہے، انگریزی ہے۔ یا جس طرح "وگدھ" سنسکرت ہے، اس سے ہم نے "دودھ" بنایا۔ یہ اردو کا لفظ ہے، سنسکرت نہیں ہے۔ پھر، اردو نے دوسری ہندوستانی زبانوں، اور غیر ملکی زبانوں سے بھی بہت سے الفاظ، مصطلحات، اور استعمالات اختیار یا اختراع کئے ہیں۔ اب وہ لفظ اپنی نوعیت میں ہمارے اپنے ہیں۔

نئے الفاظ کو کھلے دل سے قبول کرنا، یا غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے لہجے اور مزاج سے ہم آہنگ کر کے اپنا لینا، ہماری زبان کی شانوں میں ایک بڑی شان ہے، اور اس صفت میں یہ انگریزی، روسی، اور ایک حد تک جرمن اور جاپانی سے ملتی جلتی ہے۔ اس بات پر فخر کرنا چاہئے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندی اور انگریزی کے بھونڈے اور غیر ضروری الفاظ کی بے محابا یلغار جو اچھی، معیاری اردو کی دیواروں کو ہلائے دے رہی ہے، اور کچھ عجب نہیں کہ اس کی بنیاد پر بھی اثر انداز ہو جائے، اس خطرے کا احساس عام کرنے، اور اس کا تدارک کرنے کے لئے کچھ کیا جائے۔ علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مدتوں پہلے کہی تھی کہ جب کسی زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کو بےچھان بین کے بغیر قبول کیا جانے لگتا ہے تو اس زبان کی قوت اختراع ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

نئے الفاظ کو بے شک اور بے کھٹکے قبول کرنا چاہئے اگر ان سے کوئی ایسا مقصد پورا ہو رہا ہے جو موجودہ الفاظ سے نہیں پورا ہو رہا ہے۔ نئے الفاظ وہی رائج ہو سکیں گے جو کسی ضرورت کو پورا کریں گے اور جو ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں گے، یا ان میں کوئی غیر معمولی تاریخی بات ہوگی۔ موجودہ ذخیرۂ الفاظ میں وسعت لانا ضروری ہے، لیکن اس شرط پر نہیں کہ ایک نیا لفظ زبان میں داخل ہو تو اس کے بدلے میں ایک یا دو لفظوں کو پس پشت رکھ دینا اور بالآخر بھول جانا پڑے۔ زبان کوئی کبڈی کا کھیل نہیں ہے۔

آج کل تنقیدی مضامین اور اخبارات میں اس طرح کے جواہر ریزے بکثرت نظر آتے ہیں:

(۱) انھوں نے اردو ادب کو کیا donate کیا ہے؟
(۲) میں ان کا جملہ کوٹ کر رہا ہوں۔ (یا۔۔۔ کوڈ کر رہا ہوں)۔
(۳) ال ال بی کا امتحان پاس کیے بغیر وکالت نہیں چلتی۔
(۴) جو کچھ مجھے معلوم ہے میں اسے صفحے پر scatter کر رہا ہوں۔
(۵) کل رات کو ہوئی مڈبھیڑ میں پولس نے پانچ مارے۔
(۶) سری لنکا نے آسٹریلیا کی ناپ ٹیم کو پچاس رنوں سے روند دیا۔
(۷) میرا ماننا ہے کہ اب بارش ہلکی پڑ رہی ہے۔
(۸) یہ تحریک صرف Paradigm کی تبدیلی کی نشان دہی کر رہی ہے۔
(۹) عظیم الشان بیانیے اب relevant نہیں رہے۔
(۱۰) ہمیں اردو کے کاز کے لیے لڑنا چاہیے۔
(۱۱) غالب کے سامنے نظیر کا ذکر کر کے ان کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔
(۱۲) اب اجازت دیجیے، اللہ حافظ۔
(۱۳) سرکاری لوگوں نے جو بھومکا نبھائی کیا اسے بھلایا جا سکتا ہے؟
(۱۴) چناؤ مہم کے لیے بڑے بڑے لوگوں کی سیوائیں حاصل کی گئیں۔
(۱۵) ہماری انڈسٹری بیرونی امداد پر ٹکی ہے۔

غور کیجیے کہ ایک طرف تو اچھے بھلے مستحکم اردو لفظوں کو نکال کر اردو تحریروں میں اخباری "ہندی" کی تاج پوشی کی جا رہی ہے، تو دوسری طرف ہر بھونڈے، کم معنی خیز، یا خلاف محاورہ اور غیر ضروری دیسی یا غیر ملکی لفظ کے گلے میں اردو کا تمغا لٹکایا جا رہا ہے۔ لیکن اس صورت حال سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، نپٹنے کی ضرورت ہے۔ زبان جاننے والوں کا فرض ہے کہ وہ نامناسب، غیر ضروری، مصنوعی، بھونڈے اور لاعلمی یا لاپروائی کی بنا پر درآمد یا اختراع کیے ہوئے الفاظ و مصطلحات کی مخالفت کریں۔ اگر وہ واقعی غیر ضروری اور کمزور ہیں تو وہ واماندۂ راہ ہو جائیں گے۔ جن

میں قوت یا محبوبیت ہے، وہ قائم رہیں گے۔ یہ عمل ہر زبان میں چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔ انگریزی میں اس کی دو نمایاں مثالیں ہیں: ایک تو ایچ۔ ڈبلیو۔ فولر (H. W. Fowler) اور اس کے بھائی فرانسس جارج فولر (Francis George Fowler) کی تصنیف *The King's English* (1906) ہے، اور پھر ۱۹۲۶ کی *The Dictionary of Modern English Usage* ہے۔ موخر الذکر پر دونوں بھائیوں نے بیس سال محنت کی، لیکن پہلی جنگ عظیم میں چھوٹے بھائی فرانسس کی موت کے بعد ہنری نے اسے تنہا پورا کیا۔ پہلی اور دوسری کتاب میں بہت فرق ہے، اور موخر الذکر کے جو ایڈیشن اب چھپے ہیں، وہ اور بھی مختلف ہیں۔ یعنی پچھلی کتابوں میں بہت سے استعمالات کو مسترد اور مردود قرار دیا گیا تھا لیکن بعد کی کتابوں نے ان میں سے اکثر کو قبول کر لیا ہے۔

اسی طرح، ایک وقت میں حکومت برطانیہ کو خیال آیا کہ دفتروں میں جو انگریزی لکھی جا رہی ہے وہ الجھی ہوئی، بھونڈی، خلاف محاورہ، اور غیر ٹکسالی الفاظ سے بھرپور ہے۔ لہٰذا ''سادہ انگریزی'' (Plain English) کی ایک تحریک چلائی گئی اور صورت حال کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے سر ارنسٹ گاورس (Sir Ernest Gowers) کی نگرانی میں ایک کتاب *The Complete Plain words* لکھی اور ۱۹۵۴ میں شائع کی۔ گذشتہ نصف صدی میں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ نام اس کا اب بھی وہی ہے، *The Complete Plain Words*، لیکن اب اس میں بہت سے استعمالات ایسے ہیں جو گذشتہ ایڈیشنوں میں غلط، یا غیر سادہ کہہ کر مسترد کر دیے گئے تھے۔ اب انھوں نے زبان میں جگہ بنالی ہے۔ یا یوں کہیے کہ ان میں سے اکثر کو ''فٹ پاتھ پر قبضہ جما لینے والوں کے حقوق'' (Squatters' Rights) حاصل ہو گئے ہیں اور اب انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ جب زبان بدلتی ہی رہتی ہے اور اس میں نئے مصطلحات، محاورات، استعمالات داخل ہی ہوتے رہتے ہیں تو پھر معیاری زبان پر اس قدر اصرار کیوں؟! اگر زندہ اور ترقی یافتہ زبانیں نئے الفاظ وغیرہ اپنے دائرے میں لاتی ہی رہتی ہیں تو ''غلط'' زبان کی شکایت کیوں؟ میرا خیال ہے اس سوال کا جواب میں گذشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن مزید وضاحت کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نئے الفاظ و مصطلحات کی مثال کسی ملک میں آنے والے غیر ملکی جیسی ہے جو ہمارے یہاں

شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نئے لوگ ملک میں آئیں، یہ اچھی بات ہے، لیکن یہ دیکھنا اشد ضروری ہے کہ ان کا آنا ضروری، یا فائدہ مند ہے کہ نہیں؟ یا اگر ضروری یا فائدہ مند نہ ہو تو نقصان دہ تو نہیں ہے؟ اسی طرح، تمام نئے مشکوک استعمالات اور الفاظ کو غور سے دیکھنا چاہئے اور ان کی مخالفت کرنا چاہئے۔ یا کم سے کم اتنا ہو کہ ان کی ہمت افزائی نہ ہو۔ اگر ہمت افزائی کی کمی، بلکہ گرم مخالفت کے باوجود کوئی لفظ ہمارے یہاں جم جاتا ہے تو یقیناً اس میں کوئی ایسی خوبی یا خوبصورتی ہے جس نے اسے مقبول کر دیا، یا پھر وہ کوئی ایسی ضرورت پوری کر رہا ہے جس کا ہمیں احساس تھا، یعنی جسے انگریزی میں felt need کہتے ہیں۔ بعض لفظ بس اس لئے چل جاتے ہیں کہ وہ اپنے اصل متبادل کے مقابلے میں آسان ہوتے ہیں۔ "دکھائی دینا" کے مقابلے میں "دکھنا" آسان ہے، اگرچہ "دکھنا" اب معیاری اردو نہیں ہے۔ میں کسی بچے کو "دکھنا" بولتے ہوئے سنتا ہوں تو فوراً ٹوکتا ہوں، "دکھنا نہیں، دکھائی دینا۔" وہ اپنی اصلاح کر لیتا ہے اور دوبارہ میرے ہی سامنے اور بدا کر "دکھنا" بولتا ہے۔ میں یہ لفظ نہیں بولتا، لیکن یقین ہے کہ "لغات روزمرہ" کا نیا ایڈیشن اگر بیس سال بعد کوئی تیار ہوا تو اس میں "دکھنا" کے بارے میں وہ نہ لکھا ہوگا جو میں نے اس ایڈیشن میں لکھا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کوئی زبان کبھی "بالکل خالص حالت" (Fully Pure State) میں نہیں ہوتی۔ لیکن "معیاری زبان" کا ایک خیالی تصور (Notional Concept) ہر ترقی یافتہ زبان میں ہوتا ہے۔ اردو میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ زبان کو برتنے والے وقتاً فوقتاً اسی خیالی تصور زبان سے استفادہ کرتے ہیں، اور ہر ترقی یافتہ زبان اسی تصور کے مطابق ارتقا کرتی ہے۔ ہندی میں سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ وہاں اب تک ایسا کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکا ہے۔

مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں بھی انجمن ترقی اردو کے صد سالہ جشن تاسیس کے زمانے میں شائع ہو رہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں یہ کتاب ہم سب کی طرف سے مولوی صاحب کو ایک حقیر سا خراج عقیدت ٹھہرے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

دیباچہ طبع ثالث

میں برادرم خلیق انجم، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کا شکر گذار ہوں کہ ان کی فرمائش اور ہمت افزائی کے نتیجے میں "لغات روزمرہ" کا تیسرا ایڈیشن آپ تک پہنچ سکا ہے۔ دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ کراچی) میں اول ایڈیشن کی بہ نسبت اندراجات زیادہ تھے۔ کئی اندراجات کی وضاحت، اور ضرورت ہوئی تو تصحیح کے لیے نئی عبارتوں کا اضافہ بھی کیا گیا۔ اغلاط کتابت کی تصحیح حتی الامکان کی گئی اور جناب اجمل کمال (ناشر کراچی ایڈیشن) کی فرمائش پر میں نے "منتخب کتابیات" اور "صراحت اعراب" کے عنوان سے نئی تشریحات بھی درج کیں۔ خود اجمل کمال نے "اشاریہ الفاظ" مرتب کر کے کتاب میں شامل کیا۔ ان اضافوں کی بدولت یہ دوسرا ایڈیشن کم و بیش ایک نئی ہی کتاب بن گیا۔ اب تیسرے ایڈیشن کے لیے میں نے اغلاط کتابت کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ کراچی ایڈیشن کے اضافوں کو برقرار رکھا ہے۔ علاوہ ازیں، متن کتاب میں نئے اندراجات کثرت سے بڑھائے ہیں اور پرانے اندراجات کے لیے بھی حسب ضرورت توضیحی عبارتیں شامل کی ہیں۔ اشاریہ الفاظ کو نئے اندراجات کی روشنی میں دوبارہ مرتب کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں، ایک نیا اشاریہ اسما بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان نئے اضافوں کے باعث نہ صرف یہ کہ کتاب نے دوبارہ ایک نئی کتاب کی حیثیت اختیار کر لی، بلکہ اس کی ضخامت بھی پہلے سے کوئی ڈیڑھ گنا ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ تمام نئے اندراجات کتاب کی افادیت میں بھی اضافہ کریں گے۔

زبان کے باب میں ایک بہت اہم بات ہم اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ لکھنے کی زبان اور بولنے کی زبان میں کئی طرح کے فرق ہوتے ہیں۔ اردو میں یہ فرق کم سے کم ہے، لیکن پھر بھی ہے، اور یہ فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کیونکہ انگریزی کے الفاظ آج کثرت سے بولے جا رہے ہیں اور ان کا اردو متبادل نہ تو دریافت کیا جا رہا ہے اور نہ بنایا جا رہا ہے۔ زبان کی ترقی اور مزید قوت

مندی کے لئے ضروری ہے کہ نئے لفظ زبان میں داخل ہوں۔ اس کا فطری طریقہ اور اصول یہ ہے کہ لفظ پہلے بولی زبان میں آتا ہے، پھر تحریری زبان میں۔ پھر اس کا متبادل بنانے یا دریافت کرنے کی منزل آتی ہے۔ بہت سے بدیسی لفظوں کا متبادل بنائے جانے یا دریافت ہونے کے پہلے وہ اپنی اصل شکل ہی میں (مقامی تحریفات کے ساتھ یا بغیر) رائج ہو جاتے ہیں۔ بہت سے بدیسی الفاظ کا متبادل بنا لیا جاتا ہے یا دریافت کر لیا جاتا ہے، لیکن وہ پوری طرح رائج نہیں ہوتا اور بدیسی لفظ ہی زبان میں قائم ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) لفظ Ticket کو علی حالہٖ قبول کر لیا گیا۔ ''ٹکٹ'' بمعنی ''ڈاک ٹکٹ'' کے لئے اردو میں لفظ ''ٹکڑا'' بولا جاتا تھا لیکن عام نہ ہوا اور بالآخر Postage stamp کے لئے ''ڈاک ٹکٹ'' اور پھر صرف ''ٹکٹ'' رائج ہو گیا۔ ریل کے ڈبے یعنی Compartment کے لئے لفظ ''کمرہ'' شروع میں بولا اور لکھا گیا، لیکن جلد ہی ''ڈبہ'' رائج ہو گیا۔ انگریزی لفظ Bogie بمعنی ''ریل کا بڑا ڈبہ'' جب زبان میں آیا تو اسے اصل شکل ہی میں قبول کر لیا گیا۔ (ملحوظ رہے کہ ان معنی میں یہ لفظ معیاری انگریزی میں نہیں ہے، ہم لوگوں نے بنا لیا ہے۔) انگریزی لفظ Operation بمعنی ''عمل جراحی'' کے لئے پہلے ''عملیہ'' اور پھر ''عمل جراحی'' بنایا گیا۔ ''عملیہ'' تو اب بالکل نہیں ملتا، لیکن تحریری اردو میں ''عمل جراحی'' اب بھی مل جاتا ہے اور میں بھی اسے ہی مرجح سمجھتا ہوں۔ اور فوجی اصطلاح Operation کے لئے تو ''عملیہ'' بہترین لفظ ہے۔ انگریزی لفظ Laboratory کے لئے لفظ ''معمل'' بنایا گیا تھا لیکن مقبول نہ ہو سکا۔ پھر بھی تحریری زبان کی حد تک میں اسے Laboratory پر ہر جگہ ترجیح دوں گا۔ ''ریڈیو'' کے لئے ''لاسلکی'' بنایا گیا لیکن بالکل نہ چلا۔ اب اس لفظ کو شاید کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔ انگریزی لفظوں Atom اور Atomic کے لئے ''جوہر'' اور ''جوہری'' بنائے گئے جو بہت مناسب لفظ ہیں۔ اب ہم اپنی جہالت کے باعث ان کی جگہ Atom اور ایٹمی بولتے لکھتے ہیں۔

اگر تحریری زبان اور بولنے کی زبان میں فرق قائم کیا جائے، جیسا کہ غیر زبانوں کے الفاظ کے لئے ضروری ہے، تو اوپر جو الفاظ زیر بحث آئے ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل کو تحریری زبان میں یقیناً استعمال ہونا چاہئے اور ان کی انگریزی اصل ترک ہونی چاہئے:

ڈاک ٹکٹ؛ جراحی؛ جوہر؛ جوہری؛ عملیہ؛ عمل جراحی؛ معمل

(۲) پہلے زمانے میں حسب ذیل انگریزی لفظوں کا متبادل اردو میں فوری طور پر موجود نہ تھا۔ اس لئے انگریزی ہی لفظ بے تکلف استعمال کئے گئے:

Autobiography; Biography/ Life; Criticism; Fact; Imagination; Literature; Nation; Nature; Review

پھر آہستہ آہستہ حسب ذیل متبادل اختیار کئے گئے اور اب ہر طرف متداول ہیں:

Autobiography = خود نوشت، خود نوشت سوانح حیات

Biography/ Life = سوانح، سوانح حیات

Criticism = تنقید

Fact = حقیقت، واقعہ

Imagination = تخیل، قوت متخیلہ

Literature = ادب

Nature = فطرت، قدرت

Review = تبصرہ

ملحوظ رہے کہ جس چیز کو ہم ''ادب'' بمعنی ''وہ تحریر جس میں کوئی لسانی یا حکیمانہ خوبی ہو'' کہتے ہیں، اس کے لئے یونانی، عربی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ میں کوئی لفظ نہ تھا۔ لفظ ''ادب'' بمعنی Literature عربی میں نہ تھا، بعد میں بنایا گیا اور پھر ہم لوگوں نے بھی اسے Literature کے معنی میں اختیار کر لیا۔

(۳) غیر زبان کا لفظ اگر خود اپنی زبان میں ترک ہو جائے اور اس کی جگہ نیا لفظ رائج ہو جائے تو بسا اوقات اردو میں بھی ایسا ہوا ہے۔ مثلاً ''فونوگراف'' جب انگریزی میں ترک ہوا اور اس کی جگہ ''گراموفون'' رائج ہوا تو ہم نے بھی اسے قبول کر لیا۔ ''سینما'' کی جگہ جب انگریزی میں ''فلم'' آ گیا تو ہم نے بھی اسے قبول کر لیا۔ انگریزی Aerodrome کے لئے ہمارے یہاں ''طیران گاہ'' بنایا گیا۔ ''ہوائی اڈا'' بھی بنایا گیا اور ''طیران گاہ'' کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوا۔ پھر جب وہاں Airport انگریزی میں رائج ہوا تو ہم لوگوں نے ''طیران گاہ'' اور ''ہوائی اڈا'' دونوں ہی کم و بیش بھلا دیے، لیکن میں تحریری زبان میں اب بھی ''طیران گاہ/ ہوائی اڈا'' بہتر سمجھتا ہوں۔

(۴) ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ فارسی نہ سہی عربی ہمارے لئے غیر زبان اور (قرآن پاک

اور دعاؤں وغیرہ کے باہر) نامانوس زبان ہے۔ عربی الفاظ ہمارے یہاں کثیر تعداد میں ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو صرف تحریری زبان میں رائج ہیں۔ اس صورت حال کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور نہ ہی عربی کے ان الفاظ کو اردو میں لانے کی ضرورت ہے جو اردو میں دخیل نہیں ہوئے ہیں۔ پھر بھی، اس بات کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ انگریزی، یا کسی غیر زبان سے ترجمہ کرتے وقت اگر اردو میں مناسب لفظ نہ ملے اور نہ ہی بنایا جا سکے تو پہلے فارسی، اور پھر عربی سے مدد لینا احسن اور انسب ہے۔ مثال کے طور پر، کوئی شے کتنی بار واقع ہوتی، یا وارد ہوتی ہے، اس کے لئے انگریزی لفظ Frequency بہت عمدہ ہے، کیونکہ یہ سائنس اور ادب اور شماریات وغیرہ ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں اور ہم لوگ بولنے اور لکھنے دونوں میں "فریکوئنسی" ہی برتتے ہیں۔ لیکن فارسی میں اس کے لئے نہایت عمدہ لفظ "بسامد" (بس+آمد) ہے۔ میں تحریر کی حد تک "بس آمد/بسامد" کو "فریکوئنسی" سے ہر جگہ بہتر سمجھتا ہوں۔ یا پھر انگریزی لفظ Sphere کے لئے ہمارے یہاں "کرہ" (اول مضموم) اور Atmosphere کے لئے "کرۂ ہوائی" موجود ہیں۔ تحریر میں انھیں ضرور استعمال کرنا اور انگریزی لفظوں کو ترک ہونا چاہئے۔ لیکن Hemisphere کے لئے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ عربی میں "نصف کرہ" اور فارسی میں "نیم کرہ" رائج ہیں۔ ہمیں تحریر کی حد تک ان دونوں کو قبول کر لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہونی چاہئے۔

زیر نظر کتاب میں انگریزی اور دوسری غیر اردو زبانوں کے الفاظ کے بارے میں مندرجہ بالا اصولوں کو حتی الامکان ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ سابق ایڈیشنوں کی طرح یہ ایڈیشن بھی مقبول ہو اور ہماری زبان میں غیر معیاری استعمالات کا سد باب کرنے میں مزید کارآمد ثابت ہو۔

اردو زبان اور اردو لغت نویسی کے میدانوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی لاثانی خدمات کے پیش نظر میں نے پہلے ایڈیشن کا انتساب ان کی روح کو خراج عقیدت کے طور پر کیا تھا۔ افسوس کہ چند دن ہوئے پروفیسر نذیر احمد کا انتقال ہو گیا۔ زمانۂ موجود کے عظیم ترین فارسی عالم اور ماہر لغت نویسی کے طور پر ایک دنیا ان کی معترف تھی۔ انھوں نے فارسی کے متعدد کمیاب اور نادر لغات کو دریافت اور عالمانہ تصحیح کے بعد شائع کر کے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی۔ اب ان جیسا شاید ہی پیدا ہو۔ میں ان کی ترقی درجات کے لئے دعا کرتا ہوں اور اس کتاب کے انتساب میں ان کو بھی شریک کرتا ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

الہ آباد، مارچ ۲۰۱۰/مئی ۲۰۱۱

شمس الرحمٰن فاروقی

منتخب کتابیات

آفاق بنارسی: ''معین الادب''، معروف بہ ''معین الشعرا''، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۳۴ [''معین الشعرا'']

ابو محمد سحر: ''اردو رسم الخط اور املا، ایک محاکمہ''، مکتبۂ ادب، بھوپال، ۱۹۹۹

اثر لکھنوی، نواب جعفر علی خاں: ''فرہنگ اثر''، جلد اول و دوم، از مصنف، لکھنؤ، ۱۹۶۱ [''فرہنگ اثر'']

---- ''فرہنگ اثر''، جلد سوم، مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ [''فرہنگ اثر'']

---- ''فرہنگ اثر''، جلد چہارم، مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ [''فرہنگ اثر'']

''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' (مدیر اعلیٰ [کے بعد دیگرے] بابائے اردو مولوی عبدالحق، ابواللیث صدیقی، فرمان فتح پوری، حنیف فوق، سحر انصاری، مرزا نسیم بیگ، رؤف پاریکھ) ۲۲ جلدیں تا حال، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ تا ۲۰۰۷ [''اردو لغت، تاریخی اصول پر'']

امان اللہ (۱۷۰۸): ''دافع الاغلاط''، نولکشور پریس، کانپور، ۱۸۹۸

امیر مینائی، منشی امیر احمد: ''امیر اللغات''، دو جلدیں، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۸۹۱، ۱۸۹۴ [''امیر اللغات'']

انشا، انشاء اللہ خاں اور قتیل، مرزا محمد حسن (۱۸۰۷): ''دریائے لطافت''، مطبع آفتاب عالمتاب، مرشد آباد، ۱۸۵۰ [''دریائے لطافت'']

اوحدالدین بلگرامی (۱۸۳۷): ''نفائس اللغات''، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۶ [''نفائس اللغات'']

بدر ابراہیم (قبل ۱۴۳۳): ''فرہنگ زفان گویا''، دو جلدیں، تدوین پروفیسر نذیر احمد، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۰، ۱۹۹۷ [''فرہنگ زفان گویا'']

بہار، ٹیک چند (۱۷۵۲ء): ''بہار عجم''، دو جلدیں، مطبع سراجی، دہلی، ۱۸۶۶ [''بہار عجم'']

---''بہارِ عجم'' دو جلدیں، بہ ترتیب تازہ از مولوی ہادی علی، و تصحیح از سید جلال شاہ، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۹ [''بہارِ عجم'']

تقی الدین اوحدی (مابین ۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷): ''سرمۂ سلیمانی'' تدوین جدید از محمود مدبری، مرکز نشر دانش گاہی، تہران، ۱۳۶۴ شمسی (=۱۹۸۵) [''سرمۂ سلیمانی'']

جلال لکھنوی، حکیم سید ضامن علی: ''سرمایۂ زبانِ اردو'' [''تذکیر سخنوراں''] مطبع جعفری، لکھنؤ، ۱۸۸۶ [''سرمایۂ زبانِ اردو'']

جلیل مانکپوری، حافظ جلیل حسن: ''تذکیر و تانیث'' دفتر دکن پریس، حیدرآباد، ۱۹۰۸

جمال الدین حسین انجو شیرازی (۱۶۰۵): ''فرہنگِ جہانگیری'' دو جلدیں، ناشر منشی نولکشور، مطبع ثمر ہند، لکھنؤ، ۱۸۷۶ [''فرہنگِ جہانگیری'']

حاجب خیرات دہلوی (۱۳۴۴): ''دستور الافاضل'' تدوین پروفیسر نذیر احمد، بنیاد فرہنگ ایران، نئی دہلی، ۱۳۵۳ شمسی (=۱۹۷۴) [''دستور الافاضل'']

چرنجی لال دہلوی: ''مخزن المحاورات'' مطبع محب ہند، دہلی، ۱۸۸۶ [''مخزن المحاورات'']

حسرت موہانی، مولانا سید فضل الحسن (۱۹۲۹): ''معائبِ سخن'' رئیس المطابع، کانپور، ۱۹۳۱

---''متروکاتِ سخن'' فوٹو کاپی مطبوعہ نگار پاکستان، کراچی، ۱۹۸۵

حقی، شان الحق: ''فرہنگِ تلفظ'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ [''فرہنگِ تلفظ'']

حکیم، سلیمان:

خانِ آرزو، سراج الدین علی (۱۷۳۰؟): ''چراغِ ہدایت'' برحاشیہ غیاث اللغات'' مطبع انوار احمدی، لکھنؤ، تاریخ درج نہیں [''چراغِ ہدایت'']

---(۱۷۴۳): ''نوادر الالفاظ'' تدوین ڈاکٹر سید عبداللہ، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۲

رشک، علی اوسط (۱۸۳۸): ''نفس اللغۃ'' اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۶۸

رشید حسن خاں: ''اردو املا'' ترقی اردو بیورو، حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۷۹

---''اردو املا'' ترقی اردو بیورو، حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۳

سحر بدایونی، دیبی پرشاد: ''رسالہ معیار الاملا'' نولکشور پریس، کانپور، ۱۸۹۷

سید احمد دہلوی، مولوی (۱۸۹۸ تا ۱۹۰۹): ''فرہنگِ آصفیہ'' چار جلدیں، ترقی اردو بورڈ، حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۷۴ [''فرہنگِ آصفیہ'']

سید سلیمان ندوی، علامہ: ''نقوش سلیمانی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۳۹

شاد، میر منشی محمد پادشاہ، باعانت شیخ محمد والد، المتخلص بہ عزیز، شیخ محمد ابراہیم (۱۸۸۸): ''فرہنگ آنند راج''، سات جلدیں، کتاب فروشی خیام، تہران، ۱۳۶۳ شمسی (= ۱۹۸۴) [''فرہنگ آنند راج'']

''شبد ساگر'' (مدیر اعلیٰ، شیام سندر داس): گیارہ جلدیں، ناگری پرچارنی سبھا، بنارس، ۱۹۷۵ تا ۱۹۸۹ [''شبد ساگر'']

''شمس اللغات'' (۱۸۰۳/ ۱۸۰۵) مطبع فتح الکریم، بمبئی، ۱۸۹۱/ ۱۸۹۲ [''شمس اللغات'']

شوق نیموی، علامہ ظہیر احسن: ''ازاحۃ الاغلاط'' قومی پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۳ [''ازاحۃ الاغلاط'']

صفیر بلگرامی: ''فیض صفیر'' [رشحات صفیر] نور الانوار پریس، آرہ، ۱۸۷۹

طاہر محسن علوی کاکوروی: ''فروق''، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۲۸

عابد پشاوری، شیام لال کالڑا: ''گاہے گاہے باز خواں''، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۹۳

عاشق (ما بین ۱۳۵۲ تا ۱۳۸۸): ''لسان الشعراء''، تدوین پروفیسر نذیر احمد، بنیاد فرہنگ ایران، نئی دہلی، ۱۹۹۵ [''لسان الشعراء'']

عبد الحفیظ بلیاوی، علامہ: ''مصباح اللغات''، دہلی، ۱۹۸۲ [''مصباح اللغات'']

عبد الرشید الحسینی (۱۵۲۵/ ۱۵۲۶): ''منتخب اللغات''، بر حاشیہ ''غیاث اللغات''، مطبع مجیدی، کانپور، تاریخ درج نہیں [''منتخب اللغات'']

عبد الستار صدیقی، ڈاکٹر: ''مقالات صدیقی''، جلد اول، لکھنؤ، یوپی اردو اکیڈمی، ۱۹۸۳

ـــــ ''اردو میں بعض غیر زبانوں کے لفظ''، مطبوعہ ''ہماری زبان''، نئی دہلی، شمارہ بابت ۲۲ جولائی ۱۹۹۶

عشرت لکھنوی، خواجہ عبد الرؤف: ''اصلاح زبان اردو''، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۰

ـــــ ''زبان دانی''، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۰

استاد علی اکبر دہخدا: ''لغت نامہ دہخدا''، لوح فشردہ (سی ڈی) شائع کردہ تہران یونیورسٹی [دہخدا]

غیاث الدین رامپوری، ملا (۱۸۲۶): ''غیاث اللغات''، بر حاشیہ بہار عجم، مطبع سراجی، دہلی، ۱۸۶۶ [''غیاث اللغات'']

فخر الدین مبارک شاہ قواس (۱۳۰۵): ''فرہنگ قواس''، تدوین پروفیسر نذیر احمد، رضا لائبریری، رامپور، ۱۹۹۹ [''فرہنگ قواس'']

فرمان فتح پوری: ''اردو املا اور رسم الخط''، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۷

کمال لکھنوی، حکیم مہدی: ''دستور الفصحا''، یوسفی پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۷

کیفی، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ: ''منشورات کیفی''، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹

---''منشورات''، مرتبہ گوپی چند نارنگ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۶۸

---کیفیہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۷۵

محمد بن ہندو شاہ نخجوانی (قبل ۱۳۵۹): ''صحاح الفرس''، باہتمام عبدالعلی طاعتی، تہران، ۲۵۳۵ (=۱۹۷۶)

محمد حسین تبریزی برہان (۱۶۷۳): ''برہان قاطع''، دو جلدیں، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۷، ۱۸۸۸

محمد لاد، مولوی (۱۵۱۹): ''موید الفضلا''، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۹

مسعود حسن رضوی ادیب: ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط''، کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۶۷

منیر لکھنوی: ''بازاری زبان اور اصطلاحات پیشہ وراں''، مطبع مجیدی، لکھنؤ، ۱۹۳۰

---''غلط العوام و متروک الکلام''، مطبع مجیدی، لکھنؤ، ۱۹۳۰

---''منیر البیان و تحقیق اللسان''، مطبع مجیدی، لکھنؤ، ۱۹۳۰

نارنگ، گوپی چند (مرتب): ''املا نامہ''، نیا ایڈیشن، ترقی اردو بیورو، حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۰

نیر کاکوروی، مولوی نور الحسن: ''نور اللغات''، چار جلدیں، لکھنؤ ۱۹۲۴ تا ۱۹۳۱ [''نور اللغات'']

Duncan Forbes (1866): *A Dictionary, Hindustani and English, Accompanied by a Reversed Dictionary, English and Hindustani*, U. P. Urdu Academy, Lucknow, rpt., 1987 [''ڈنکن فوربس'']

Fallon, S. W. (1879): A New Hindustani - English *Dictionary, with Illustrations, Hindustani Literature and Folk-Lore*, U. P. Urdu Academy, Lucknow, rpt., 1986 [''فیلن'']

Fazl-i Ali (1885): *A Dictionary of the Persian and English Languages*, Cosmo Publications, New Delhi, rpt., 1979 [''فضل علی'']

Lewis, Ivor: *Sahibs, Nabobs and Boxwallahs, A Dictionary of the world of Anglo-India*, OUP, New Delhi, 1997

McGregor, R. S.: *The Oxford Hindi-English Dictionary*, OUP, New Delhi, 1996

Platts, John T. (1884): *A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English*, OUP, 1974 ["پلیٹس"]

Shakespear, John: *Dictionary, Hindustani and English, with a Copious Index, fitting the work to serve, also, as a Dictionary, English and Hindustani*, London, 1834 ["شیکسپیئر"]

Steingass, F. (1865): *A Comprehensive Persian-English Dictionary, Oriental Reprints*, New Delhi, 1981 ["اسٹائن گاس"]

Steingass, F. (1884): *Arabic-English Dictionary*, Asian Educational Services, New Delhi, 2005

Sulaiman Haim: *One Volume English Persian Dictionary*, Tehran, 1967[سلیمان حئیم]

Thompson, Joseph T.,: *A Dictionary in Oriya and English*, Compiled from the Best Authorities and Arranged according to the English Alphabet, Serampore,1838

Wehr, Hans, edited by Cowan, J. M.,: *Arabic-English Dictionary*, New York, 1976 ["ہانس ویئر"]

Yule, Col. Henry, and Burnell, A. C., (1886): *Hobson-Jobson, A Glossary of Colloquial Anglo Indian Words and Pharases, and of Kindred Terms, Etymological, Historical, Geographical and Discursive*, New edition edited by William Crooke (1902), Rupa and Co., New Delhi, rpt., 1994["ہابسن جابسن"]

صراحتِ اعراب

الفاظ کا تلفظ بیان کرنے کے کئی طریقے ہیں، لیکن سب طریقوں کو مختصراً ''صراحتِ اعراب'' کہا جا سکتا ہے۔ لفظ ''اعراب'' مذکر ہے، اور بظاہر جمع لگتا ہے لیکن اسے ضرورت کے مطابق واحد کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، (مثلاً ''اس لفظ میں یہ اعراب نہیں آتا'')، اور جمع کے معنی میں بھی، (مثلاً ''انھوں نے سارے اعراب غلط لگائے'')۔ اپنی اصل میں یہ ''افعال'' کے وزن پر مصدر لازمی ہے، اور اس کے معنی ہیں، ''وہ حرکت جس کے ساتھ کسی حرف یا حرفوں کے مجموعے کو ادا کیا جائے۔''

مغربی زبانوں میں الفاظ کا تلفظ بیان کرنے کے لئے ایک پورا نظام وضع کیا گیا ہے جسے ''بین الاقوامی صوتیاتی علامات'' (International Phonetic Symbols) کہا جاتا ہے۔ خاص کر ان زبانوں میں جو رومن یعنی لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ یہ نظام اتنا جامع ہو کہ اس کے ذریعہ زبان کی تمام آوازوں کو صحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ چونکہ یہ علامتیں ذرا ذرا سے فرق کو بھی ملحوظ رکھ کر بنائی گئی ہیں، اس لئے ان کی تعداد بہت ہے، اور وہ اس قدر پیچیدہ ہیں کہ کم ہی لغات ان کو تمام و کمال استعمال کرتی ہیں۔ عام لغات اسی بین الاقوامی نظام کا سہل شدہ روپ استعمال کرتی ہیں، لیکن وہ بھی بہت پیچیدہ ہے اور اردو کا کوئی پریس شاید ہی ان علامتوں کے استعمال کے لئے ساز و سامان اور/ یا اہلیت رکھتا ہے۔

پرانے زمانے کے معیاری اردو یا فارسی لغات میں بھی لفظ کے اعراب بیان کرنے کا کوئی ایک طریقہ مقرر نہ تھا۔ بعض زیادہ ترقی یافتہ جدید لغات، مثلاً ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' (اردو لغت بورڈ، کراچی) کے مرتبین نے اعراب بیان کرنے کا اچھا لیکن ذرا بھاری اور سست رو طریقہ اختیار کیا ہے: جس حرف پر اعراب ہے، انھوں نے اسے پورا لکھا ہے، لیکن اعرابوں کے نام کو مختصر کر کے لکھا ہے۔ الفاظ کی جنس کو بھی مختصر کر کے لکھا گیا ہے۔ مثلاً لفظ ''اب'' کا اندراج حسب ذیل ہے:

اَب (۱) (یعنی لفظ ''اب'' کا یہ پہلا اندراج ہے۔)

(فت ا) الف (یعنی الف پر فتح [زبر] ہے اور یہ لفظ اسم مذکر [الف] ہے۔

یہ طریقہ مشکل الفہم لیکن مناسب بھی تھا، کہ لغت، خاص کر بڑے لغت میں جگہ کو بڑی جزرسی اور امساک سے استعمال کرتے ہیں، تاکہ صفحات کی تعداد قابو سے باہر نہ ہو جائے اور اندراجات بھی بیش از بیش تعداد میں شامل ہو سکیں۔

''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اعراب کے اصطلاحی نام دیے ہیں، مثلاً ''زبر'' کو ''فتحہ'' کہا ہے۔ یہ طریقہ بالکل ٹھیک ہے، کہ اگر ''زبر'' لکھا جائے تو چھپائی یا کتابت کی غلطی، یا کاغذ میں کسی جگہ سے بھی داغ کی بنا پر ممکن ہے کہ ''زبر'' کی جگہ ''زیر'' پڑھ لیا جائے۔ اعراب کے اصطلاحی نام ایسے ہیں کہ ان کو غلط لکھنے، یا ان کے پڑھنے میں کسی غلطی کے واقع ہو جانے کا امکان بہت ہی کم ہے، بلکہ سمجھئے کہ نہیں ہی ہے۔

الفاظ پر زیر زبر لگا کر بھی ان کے اعراب بتائے جا سکتے ہیں لیکن اس طریقے میں سہو کاتب اور عیب طابع کے کثیر امکانات ہیں۔ علاوہ بریں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اردو کے بہت سے الفاظ پر صحیح اعراب لگ ہی نہیں سکتے۔ بعض لفظ ایسے ہیں جن کے صرف اعراب لکھ دینے سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً عربی میں نون غنہ نہیں ہے، لہٰذا وہاں نون غنہ ظاہر کرنے کے لئے کوئی اعراب بھی نہیں۔ اردو والوں نے نون غنہ کو بتانے کے لئے مختلف علامتیں تجویز کی ہیں لیکن ان پر اتفاق نہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں بھی کتابت کے سہو، یا علامت کے ٹھیک نہ بننے، یا صاف نظر نہ آنے کے امکانات ہیں۔

بعض لفظ ایسے ہیں جن میں اعراب بھی ہے اور اس اعراب کی نمائندگی کسی حرف سے بھی ہے، یعنی وہاں اعراب اور اعراب بالحرف دونوں ہیں۔ مثلاً:

جواری؛ لوہار؛ [ان دونوں لفظوں میں واو بیکار ہے۔ ان کے پہلے حرف پر ضمہ (پیش) ہے، اور تلفظ اسی کا ہوتا ہے، واو کا نہیں۔]

ایڈیٹر؛ [یہاں الف اور دال کے بعد یاے کا کام محض اعراب بالحرف ہے، اس کی جگہ صرف کسرہ پڑھا جاتا ہے۔ انگریزی کے اکثر لفظوں کو ہم اعراب بالحرف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ مثلاً: الیکشن، ریستوراں، وغیرہ میں بھی یاے کا تلفظ صرف کسرہ ہے۔ اور موخر الذکر لفظ (ریستوراں) میں واو کا تلفظ بھی محض ضمہ ہے۔]

بعض لفظوں کا تلفظ موقعے موقعے سے بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً بہت سے لفظ جو چھوٹی ہ پر ختم ہوتے ہیں ان میں ہ کی آواز کی قیمت بدلتی رہتی ہے، یا مختلف لفظوں میں مختلف ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ میں محض

اعراب لکھنے سے کام نہ چلے گا۔

میں نے اس لغت میں اظہار اعراب کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ پرانے لغت نویسوں کے طریقے سے ملتا جلتا ہے، لیکن میں نے اس میں بعض باتیں اپنے طور پر بھی ڈالی ہیں۔ ان کی تفصیل یہاں بیان کرتا ہوں۔ لیکن ملحوظ رہے کہ میں نے ہر لفظ کے اعراب نہیں لکھے ہیں، اور کسی بھی لفظ کے سارے اعراب شاید ہی لکھے ہوں۔ میں نے اعراب ظاہر کرنے کا اہتمام صرف وہاں کیا ہے جہاں لفظ کا تلفظ زیر بحث تھا، یا جہاں امکان تھا کہ طالب علم کو صحیح اعراب نہ معلوم ہوں گے۔

اعراب

(۱) جہاں دو لفظوں کے درمیان اضافت ہے، اور اسے ظاہر کرنا ضروری سمجھا ہے تو اسے ''باضافہ'' یا ''باضافت'' یا ''مع اضافہ'' یا ''مع اضافت'' کہا ہے۔ کہیں کہیں اور بھی صاف کر کے لکھ دیا ہے کہ ان لفظوں کے درمیان اضافت ہے۔

(۲) جہاں دو لفظوں کے درمیان اضافت نہیں ہے، اور اس بات کو ظاہر کرنا ضروری سمجھا ہے تو اسے ''بے اضافہ'' یا ''بے اضافت'' کہا ہے۔ کہیں کہیں اور بھی صاف کر کے لکھ دیا ہے کہ ان لفظوں کے درمیان اضافت نہیں ہے۔

(۳) پیش کے لئے ''ضمہ'' (عربی، ضَمّہ) اور جس حرف پر ضمہ ہے، اسے ''مضموم'' کہا ہے۔ لہٰذا اگر کسی لفظ کی بحث میں لکھا ہے، ''اول مضموم''، تو مطلب ہے کہ اس لفظ کے پہلے حرف پر پیش ہے۔

(۴) جس حرف پر تشدید ہے اس کو ''مشدد'' (عربی، مُشَدَّد بروزن ''مقرر'') کہا ہے۔ اگر مشدد حرف پر کوئی اور اعراب بھی ہے تو اسے بھی مقررہ علامت (فتحہ، کسرہ، ضمہ) کے ذریعہ واضح کر دیا گیا ہے۔

(۵) حرف سب کے سب شمار میں لئے ہیں، خواہ وہ پورے لکھے جائیں یا آدھے، اور خواہ ان کا تلفظ پورا ادا کیا جاتا ہو یا نہ بھی کیا جاتا ہو۔ جس ترتیب سے حرف کسی لفظ میں آئے ہیں، اسی ترتیب سے انھیں اول، دوم، سوم، وغیرہ کہا ہے۔

(۶) وہ حرف جو بولنے میں نہیں آتے لیکن لکھے جاتے ہیں، انھیں حسب ضرورت معدولہ یا غیر ملفوظ کہا ہے۔ مثلاً ''خواب'' میں واؤ معدولہ ہے، اور ''بالکل'' میں الف غیر ملفوظ ہے۔

(۷) زبر کے لئے ''فتحہ'' (عربی، فَتحہ)، اور جس حرف پر فتحہ ہے، اسے ''مفتوح'' کہا

ہے۔ لہٰذا اگر کہیں لکھا ہے، ''اول مفتوح'' تو مطلب یہ ہے کہ لفظ زیر بحث کے پہلے حرف پر زبر ہے۔ یا اگر لکھا ہے کہ یہاں فتحہ ہے، تو مطلب یہ ہے کہ یہاں زبر ہے۔

(۸) زیر کے لئے ''کسرہ'' (عربی، کسْرَۃ)، اور جس حرف پر کسرہ ہے، اسے ''مکسور'' کہا ہے۔ لہٰذا اگر کسی لفظ کی بحث میں لکھا ہے، ''اول مکسور'' تو مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کے پہلے حرف پر زیر ہے۔ یا اگر لکھا ہے کہ یہاں کسرہ ہے، تو مطلب یہ ہے کہ یہاں زیر ہے۔

(۹) ساکن حرف کی نشاندہی عموماً نہیں کی ہے۔ لیکن جہاں کسی حرف کے بارے میں واضح کرنا ہے کہ یہ ساکن ہے، تو اسے ''ساکن'' یا ''موقوف'' کہا ہے۔ جیسے، ''الف لیلہ'' میں ''الف'' کو ساکن اور ''ف'' کو موقوف کہا ہے۔ ساکن حرف کے لئے کبھی کبھی ''سکون'' کی اصطلاح بھی برتی ہے۔ مثلاً اگر کسی لفظ کی بحث میں ''بسکون دوم'' کہا ہے تو مطلب یہ ہے کہ دوسرا حرف ساکن ہے۔

(۱۰) سکون کی تفصیل کے لئے اوپر نمبر ۹ ملاحظہ ہو۔

(۱۱) گنتی بیان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر حرف کو شمار کیا گیا ہے، خواہ ملفوظ ہو یا نہ ہو، اور ہر لفظ کے حروف کو گنتی کے اعتبار سے اول، دوم، سوم، وغیرہ لکھا ہے۔ مثلاً اگر کہیں لکھا ہے، ''اول مفتوح، دوم مکسور'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لفظ زیر بحث کا پہلا حرف مفتوح ہے اور دوسرا حرف مکسور۔

(۱۲) معدولہ: وہ حرف، خاص کر واؤ، جو بولنے میں نہ آئے، مثلاً ''خواب، خوش'' وغیرہ میں واؤ معدولہ ہے۔ ''معدولہ'' کے لغوی معنی ہیں ''میڑھی کی ہوئی، دبائی ہوئی چیز، چھوڑی ہوئی چیز''۔

(۱۳) ملفوظ، یا ملفوظہ، وہ حرف جو بولا جائے۔ اس کا الٹا ''غیر ملفوظ'' ہے، یعنی ''وہ حرف جو بولنے میں نہ آئے''۔

(۱۴) موقوف کی تفصیل کے لئے اوپر نمبر ۹ ملاحظہ ہو۔

(۱۵) ''واؤ'' کی آواز جیسی کہ ''بو بو، کوکو'' وغیرہ میں ہے، اسے معروف کہا گیا ہے۔ یعنی اگر ''امرود'' کی بحث میں لکھا ہے ''واؤ معروف'' تو مطلب یہ ہے کہ اس لفظ میں واؤ کو اسی طرح پڑھئے جس طرح ''بو بو، کوکو'' میں پڑھتے ہیں۔

(۱۶) ''واؤ'' کی آواز جیسی کہ ''جوش، شور'' وغیرہ میں ہے، اسے مجہول کہا ہے۔ لہٰذا اگر مثلاً ''اڑوس پڑوس'' کی بحث میں لکھا ہے، ''واؤ مجہول'' تو مطلب یہ ہے کہ اسے اسی طرح پڑھئے جس طرح ''جوش، شور'' میں پڑھتے ہیں۔

(۱۷) ''ی'' کی آواز جیسی کہ ''بی بی، شیشی'' وغیرہ میں ہے، اسے ''معروف'' کہا گیا ہے۔

مثلاً اگر ''ابابیل'' کی بحث میں لکھا ہے ''یائے معروف'' تو مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کو ا+ب+ی+ل، یعنی ''جبریل'' کا ہم قافیہ پڑھے۔

(۱۸) ''ے'' کی آواز جیسی کہ ''تیل، جیل'' وغیرہ میں ہے، اسے ''مجہول'' کہا ہے۔ مثلاً اگر لفظ ''شیر'' کی بحث میں لکھا ہے ''یائے مجہول'' تو مطلب یہ ہے کہ یہاں ''ے'' کو اسی طرح پڑھے جس طرح ''تیل، جیل'' میں ہے۔

(۱۹) اگر کہیں پر یائے، یا واؤ، کے پہلے والے حرف پر زبر ہے تو واؤ کی آواز کھل کر ''او''، اور یائے کی آواز کھل کر ''اے'' کی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں واؤ، یا یائے کے پہلے والے حرف کو حسب ضرورت ''مفتوح'' کہا ہے۔ مثلاً اگر ''سو'' کی بحث میں لکھا ہے ''اول مفتوح'' تو مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ ''لو، جو'' وغیرہ کا ہم قافیہ ہے۔ اور اگر ''مے'' کی بحث میں لکھا ہے ''اول مفتوح'' تو مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ ''نے، شے'' وغیرہ کا ہم قافیہ ہے۔

حروف کے نام

(۲۰) عام الف کو ہمیشہ ''الف'' کہا ہے۔ وہ الف جو ''ی/ى'' کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جیسے مصطفیٰ/مصطفٰی، اسے ''الف مقصورہ'' کہا ہے۔ جس الف پر مد ہے، یعنی جسے کھینچ کر پڑھا گیا ہے، اسے ''الف ممدودہ'' کہا ہے۔ بعض لفظوں میں واؤ پر کھڑا الف لگاتے ہیں لیکن پڑھتے صرف الف ہیں، جیسے ''حیوٰۃ، صلوٰۃ''، ایسے الف کو بھی صرف الف کہا ہے۔

(۲۱) ب کو عام طور پر ''ب''، اور کبھی کبھی ''بائے موحدہ''؛ ''موحدہ''؛ ''بائے تحتانی''؛ ''تحتانی'' کہا ہے۔ یہ سب بالکل ایک معنی رکھتے ہیں۔

(۲۲) پ کو عموماً ''پ'' اور کبھی کبھی ''پائے فارسی'' کہا ہے۔

(۲۳) ت کو عام طور پر ''ت''، اور کبھی کبھی ''تائے قرشت''؛ ''تائے فوقانی''؛ یا صرف ''فوقانی'' کہا ہے۔

(۲۴) ٹ کو عموماً ''ٹ''؛ اور کبھی کبھی ''تائے ہندی'' کہا ہے۔

(۲۵) ث کو عموماً ''ث''؛ اور کبھی کبھی ''تائے مثلثہ'' کہا ہے۔

(۲۶) ج کو ''جیم'' یا ''ج'' کہا ہے۔

(۲۷) چ کو عموماً ''چ''؛ اور کبھی کبھی ''جیم فارسی'' کہا ہے۔

(۲۸) ح کو عموماً ''ح''، یا کبھی کبھی ''حائے حطی''؛ یا ''بڑی ح'' کہا ہے۔

(۲۹) د کو "دال" یا "دال ابجد" کہا ہے۔

(۳۰) ڈ کو محض "ڈ" یا کبھی کبھی "دال ہندی" کہا ہے۔

(۳۱) ر کو محض "ر"، یا "رے"؛ یا کبھی کبھی "راے قرشت"؛ یا "راے مہملہ" کہا ہے۔

(۳۲) ڑ کو محض "ڑ"؛ یا کبھی کبھی "راے ہندی"؛ یا "راے ثقیلہ" لکھا ہے۔

(۳۳) ز کو محض "ز"؛ لیکن کبھی کبھی "زاے ہوز" یا "زاے معجمہ" کہا ہے۔

(۳۴) س کو زیادہ تر محض "س"؛ ورنہ "سین"؛ اور کبھی کبھی "سین مہملہ" لکھا ہے۔

(۳۵) ش کو صرف "ش"؛ ورنہ "شین" لکھا ہے۔

(۳۶) ص کو عموماً "ص"؛ کبھی کبھی "صاد"؛ اور کبھی "ص سعفص" کہا گیا ہے۔

(۳۷) ص کے بعد کوئی گنتی ہو تو وہاں یہ حرف "صفحہ" کا مخفف ہے۔ مثلاً "ص ۲۱" یعنی صفحہ ۲۱؛ اور "ص ص ۱۴ تا ۱۵" کا مطلب ہے "صفحہ بارہ سے پندرہ تک"۔

(۳۸) ض کو عموماً "ض"؛ اور کبھی کبھی "ضاد" لکھا ہے۔

(۳۹) ط کو اکثر "ط"؛ اور کبھی کبھی "طوے" لکھا ہے۔

(۴۰) ظ کو اکثر "ظ"؛ اور کبھی کبھی "ظوے" لکھا گیا ہے۔

(۴۱) ع کو "عین" لکھا گیا ہے۔ بعض جگہ "عین مہملہ" بھی لکھا ہے۔

(۴۲) غ کو عموماً "غین" لکھا گیا ہے۔

(۴۳) ف کو اکثر و بیشتر "ف" لکھا ہے۔ کبھی کبھی "فا" بھی لکھا ہے۔

(۴۴) ق کو اکثر "ق" اور کبھی کبھی "قاف" لکھا ہے۔

(۴۵) ک کو "ک"؛ یا "کاف"؛ یا شاذ حالات میں "کاف عربی" لکھا ہے۔

(۴۶) گ کو "گ"؛ یا کبھی کبھی "گاف فارسی" کہا ہے۔

(۴۷) ل کو عموماً "ل"؛ ہی "لام" لکھا ہے۔

(۴۸) م کو "م" لکھا ہے، یا "میم"۔

(۴۹) معجمہ: جس حرف پر کوئی نقطہ نہ ہو اس کے لئے "مہملہ"، اور جس پر نقطہ ہو اس کے لئے "معجمہ" کی صفت بھی کبھی استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی حرف کا نام لکھ کر اس کے آگے حسب ضرورت "مہملہ" [مثلاً سین مہملہ] یا "معجمہ" [جیسے زاے معجمہ] لکھ دیتے ہیں۔

(۵۰) مہملہ: دیکھئے معجمہ۔

(۵۲) و کو "واؤ" یا صرف "ؤ" لکھا ہے۔

(۵۳) ہ کو "چھوٹی ہ" لکھا ہے یا "ہائے ہوز"۔

(۵۴) ء کو ہمیشہ "ہمزہ" لکھا ہے۔ "الف" کبھی نہیں لکھا۔

(۵۵) ی کو "چھوٹی ی"، یا کبھی کبھی "یائے تحتانی"، اور کبھی صرف "تحتانی" لکھا ہے۔

(۵۶) ے کو "بڑی ے"؛ یا کبھی کبھی "یائے تحتانی"؛ اور کبھی صرف "تحتانی" لکھا ہے۔

(۵۷) اگر چھوٹی/ بڑی ی/ ے کی تخصیص مراد نہ ہو تو دونوں کے لئے "یائے" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

(۵۸) کبھی کبھی مرکب حالت میں، یا بعض اصطلاحی الفاظ [جیسے "الفبائی = Alphabetical] میں حرف کا عربی فارسی نام استعمال کرتے ہیں۔ سہولت کے لئے انھیں یہاں درج کرتا ہوں:

الف/ ہمزہ، با، بائے فارسی (پ)، تا، ثا، جیم، جیم فارسی (چ)، حا، خا، دال، ذال، را، زا، زائے فارسی (ژ)، سین، شین، صاد، ضاد، طوے، ظوے، عین، غین، فا، قاف، کاف، کاف فارسی (گ)، لام، میم، نون، ہا، واؤ، یا/ یائے۔

ملحوظ رہے کہ عربی ترتیب کے اعتبار سے "ہ" (ہائے ہوز) پہلے ہے اور "واؤ" بعد میں۔ تمام اردو کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی اردو ترتیب ہی اختیار کی گئی ہے۔

اردو حروف کے لئے عربی/ فارسی کے قیاس پر نام دیئے گئے ہیں: تائے ہندی (ٹ)، دال ہندی (ڈ)، رائے ہندی (ڑ)، ہائے دوچشمی (ھ)۔

اظہار تشکر

یہ کتاب ان بے شمار مصنفوں اور کتابوں کے بغیر ممکن نہ تھی جن سے میں نے حتیٰ المقدور استفادہ کیا ہے۔ حوالے کی جن کتابوں سے میں نے بہت سیکھا ان میں سے چند کے نام "منتخب کتابیات" کے تحت درج ہیں۔ لیکن یہ فہرست بہر حال ادھوری ہے۔ اشخاص میں جن بزرگوں کے فیض صحبت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

آل احمد سرور، احتشام حسین، رشید حسن خاں، مالک رام، محمد خلیل الرحمٰن فاروقی [میرے والد مرحوم] مسعود حسن رضوی ادیب۔

اس کتاب کو پڑھ کر جن لوگوں نے ذاتی مراسلت کے ذریعہ، یا تبصرہ لکھ کر، اظہار خیال کیا اور جن کے مشورے میں نے حتیٰ الامکان قبول کئے، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

اجمل کمال، بیدار بخت، چودھری محمد نعیم، ذکا صدیقی، شاہ حسین نہری، عبدالرشید، حافظ صفوان محمد چوہان، ظفر احمد صدیقی، علامہ سید عقیل الغروی، مولانا فیصل بھٹکلی ندوی، پروفیسر گیان چند۔

جناب بیدار بخت اور جناب حافظ صفوان محمد چوہان ایک مزید شکریے کے حقدار ہیں۔ بیدار بخت نے الگ سے اظہار خیال کے علاوہ "لغات روزمرہ" کا وہ نسخہ مجھے بھیج دیا جو ان کے مطالعے میں رہا تھا اور جس پر انھوں نے جگہ جگہ تصحیحات درج کی تھیں۔ حافظ صفوان نے "لغات روزمرہ" کے اس نسخے کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دی جو (اب مرحوم) پروفیسر وحید قریشی کے مطالعے میں رہا تھا اور جس پر ان کے استدراکات تھے۔ اب یہ تاریخی اہمیت کے حامل نسخے میرے کتب خانے کی زینت ہیں۔

میں نے حتیٰ الامکان مذکورہ علما کی رایوں سے استفادہ کیا ہے اور متن کتاب میں بھی ان کا حوالہ دے دیا ہے۔ عبدالرشید دہلوی کا تبصرہ میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام احتیاط، اصلاحات اور ترمیمات کے باوجود اگر اس کتاب میں اغلاط باقی ہیں تو ان کی ذمہ داری

سراسر میری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے تمام مبصرین اور اس کے بارے میں مراسلہ نگاروں کو خیر الجزاء سے نوازے۔

برادرم جناب خلیق انجم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ سے یہ تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرے ہمکاروں میں امین اختر، ریاض احمد کاتب، سید ارشاد حیدر اور نوشاد کامران کی محنتوں نے میرے کئی کام آسان کر دیے۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نوشاد کامران نے دونوں اشاریے نہایت توجہ اور محنت سے بنائے۔ یہ کام مجھے کرنا پڑتا تو اس کتاب کی اشاعت میں خدا جانے کتنی دیر اور ہوتی۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن اب میرے دوست اجمل کمال کے ادارے سے بھی شائع ہو رہا ہے۔ میں ان کا بطور خاص شکر گذار ہوں۔

الہ آباد، جولائی ۲۰۰۹ / مئی ۲۰۱۱

شمس الرحمٰن فاروقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات روزمرہ

آب یہ لفظ اگر "پانی" کے معنی میں ہو تو مذکر برتا جائے گا۔ اور اگر "چمک"، یا "عزت" کے معنی میں ہو تو مونث برتا جائے گا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر ؎

آبلوں سے پائے مجنوں کے جو ٹپکا آب گرم جل گیا کوئی کوئی خارِ مغیلاں گل گیا

ناسخ ؎

دانت تیرے دیکھتے ہی ہو گیا ناسخ شہید ہائے کیا ان موتیوں میں آب ہے شمشیر کی

آباداں بمعنی "آباد"، یہاں الف نون مزید علیہ ہے، جیسے "بہار" اور "بہاراں" یا "شاد" اور "شاداں"۔ معنی کے اعتبار سے الف و نون ان لفظوں میں کوئی کام نہیں کر رہا ہے۔ سر آسمان جاہ کے نام قطعے میں حالی کا شعر ہے ؎

یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں

آبادانی بمعنی "آباد ہونا، آبادی"۔ یہ "آباداں" پر یائے فاعلی لگا کر حاصل ہوا ہے۔ فارسی میں بھی ہے۔ "آباداں" اور "آبادانی" اردو میں پہلے مستعمل تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں اب یہ دونوں خوبصورت لفظ کچھ دن سے عام استعمال میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ "آباد/آباداں/آبادانی" سب ٹھیک ہیں، لیکن "بہاراں" سے "بہارانی" اور "شاداں" سے "شادانی" صرف اصولاً درست ہیں، عام بول چال میں نہیں ہیں۔ علامہ شاداں بلگرامی کے شاگرد جو اپنے کو "شادانی" لکھتے ہیں، اس میں یائے نسبتی ہے یعنی "شاداں سے منسلک"، وغیرہ۔

آب زیر گاہ "زیر" اور "گاہ" کے درمیان اضافت نہیں ہے، فقرے کے معنی ہیں، "پانی

جو نشیب میں ہو"۔ غالب ؎

نقش سطر صد تبسم ہے بر آب زیر گاہ حسن کا خط پر تہاں خندیدنی انداز ہے

دیکھیے:"گاہ"۔

آب سیاہ اردو میں اس فقرے کے ایک معنی "شراب" بھی ہیں۔ فارسی میں یہ معنی نہیں ہیں۔ اثر لکھنوی نے لکھا ہے کہ "آب سیاہ" اردو میں نہیں ہے، "کالا پانی" بمعنی "شراب" کی فارسی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "آب سیاہ" بمعنی "شراب" فارسی میں ہے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ ترکیب اہل اردو نے بنائی ہے اور صرف اردو ہے۔ میر کا شعر ہے (مثنوی "اعجاز عشق") ؎

مجھے مست آب سیہ دے کے کر چلوں جوں قلم پھر میں مطلب اپر

فارسی میں "آب سیاہ" کے ایک معنی "سمندر" ہیں۔ اردو میں بھی یہ معنی کبھی رائج تھے، لیکن اب مستعمل نہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں ہندوستانی لوگوں کے جزائر انڈمان نکوبار میں قید، یا جلاوطن کیے جانے کو "کالا پانی ہونا" بولتے تھے۔ یہ فقرہ اور یہ معنی بھی اب نہیں ہیں۔

آبشار آج کل یہ لفظ بلا شبہ مذکر ہے، لیکن پہلے زمانے میں، بلکہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک اسے مونث کہا جاتا تھا۔ "نور اللغات" جلد اول، مطبوعہ ۱۹۲۴، اور آفاق بنارسی کی "معین الشعرا" مطبوعہ ۱۹۳۴ میں اسے مونث لکھا ہے۔ "نور اللغات" میں امیر مینائی کا شعر سنداً درج ہے اور "معین الشعرا" میں امیر مینائی کے اسی شعر کے ساتھ انشا اور نوازش لکھنوی کے بھی شعر درج ہیں۔ لیکن "معین الشعرا" میں شہید الدین احمد کے رسالہ تذکیر و تانیث کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرزا مہدی قبول نے یہ لفظ مذکر باندھا ہے۔ اس پر "معین الشعرا" کا استدراک ہے کہ "اس کا اتباع نہیں کیا گیا۔" صاحب "معین الشعرا" کی بات جلد ہی نادرست ثابت ہو گئی ہو گی، کیونکہ اب یہ لفظ ہمیشہ مذکر سنا جاتا ہے اور اس کا پورا امکان ہے کہ پہلے بھی اسے کبھی کبھی مذکر بولا جاتا ہو، کیونکہ پلیٹس (۱۸۸۵) اور شیکسپیئر (۱۸۳۴) نے اسے مذکر اور مونث دونوں لکھا ہے۔

"اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں "آبشار" کو مذکر اور مونث دونوں لکھا ہے۔ تذکیر کے ثبوت میں میر کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

ادھر کے تئیں ایک تھا آبشار　　وہ البتہ شایان سیر و شکار

یہ شعر میر کے ''شکار نامۂ اول'' میں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی قدیم سند ''آبشار'' کی تذکیر کے بارے میں نہیں مل سکی۔ اثر لکھنوی نے ''نور اللغات'' پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس نے بھی کسی آبشار کی روانی اور زور و شور دیکھا ہے وہ اسے مونث نہیں کہہ سکتا۔ ''پانی کا حجم اور زور و شور کے ساتھ بلندی سے گرنا اس کی تانیث کے منافی ہیں۔'' اس بات سے قطع نظر کہ آبشار چھوٹے بھی ہوتے ہیں، یہ اصول ہی درست نہیں ہے کہ زور، طاقت اور رعب ظاہر کرنے والے الفاظ مذکر ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ''مذکر اور مونث الفاظ کی پہچان، اردو میں''۔ اثر لکھنوی مزید لکھتے ہیں کہ انھیں ''آبشار'' کی تذکیر کے لئے سند کی تلاش پھر بھی رہی، اور آخر انھیں محمد حسین جاہ کی ''طلسم فصاحت'' میں یہ فقرہ مل گیا: پہاڑیوں سے آبشار گرتا۔ گھاٹیوں سے جھرنا جھرتا۔

''طلسم فصاحت'' کئی بار چھپی ہے (اول اشاعت، ۱۸۷۰)۔ معلوم نہیں اثر صاحب نے کس ایڈیشن سے مذکورہ عبارت نقل کی ہے۔ میرے پاس ۱۸۸۱ کے ایڈیشن کے اس نسخے کی نقل ہے جو آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں صفحہ ۲۲ پر حسب ذیل عبارت ہے: پہاڑوں سے آبشار ہوتا۔ گھاٹیوں سے جھرنا جھرتا۔ اگر منقولہ بالا متن صحیح ہے تو محمد حسین جاہ نے ''آبشار'' کو ''جھرنا'' یا Waterfall کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے فوراً ہی ''جھرنا جھرتا'' لکھا ہے۔ ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ پہاڑوں پر سے پانی کی بوچھاریں آ رہی تھیں، یا پانی جگہ جگہ سے گر رہا تھا، جھرنے کی طرح نہیں، بلکہ سطح کوہ سے لگ کر۔ اسی لئے انھوں نے ''آبشار ہوتا'' لکھا ہے، گویا پانی نیچے آ رہا تھا۔ میر کے شعر سے بھی یہ معنی نکل سکتے ہیں (ایک جگہ ایسی تھی جہاں پانی پہاڑ سے نیچے اتر رہا تھا)۔ شیخ تصدق حسین کی داستان ''کوچک باختر'' (اول اشاعت، بعد ۱۸۹۲ اور قبل ۱۹۰۱) میں کسی کا شعر درج ہے (ص ۲۷۵)

پتھر سے کہیں جبیں جو پھوٹی　　اک خون کی آبشار چھوٹی

''نور اللغات'' میں لکھا ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے ''آب'' اور ''شار'' کا، اور ''شار'' بمعنی ''کھلا، اونچائی کا راستہ'' ہے۔ لیکن ''آنند راج'' میں کچھ اور ہی درج ہے۔ صاحب ''آنند راج'' نے ''شار'' کے ایک معنی ''راہ کشادہ و فراخ'' ضرور بتائے ہیں، لیکن ایک معنی ''فرو ریختن آب و

شراب مانند آبشار و سرشار'' بھی لکھے ہیں۔ ''جہانگیری'' سے ان معنی کی تصدیق ہوتی ہے، بلکہ ''آنندراج'' نے ''جہانگیری'' ہی کی عبارت نقل کی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ''آبشار'' پہلے اس پانی کو کہتے تھے جو بلندی سے، مثلاً پہاڑ سے گرتا، یعنی لڑھکتا ہوا آتا ہے، اور یہ لفظ مذکر تھا۔ ان معنی میں انگریزی میں Cascade اور Cataract بولا جاتا ہے۔ ''جھرنا'' Waterfall کے معنی میں تھا، اور مذکر تھا۔ آہستہ آہستہ ''آبشار'' اور ''جھرنا'' کم و بیش ہم معنی ہو گئے، یعنی Waterfall اور Cataract دونوں کو ''جھرنا'' اور ''آبشار'' موقعے کی مناسبت سے کہنے لگے۔ ''جھرنا'' مذکر تھا ہی، اب ''آبشار'' کی تانیث بالکل غائب ہو گئی اور وہ صرف مذکر رہ گیا۔ موجودہ بول چال میں عموماً چھوٹے آبشار کو ''جھرنا'' اور بڑے آبشار کو ''آبشار'' کہا جاتا ہے۔

آپریشن انگریزی لفظ Operation بمعنی ''عمل جراحی'' کے لئے پہلے ''عملیہ'' اور پھر ''عمل جراحی'' بنایا گیا۔ ''عملیہ'' تو اب بالکل نہیں ملتا، لیکن تحریری اردو میں ''عمل جراحی'' اب بھی مل جاتا ہے اور میں بھی اسے ہی مرجح سمجھتا ہوں۔ اور فوجی اصطلاح Operation کے لئے تو ''عملیہ'' بہترین لفظ ہے۔

آ پہنچنا ''پہنچ جانا، آجانا'' کے معنی میں یہ محاورہ ہندی والوں نے عام کیا ہے۔ اردو میں یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب حیرت، یا ناخوشی، یا تنبیہ کا اظہار کرنا ہو۔ یا پھر کچھ سعی و جہد کے بعد کہیں پہنچ جانے کا بیان ہو۔ غالب ؎

بعد از اتمام بزم عید اطفال ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال

امداد علی بحر ؎

وصل جاناں نہ ہوا وقت وصال آ پہنچا وائے حسرت کہ رہی دل کی تمنا دل میں

اس کے برخلاف، ہندی میں اس طرح لکھا اور بولا جانے لگا ہے:

غلط: دلی جانے والی گاڑی امرتسر سے آ پہنچی۔

غلط: سارے کھلاڑی آ پہنچے۔

غلط: انڈین ایرلائنس کی اڑان لکھنؤ سے آپہنچی ہے۔

غلط: اب وہ گھڑی آپہنچی ہے جس کا انتظار تھا۔

افسوس کہ بعض اردو والے بھی اس طرح لکھنے لگے ہیں۔ یہ سارے استعمالات خلاف محاورہ اور واجب الترک ہیں۔

آتش

اردو میں لفظ ''آتش'' کا تلفظ بروزن ''ترکش'' بفتح سوم ہی رائج اور درست ہے۔ بعض لوگ اس لفظ میں سوم مکسور (بروزن ''بارش'') بولتے ہیں۔ رائج تلفظ بفتح سوم (بروزن ''ترکش'') ہے اور اب یہی مرجح ہے۔ ''برہان قاطع'' میں اس کا تلفظ سوم مکسور سے لکھا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ لفظ دراصل ''آدش'' تھا، پھر ''آتیش'' ہوا، اور بعد میں اس نے موجودہ صورت اختیار کی۔ بعد کے لوگوں نے یہ رائے نہیں تسلیم کی ہے۔ ''آنندراج'' میں اس کا تلفظ صرف بفتح سوم لکھا ہے، یعنی صاحب ''آنندراج'' کی نظر میں ''آتش'' بروزن ''بارش'' کا وجود ہی نہیں۔ امیر مینائی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ اسے بروزن ''بارش'' کہتے ہیں، لیکن اردو کے فصحا کے یہاں بر وزن ''ترکش'' ہی دیکھا گیا ہے۔ ''نوراللغات'' میں یہی رائے ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں درج ہے۔ صاحب ''آصفیہ'' نے ''آتش'' کو صرف بفتح سوم لکھا ہے۔ پھر انھوں نے ایک لمبا حاشیہ بھی درج کیا ہے جس میں سوم مفتوح اور سوم مکسور پر گفتگو ہے۔ ان کا فیصلہ یہی ہے کہ اسے بفتح سوم بولنا چاہئے۔

ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ''آتش'' کے ساتھ جو لفظ اردو میں مستعمل ہیں، ماسوائے ''آتشک''، ان سب میں سوم مفتوح ہی ہے، (''آتش بازی''؛ ''آتش دان''؛ ''میر آتش''؛ ''آتش کدہ''؛ ''آتش غضب''؛ وغیرہ)۔ صاحب ''آصفیہ'' نے تو ''آتشک'' کو بھی بفتح سوم لکھا ہے۔ شیکسپیر نے ''آتش'' کو بفتح سوم اور بکسر سوم دونوں طرح لکھا ہے، لیکن ''آتش'' سے بننے والے تمام الفاظ (بشمول ''آتشک'') میں سوم مفتوح ہی بتایا ہے۔ اس کے برعکس شان الحق حقی نے اپنی ''لغات تلفظ'' میں ''آتش'' کو صرف بکسر سوم لکھا ہے، اور اس سے بننے والے تمام الفاظ (''آتش کدہ''؛ ''آتشناک''؛ ''آتش بازی''؛ وغیرہ) کو بھی بکسر سوم لکھا ہے۔ بیدار بخت کا کہنا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ''آتش بازی'' بکسر دوم ہی سنا ہے اور وہ بھی اسی طرح بولتے بھی

ہیں، لیکن ''آتش'' کے بارے میں انھوں نے کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔
''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''آتش'' بکسر سوم اور بفتح سوم، دونوں طرح لکھا ہے، لیکن بکسر سوم کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ ''آصفیہ'' میں بفتح سوم کی کئی اردو فارسی اسناد مذکور ہیں۔ صاحب ''آصفیہ'' نے ''جہانگیری'' کے حوالے سے مولانا روم کا ایک شعر نقل کیا ہے جس میں ''آتش'' کو ''تابش'' کا قافیہ کیا گیا ہے۔ لیکن ''آصفیہ'' میں یہ بھی لکھا ہے، اور صحیح لکھا ہے کہ چونکہ حرف روی کے ماقبل حرف کی حرکت میں اختلاف روا ہے، لہٰذا ''آتش/ تابش'' کے قافیے سے ''آتش'' کا تلفظ بکسر سوم ثابت نہیں ہوتا۔ (''جہانگیری'' کے مطبوعہ نولکشوری نسخے میں لفظ ''آتش'' نہیں درج ہے، ''آتشیزہ'' البتہ درج کر کے اسے صاحب ''جہانگیری'' نے سوم مفتوح لکھا ہے)۔
مختصر یہ کہ دہلی میں اب بھی ''آتش'' بروزن ''بارش'' رائج ہے، چاہے بہت عام نہ ہو۔ دہلی کے باہر بول چال میں ''آتش'' بروزن ''ترکش'' ہی عام ہے۔ ''آتش'' سے بننے والے الفاظ میں بھی ''آتش'' اب زیادہ تر بفتح سوم ہی بولا جاتا ہے۔

آچار ''نور اللغات'' میں ہے کہ اردو میں صرف ''اچار'' ہے، اور فارسی میں صرف ''آچار'' ہے۔ ''فرہنگ آنندراج'' میں بھی ''اچار'' درج نہیں، صرف ''آچار'' ہے، اور لکھا ہے کہ یہ مصدر ''آچاریدن'' بمعنی ''آمیختن'' کا حاصل مصدر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو فارسی دونوں میں ''آچار'' بھی ہے اور ''اچار'' بھی۔ ''شمس اللغات'' سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فارسی میں ''اچار'' بھی ہے۔ اردو میں ''آچار'' آج بھی کہیں کہیں بولا جاتا ہے، اور نظیر اکبر آبادی کا شعر ہے ؎

جلدی سے کچو مر کیا تیار چوہوں کا کیا زور مزے دار ہے آچار چوہوں کا

''آچار/ اچار'' کے ساتھ ''بنانا'' اور ''ڈالنا'' مستعمل ہیں، دونوں کے معنی ایک ہیں: ''تیار کرنا''۔ دیکھیے ''بنانا''۔

آراضی بمعنی ''زمین، زمینیں''۔ اصل میں ''اراضی'' ہے، لیکن عام طور سے زبانوں پر الف ممدودہ کے ساتھ ''آراضی'' ہے۔ شیکسپیئر اور پلیٹس میں ''آراضی'' کا ذکر نہیں، لیکن امیر مینائی نے

لکھا ہے کہ لوگ لاعلمی کے سبب "اراضی" کو "آراضی" بولتے ہیں۔ دیبی پرشاد سحر بدایونی نے بھی "آراضی" کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لفظ "آراضی" کوئی سو، سوا سو برس سے رائج ہے۔ فی الحال دونوں کو درست ماننا چاہئے۔ اور قوی امکان ہے کہ کچھ دنوں بعد "اراضی" بالکل غلط قرار دیا جائے۔

آس پڑوس "پاس پڑوس" کے معنی میں یہ فقرہ دہلی کی بول چال کی زبان اور ہندی کی تحریری زبان میں ہے۔ اب اردو تحریر میں بھی دیکھنے آنے لگا ہے۔ لیکن تحریر کی حد تک "پاس پڑوس" بہتر ہے۔ تحریر میں "آس پڑوس" سے احتراز کرنا انسب ہے۔ دیکھئے، "سابق مہمل"۔

آصف اس لفظ کے صحیح معنی اور تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اسے سوم مفتوح کے ساتھ (بروزن "واپس") بولتے ہیں۔ عربی میں یہی تلفظ رائج ہے۔ لیکن اردو کے لئے اب یہ محض تکلف ہے، کیوں کہ زیادہ تر لوگوں کی زبان پر یہ بکسر سوم ہی ہے۔ آج کل اگر کسی کا نام "آصف" رکھا جاتا ہے تو اس کا بھی تلفظ بکسر سوم ہی کرتے ہیں۔ لہذا اردو میں اس لفظ کا رائج تلفظ بکسر سوم (بروزن "بارش") ہے اور وہی اب مرجح ہے۔ جہاں تک سوال معنی کا ہے، تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ برخیا نام کے ایک بزرگ کے بیٹے کا نام تھا، اور آصف بن برخیا کو حضرت سلیمانؑ نے اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ بعض کا خیال ہے "آصف" لفظ عبرانی ہے اور عربی میں اسے "کبر" (اول دوم مفتوح) کہتے ہیں جو ایک پھل ہوتا ہے، ترشی مائل۔ بہر حال، اردو میں اس کے کچھ معنی نہیں، کبھی کبھی استعارۃً "نہایت عقل مند یا زیرک شخص" کے معنی میں بول دیتے ہیں۔ میر نے کیا خوب استعمال کیا ہے ؎

خالی پڑا ہے خانۂ دولت وزیر کا　　باور نہ ہو تو آصف آصف پکار دیکھ

یہاں کئی باریکیاں ہیں۔ نواب آصف الدولہ کو "نواب وزیر" کہتے تھے، اور ان کے بعد چند مہینوں کے لئے وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے تھے۔ پھر آصف الدولہ کے ایک محل کا نام "دولت خانہ" تھا۔

آگ زنی اردو میں اچھا خاصا لفظ "آتش زنی" موجود ہے۔ ہندی والے خدا جانے کہاں سے "آگ زنی" اٹھالائے، اور افسوس کہ ان کی دیکھا دیکھی اردو والے بھی "آگ زنی" لکھنے

لگے ہیں۔ یہ لفظ غیر ضروری تو ہے ہی، یہ غلط بھی ہے اور بدصورت بھی۔ اسے بالکل ترک ہونا چاہئے۔

آلاؤ بمعنی ''الاؤ''۔ دیبی پرشاد سحر بدایونی نے ''آلاؤ'' کو درست اور ''الاؤ'' کو غلط بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''آلاؤ'' اب کہیں سننے میں نہیں آتا۔ شیکسپیر کے یہاں اس کا اندراج ہی نہیں۔

آمداواد دیکھئے: ''احمد آباد''۔

آنجہانی مرے ہوئے لوگوں کے نام پر اردو میں ''مرحوم/مرحومہ'' بڑھانے کی رسم ہے۔ یہ رسم بہت پرانی نہیں۔ شیکسپیر کے لغت میں ''مرحوم'' کے مجازی معنی Deceased یعنی ''مردہ، مرا ہوا، فوت شدہ، وغیرہ'' درج ہیں۔ ''نوراللغات'' میں تخصیص ہے کہ یہ لفظ صرف مسلمان مردے کے لئے ہے، ہندو مردے کے لئے ''سورگ باشی'' بولتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال تو ہے ہی کہ جو مردہ نہ مسلمان کا ہو نہ ہندو کا اس کے لئے کیا بولیں؟ دوسری قباحت یہ ہے کہ اپنے مردوں کے لئے ''سورگ باشی'' یا ''سورگیہ'' کا لفظ صرف ہندو استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں اس کا رواج نہیں دیکھا گیا۔ یعنی مسلمانوں کے یہاں ہندو موتی کے لئے ''سورگ باشی'' یا ''سورگیہ'' مستعمل نہیں۔

یہ بات واضح نہیں کہ غیر مسلم مردے کو ''مرحوم'' کیوں نہ کہا جائے۔ شاید اس خیال سے کہ غیر ہندو مردے کو عام بول چال میں ''سورگ باشی'' نہیں کہا جاتا، کسی نے ''آں جہانی'' کی اصطلاح وضع کی، اور اب یہ لفظ تمام غیر مسلم موتی کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ اختراع تازہ ہے۔ ''نوراللغات''، ''امیراللغات'' اور ''آصفیہ'' میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ لفظ مسلم اور غیر مسلم میں ایک غیر ضروری اور تکلیف دہ تفریق کرتا ہے۔ ''مرحوم'' کے معنی ہیں ''مہربانی کیا گیا''۔ شیکسپیر نے لکھا ہے: Who has found mercy۔ اب یہ لفظ دعائیہ بن گیا ہے، جس طرح عربی میں بہت سے فقرے صیغۂ ماضی کے ہیں لیکن وہ بزرگ مرحومین کے نام کے آگے تعظیماً دعا کے طور پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ یہ بات اخلاق کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ ہم بنی آدم کے ایک بڑے طبقے کو اپنی دعا سے محروم رکھیں۔ اور یہ اللہ کی صفت رحمانی اور ارحم الراحمین کا بھی تقاضا ہے کہ ہم امید

رکھیں کہ اپنی اپنی جگہ پر سب پر مہربانی ہوگی۔ لہٰذا میں اس بھونڈے اور تکلیف دہ لفظ "آنجہانی" کو واجب الترک سمجھتا ہوں۔ "مرحوم" سب کے لئے ٹھیک ہے۔ علامہ اقبال نے بھی غیر مسلموں کے لئے "مرحوم" لکھا ہے۔ اس اطلاع کے لئے میں رفیع الدین ہاشمی کا ممنون ہوں۔

آنر کلنگ اب ہمارے لسانی دیوالیہ پن کا یہ عالم ہے کہ انگریزی کے دو دو لفظ ایک ساتھ لکھ دیتے ہیں، حالانکہ ان کا سلیس اردو ترجمہ آسان ہوتا ہے۔ "آنر کلنگ" ایسا ہی ایک فقرہ ہے جو انگریزی اخباروں نے رائج کیا ہے۔ اردو میں اسے بے تکلف "ناموسی قتل" کہہ سکتے ہیں، لیکن انگریزی ہمارے ذہنوں پر سوار ہے تو افسوس کے سوا کوئی کیا کرے۔ اگر کہا جائے کہ "ناموسی قتل" سے کان آشنا نہیں ہیں تو جواب یہ ہے کہ انگریزی میں بھی یہ فقرہ موجود نہیں، ہم لوگوں نے بنایا تو چل گیا۔ اسی طرح "ناموسی قتل" بھی لکھا اور بولا جانے لگے تو چند ہی دن میں رواں ہو جائے گا۔

آنکڑا اردو میں لوہے کی لمبی چیز کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا نوکدار اور مڑا ہوا ہوتا ہے۔ اسے دور کی چیزوں کو کھینچ لانے یا نکال لانے کے کام میں لاتے ہیں۔ اسی اعتبار سے "آنکڑا" کے ایک اور معنی ہیں، "قبضہ، گرفت"۔ مثلاً: "آنکڑا لگ گیا تو بس کام بن ہی گیا۔" ان دنوں بعض اخباروں میں یہ "اعداد و شمار، گنتی" کے معنی میں لکھا جانے لگا ہے۔ یہ ہندی کی مہربانی ہے، اردو میں "آنکڑا" کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ ان معنی میں اس لفظ کو اردو میں نہ برتنا چاہئے۔

آوازہ فارسی والوں کا طریقہ ہے کہ کبھی کبھی لفظ میں زور یا خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے اس کے آخر میں ہائے ہوز کا اضافہ کر دیتے ہیں، وعام اس سے کہ وہ لفظ اصلاً فارسی ہے کہ عربی:

آواز/آوازہ؛ دہان/دہانہ؛ دہن/دہنہ؛ عیار/عیارہ؛ معشوق/معشوقہ؛ موج/موجہ؛ وغیرہ۔

ہائے ہوز کے اضافے والے یہ الفاظ مونث پر دلالت نہیں کرتے۔ علی قلی سلیم کی ایک رباعی کا چوتھا مصرع ہے ع

معشوقہ روز بے تو امیست خدا

"معشوقہ" اور "غزالہ" کو چھوڑ کر اردو میں اس طرح کے ہائے ہوز اضافی والے سب الفاظ مذکر ہیں۔ "معشوقہ" کو اردو میں مذکر نہیں دیکھا گیا۔ "عیارہ" اب نہیں سنائی دیتا لیکن پہلے

لوگوں کے یہاں ملتا ہے۔ ممکن ہے مونث کے التباس کی وجہ سے یہ دونوں لفظ آج کل نہ مستعمل ہوں، یا ممکن ہے صرف لاعلمی کے باعث ترک ہو گئے ہوں۔ تاباں کا شعر ہے ؎

تھا گھر ایک اور سارے بیاباں کا ہوا وارث کوئی مجنوں سا عیارہ نہ ہوگا دوسرا ہرگز

میر، دیوان اول ؎

راہ حدیث جو ٹک بھی نکلے کون سکھائے ہم کو پھر روئے سخن پر کس کو دے وہ شوخ بڑا عیارہ ہے

جرأت ؎

سنتے ہی بول اٹھا وہ عیارا پھر سرا کہیے اس کہانی کا

تمام مطبوعہ نسخوں میں ''عیارا'' مع الف ملتا ہے، لیکن یہ تدوین کرنے والوں یا کاتبوں کا سہو ہے، ظاہر ہے کہ ہائے ہوز چاہئے۔ دیکھئے ''ہائے ہوز کا اضافہ لفظ کے اخیر میں'' ؛ ''ہمشیرہ''۔

آوے واو مفتوح۔ دیکھئے ''ریگنا''۔

آویزش یائے مجہول، پنجم مکسور، بمعنی ''جھگڑا، کھینچا تانی، تنازعہ''۔ نظم ''پیر و مرید'' میں اقبال کا شعر ہے ؎

تا کجا آویزش دین و وطن جوہر جاں پر مقدم ہے بدن

مرحوم پروفیسر آل احمد سرور مجھ سے ناقل تھے کہ ایک بار سراج لکھنوی مرحوم نے ان سے پوچھا کہ ''آویزش'' کو باضافت استعمال کرنا درست ہے کہ نہیں۔ سرور صاحب نے کہا کہ درست ہے، اور سند اقبال کا منقولہ بالا شعر پڑھا۔ سراج لکھنوی مرحوم نے فرمایا کہ اقبال مستند نہیں ہیں، کسی ''اہل زبان'' کا شعر سنائیے۔

اس میں شک نہیں کہ ''جھگڑا، تنازعہ'' وغیرہ کے معنی میں ''آویزش'' فارسی میں نہیں ہے۔ ''آنند راج'' نے اسے مقابل ''آمیزش'' لکھا ہے، اور موخر الذکر کے معنی لکھے ہیں ''احتیاط''۔ یہ یقیناً ''امتیاز'' کی جگہ سہو کتابت ہے۔ ''امتیاز'' کے معنی ہیں، ''ملنا جلنا، آمیز ہونا''۔ لہٰذا ''آویزش'' کے معنی فارسی میں ہوئے، ''الگ الگ رہنا، دور دور رہنا''۔ اغلب ہے کہ اردو والوں نے یہیں سے ''جھگڑا'' وغیرہ کے معنی نکال لئے۔ یعنی اردو میں ''آویزش'' کو نئے معنی دیے گئے، اور اقبال جیسا شاعر اگر اسے نئے معنی میں باضافت استعمال کرتا ہے تو اور کسی سند

کی جستجو ہمیں کیوں ہو؟

آویں واو مفتوح۔ دیکھئے "رینگنا"۔

آہو یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

آئنہ دیکھئے "آئینہ"۔

آئی یہ لفظ مراٹھی میں "ماں" کے معنی میں ہے۔ میں اعظم گڑھ میں اپنے بچپن میں "آئی بائی بھلا دینا" یا "آئی بائی بھول جانا" تہدید کے معنی میں اکثر سنتا تھا۔ مثلاً کوئی زبردست لڑکا کسی کمزور یا زیر دست لڑکے سے کہتا، "زیادہ بولے تو وہ تھپڑ لگاؤں گا ساری آئی بائی بھول جائے گی۔" میں اس وقت "آئی بائی" کے معنی نہ سمجھ سکا تھا۔ بہت بعد میں جب مراٹھی بولنے والوں کی زبان سے میں نے "آئی" بمعنی "اماں" سنا تو خیال آیا کہ "آئی بائی" میں "آئی" کے معنی "ماں" ہیں، اور "بائی" کا لفظ تو احتراماً عورتوں کے لئے عام ہے، اگرچہ ہمارے اطراف کی اردو میں اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ دیکھئے "آیا"۔

آئینہ ہر چند کہ "نور" میں "آئینہ" اور "آئنہ" دونوں درج ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "آئنہ" بولنے یا لکھنے کا کوئی جواز نہیں، نہ فارسی میں نہ اردو میں۔ عام حالات میں "آئنہ" بالکل غلط ہے۔ شعر میں کہیں کہیں "آئینہ" بروزن فاعلن آتا ہے، مثلاً ناسخ ؎

کیا صفائے پیکر دلدار کی تاثیر ہے گر وہ لگ بیٹھے وہیں بن جائے دیوار آئینہ

اسی طرح میر (دیوان اول) ؎

یہ چشم آئینہ دار رو تھی کسو کی نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی

بعض لوگ ایسے حالات میں "آئینہ" کی جگہ "آئنہ" لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن اس کی نہ ضرورت ہے نہ جواز۔ ضرورت اس لئے نہیں کہ اگر تلفظ اور وزن کا لحاظ کر کے املا کو بدلیں تو یہ عمل لا متناہی ہو جائے گا۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں "اور" کو "ار" بروزن فع باندھا گیا ہے ؎

نظم طباطبائی ؎

شغل خود بینی تھا شان بزم آرائی نہ تھی　　جلوہ گر تھا یار اور چشم تماشائی نہ تھی

نظام الدین ممنون ؎

دہشت پڑے پر سلسلہ پیچ و تاب ہیں　　شانے سے موسوے بلا اور بلا سے ہم

غالب ؎

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

لہٰذا جس منطق کی رو سے ہم ''آئینہ'' کو ''آئنہ'' لکھنے کی سفارش کرتے ہیں، اسی منطق کی رو سے ہمیں مندرجہ بالا اشعار میں ''اور'' کی جگہ ''ار'' لکھنے کی سفارش کرنی چاہئے۔ لیکن ایسا کوئی نہیں کرتا، اور نہ کرنا چاہئے۔ ''آئینہ'' کو ''آئنہ'' کرنے کا جواز اس لئے نہیں ہے کہ رسم الخط اور املا کی اپنی تقدیس ہے اور ان کو مجروح کرنا یا ان میں تغیر کرنا اسی طرح غلط ہے جس طرح صرف و نحو میں تغیر کرنا، خواہ وہ کسی بھی وجہ سے ہو۔

آئینہ بندی　اصل میں ''آئین بندی'' ہے، بمعنی ''سجاوٹ، سجاوٹ کرنا''۔ لیکن اردو میں ''آئینہ بندی'' بھی رائج ہو گیا ہے۔ اسے غلط نہ کہنا چاہئے۔ ''امیر اللغات'' اور ''نور اللغات'' میں ''آئین'' بمعنی ''تزئین، آرائش'' نہیں ہے، اور نہ ہی ''آئین بندی'' اور ''آئینہ بندی'' کا اندراج ہے۔ لیکن ''آصفیہ'' میں ''آئین'' بمعنی ''تزئین، آرائش'' ہے، اور ''آئینہ بندی'' بمعنی ''سجاوٹ، سجاوٹ کرنا'' بھی مذکور ہے۔

آئینہ زانو　غالب کا شعر ہے ؎

پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد　　خار پا ہیں جوہر آئینہ زانو مجھے

اپنی کتاب ''مشکلات غالب'' میں اس شعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ ''آئینہ زانو سے مراد خود زانو ہے۔ زانو کو آئینہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آئینے کو زانو پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے، اور دوسری یہ کہ زانو کی ہڈی آئینے کی طرح ہوتی ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں ''گھٹنے کی ہڈی، چپنی۔'' ناسخ کا شعر ہے ؎

نظر آتی ہے صاف اس میں مجھے انجام کی صورت

جو گورستاں میں دیکھا ہے کوئی آئینہ زانو کا

مرقوم الذیل شعر سے ''آئینۂ زانو'' کے معنی اور بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی قبرستان کا منظر ہے ؎

کہیں آئینۂ زانو سکندر کا شکستہ تھا
کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

آیا عام طور پر کہا گیا ہے کہ یہ لفظ پرتگالی الاصل ہے، کہ اس زبان میں زنانہ خدمت گار، مغلانی، یا زنانہ اتالیق کو Aia (آیا) کہتے ہیں۔ اس کا مذکر Aio ہے، بمعنی ''کسی نواب بچے کا اتالیق یا استاذ''۔ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں لفظ ''آیا'' اٹھارویں صدی کے وسط سے رائج ہوا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ کسی نہ کسی شکل میں بہت سی ہندوستانی زبانوں میں موجود ہے، ضروری نہیں کہ پرتگالیوں کی آمد کے پہلے یہ لفظ یہاں معدوم رہا ہو۔ مراٹھی میں ''ماں'' کو ''آئی'' کہتے ہیں۔ اور الف ندا (مثلاً ''الہا، شاہا، خدایا'' وغیرہ) کے علاوہ الف شفقت (مثلاً ''بھائی/ بھیا، اب/ ابا، بہن/ بہنا'' اور بہت سے ناموں کے ساتھ، مثلاً ''مرزا صاحبا، سعیدا ے اشرف، جلالا ے طباطبائی'' وغیرہ) اردو فارسی میں مستعمل ہے۔ لہٰذا یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ لفظ ''آیا'' کو لفظ ''آئی'' سے بنایا گیا ہو اور اس میں الف شفقت یا الف ندا ہو۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ پورب کی اردو میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی عورت کو ''ایّا'' (اول مفتوح، دوم مشدد، بروزن ''میّا'') بھی کہتے تھے۔ ''ایا'' اور ''آئی'' کا تعلق اس بات سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ''مائی'' کی ندائی شکل ''میّا'' کی طرح ''دائی'' کی بھی ایک ندائیہ شکل ''دیّا'' (اول مفتوح، دوم مشدد، برائش وزن ''میّا'') آج بھی دیار مشرق میں مستعمل ہے۔ بلکہ یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ''مائی'' کی ندائیہ صورت ''میّا'' تو اور علاقوں میں بھی معروف ہے۔ دیکھیے: ''آئی''۔

ابا اصل میں عربی ''اب'' کی ایک شکل ہے، بمعنی ''باپ''۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''ابا'' کا الف، الف شفقت ہو، یعنی محبت کے اظہار کی علامت ہو۔ فارسی میں یہ الف عام ہے۔ لیکن اردو میں اسے تخاطب کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ''باپ'' کبھی تنہا تخاطب کے لئے نہیں آتا۔ یعنی یوں نہیں کہتے: ''باپ، ذرا سنئے''۔ لیکن یوں کہا جا سکتا ہے، اور کہا جاتا ہے: ''ابا، ذرا

بنے''۔ واحد غائب کے طور پر دونوں طرح کہہ سکتے ہیں:

صحیح: وہ میرے ابا ہیں۔

صحیح: وہ میرے باپ ہیں۔

شکسپیر کے قول کے مطابق اپنی اصل میں ''اب، ابا، باپ، بابو، باپو'' وغیرہ سب ایک ہیں۔ ''ابا'' کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا کہنا تھا کہ یہ سریانی سے آیا ہے اور اس میں الف حرف ندا نہیں ہے بلکہ معرفہ کی علامت ہے۔ دیکھئے ''بابو''؛ ''باپ''۔

ابابیل اول مفتوح، یائے معروف۔ یہ لفظ جمع اور مونث ہے لیکن اردو میں واحد کی طرح بولتے ہیں۔ نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' میں ہے:

اس مکان میں ابابیلوں کی بھی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔

اس لحاظ سے ''ابابیل'' مذکر ٹھہرتا ہے۔ جناب عبدالرشید نے متوجہ کیا ہے کہ ''آصفیہ'' اور ''نور'' میں یہ لفظ مونث ہی درج ہے، لہٰذا اس کی جنس کو مختلف فیہ قرار دینا چاہئے۔ لیکن مجھے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ ممکن ہے نذیر احمد نے ''گرنی شروع ہوں گی'' لکھنا چاہا ہو لیکن پرانے لوگوں کے عام طریقے کے موافق بڑی ے (گرنے/ہوں گے) لکھ کر چھوٹی ی مراد لی ہو۔ موجودہ صورت میں یہ کہنا چاہئے کہ ''ابابیل'' کو بعض لوگ مذکر اور اکثر لوگ مونث قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مذکر ہے تو اس کا مونث کچھ نہیں، اور اگر مونث ہے تو اس کا مذکر کچھ نہیں۔ جناب شاہ حسین نہری نے مطلع کیا ہے کہ ''ابابیل'' کو دکن میں بھی جمع مونث بولتے ہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''؛ دیکھئے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ابتلا پلیٹس (Platts) نے اسے مذکر بتایا ہے۔ صاحب ''نوراللغات'' نے اسے مونث لکھ کر سرور لکھنوی کا مندرجہ ذیل شعر نقل کیا ہے ؎

ہیں ایک نئی بلا کے پابند جاتی نہیں ابتلا ہماری

یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عربی کے جو مصادر باب افتعال سے ہیں اور ہمارے یہاں بطور اسم برتے جاتے ہیں، وہ سب مونث ہیں۔ یہ ضروری نہیں۔ مثلاً حسب ذیل الفاظ باب افتعال سے

ہیں لیکن مذکر ہیں:

اتحاد؛ اتمام؛ اجتماع؛ اختصاص؛ اختیار؛ اعتبار: وغیرہ۔

باب افتعال کے بعض مصدر ایسے ہیں جو مذکر مونث دونوں طرح بولے جاتے ہیں، یا پہلے مختلف فیہ تھے لیکن اب رجحان ایک ہی طرف ہے۔ مثلاً ''اتباع'' اب عام طور پر مذکر ہے، پہلے مونث بھی تھا۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''تقویت الایمان'' کا فقرہ بطور سند درج ہے:

رسول مقبول کی اتباع واطاعت۔

اس کے برخلاف جلیل مانک پوری نے اپنے رسالے ''تذکیر و تانیث'' میں اسے مذکر لکھ کر سعادت خاں ناصر کا شعر نقل کیا ہے ؎

کر کے عصیاں آنکھ کو پرنم کیا　　اتباع سنت آدم کیا

''اختراع'' آج کل تقریباً ہمیشہ مونث سنا جاتا ہے لیکن منیر شکوہ آبادی نے مذکر باندھا ہے ؎

چلن سینہ شگافی کا بتایا سوگواروں کو　　لحد نے اختراع اول کیا چاک گریباں کا

منیر شکوہ آبادی ہی نہیں، کوئی سو برس پہلے تک بھی اس لفظ کو مذکر بولتے تھے۔ آج بھی کوئی مذکر بولے تو غلط نہ ہوگا، لیکن مونث بولنا مرجح ہے۔ مہدی افادی نے اسے مونث ہی فرض کرتے ہوئے Masterpiece کا ترجمہ ''اختراع فائقہ'' کیا تھا۔ 'فائقہ'' میں تاے تانیث ہے۔ ''اختراع فائقہ'' اب نہیں بولتے۔ ان معنی میں اب ''شاہکار'' رائج ہے۔

''اعتنا'' کو مظفر علی اسیر نے مونث باندھا ہے ؎

نہ اٹھا نہ حضرت کی تعظیم کی　　نہ کچھ اعتنا کی نہ تسلیم کی

آج کل یہ لفظ تقریباً ہمیشہ مذکر بولا جاتا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ فقرہ بطور سند درج ہی:

ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا۔

''التماس'' شروع ہی سے مختلف فیہ رہا ہے۔ آج کل عام طور پر مونث ہے۔ میر نے مذکر باندھا ہے اور میر انیس نے مونث، میر (۱) اور میر انیس (۲) ؎

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی　　کیا پتنگے نے التماس کیا

کی سر جھکا کے حیدر صفدر نے التماس   روشن ہے حال آپ پہ یا شاہ حق شناس

''التماس'' کو احسان دانش نے مونث بتایا ہے اور بعض لوگوں کو میر کے شعر پر حیرت ہے کہ اس میں ''التماس'' مذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ میر کے زمانے کی بر تذکیر یا تانیث آج کے لئے سند نہیں بن سکتی۔ لیکن آج بھی بہت سے لوگ ''التماس'' کو مذکر بولتے ہیں۔ چونکہ محاورہ جمہور دونوں طرح ہے لہٰذا شکایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جلیل مانک پوری نے اپنے رسالے ''تذکیر و تانیث'' میں لکھا ہے کہ دلی والے ''التماس'' کو مذکر بولتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے اس میں لکھنؤ دلی کی تخصیص نہیں۔ کم سے کم اب تو نہیں ہے۔ ''تذکیر و تانیث'' (تاریخ اشاعت ۱۹۱۶) کے زمانے میں رہی ہو تو رہی ہو۔

ابجد دیکھئے ''حروف ابجد''۔

ابھر کر سامنے آنا بعض لوگ ''نمایاں ہونا، توجہ انگیز ہونا، توجہ کا مرکز بننا'' کی جگہ ''ابھر کر سامنے آنا'' لکھنے لگے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ اس فقرے میں تکرار ناروا ہے۔ جو چیز ابھرے گی وہ سامنے ہی تو آئے گی۔ ''ابھرنا'' اور ''سامنے آنا'' یہاں ایک ہی معنی دے رہے ہیں۔ پھر، ابھرنے کے بعد ''سامنے آنا'' کا کچھ مطلب یوں بھی نہیں کہ ابھر کر ''پیچھے آنا'' غیر ممکن ہے۔ اسی طرح، کوئی چیز دب کر تو سامنے آئے گی نہیں، لہٰذا ''ابھر کر'' سامنے آنا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا تو ''ابھرنا'' کہیے، یا ''سامنے آنا'' کہیے۔

غیر فصیح اور نامناسب: گذشتہ چند برسوں میں جو شعرا ابھر کر سامنے آئے ہیں۔۔۔

فصیح اور مناسب: ۔۔۔سامنے آئے ہیں/ ابھرے ہیں/ نمایاں ہوئے ہیں۔۔۔

غیر فصیح اور نامناسب: رپورٹ کو پڑھنے سے جو نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔۔۔

فصیح اور مناسب: ۔۔۔نمایاں ہوتا ہے/ نمایاں طور پر نظر میں آتا ہے/ خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔۔۔

غیر فصیح اور نامناسب: اس وقت ہمارے معاشرے میں تشدد کا رجحان ابھر کر سامنے آرہا ہے۔

فصیح اور مناسب: ۔۔۔نمایاں ہو رہا ہے/ ابھر رہا ہے/ واضح طور پر ابھر رہا ہے/ بہت زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔

اپنائیت ''آصفیہ'' میں ''اپنائیت'' ہے۔ ''نور اللغات'' میں ''اپنایت'' درج ہے، لیکن اب

''اپنائیت'' ہی رائج ہے۔ دیکھیے ''یکسانیت''۔

اتارنا اول مفتوح۔ کسی بڑے برتن یا دونگے سے رکابی یا پیالے میں کھانا نکالنے کو دلی والے ''اتارنا'' کہتے ہیں۔ مثلاً: ''لیجیے صاحب، یہ آلو سالن تو اتاریے، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ان معنی میں اس لفظ کو اہل دہلی کا علاقائی سمجھنا چاہیے، ہر شخص کو اس کا استعمال روا نہیں۔

اتباع اول دوم مکسور، بمعنی ''پیروی، پیروی کرنا''۔ دیکھیے ''اتلا''۔

اٹ پٹا اول سوم مفتوح۔ ''عجیب'' یا ''بے محل'' کے لیے ہندی میں آج کل یہ بھونڈا لفظ مستعمل ہے۔ اسے اردو سمجھنا یا اردو میں رائج کرنے کی کوشش کرنا بے محل اور غیر ضروری ہے۔

اثبات اول مفتوح، غالب نے ایک جگہ ''اثبات'' کو مونث لکھا ہے

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

بعض کا خیال ہے کہ چونکہ غالب کو الف کا دبنا بہت ناگوار تھا (یہ بات غالب نے ایک خط میں کہی بھی ہے) اس لیے انھوں نے ''کرتا'' کے الف کو دبنے سے بچانے کی خاطر اثبات کو مونث بنا دیا۔'' اس سلسلے میں کئی باتیں غور کے قابل ہیں۔ اول تو یہ کہ انھیں غالب نے ''اثبات'' کو مذکر بھی لکھا ہے

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اور اس مصرع میں الف دب بھی رہا ہے (''کا'' اثبات) لہٰذا اگر معاملہ صرف الف کی حفاظت کا تھا تو غالب بہ آسانی ع

ہر رنگ میں بہار کی اثبات چاہیے

کہہ سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''اثبات'' دونوں طرح درست ہے، خواجہ وزیر

جو اس نے بات نہ کی ہو گیا مجھے اثبات دہن وہ تنگ ہے گنجائش کلام نہیں

امان علی سحر

آپ ہی آپ وہ بچھ ہو گئے چپ چپ کل سے بات کی گو مری اثبات نہ ہونے پائی

واجد علی شاہ اختر

نہ وہ بولتے تو نہ کھلتا دہن کہ مشکل تھا اثبات اس بات کا

لہٰذا غالب نے ''اثبات'' کو مونث کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ رواج عام کے اتباع میں لکھا ہے۔ ''اثبات'' دونوں طرح صحیح ہے۔

اجگر یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

اجودھیا دیکھئے: ''ایودھیا''۔

اچار دیکھئے: ''آچار''۔

احمد آباد اس زمانے میں بعض ہندتوا کے پرستار چاہتے ہیں کہ اس ملک سے ہر غیر ملکی (= اسلامی) شے کا نشان زائل کر دیا جائے۔ ایسے لوگ ''احمد آباد'' کو ''آمداواد'' لکھتے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ''آمداواد'' خود ہی پردیسی تلفظ ہے ''احمد آباد'' کا، اور اسے سترہویں صدی کے اہل یورپ، بالخصوص اہل پرتگال، نے رائج کیا تھا۔ اس وقت اسے Amidavad لکھتے تھے۔ اور سرخ چونچ، سرخ نارنجی رنگ اور سفید چتیوں والی مشہور گانے والی ننھی چڑیا جسے ''لال'' کہتے ہیں (مادہ ''منیا''، بروزن ''کنیا'')، وہ سترہویں صدی میں احمد آباد سے اتنی کثیر تعداد میں برآمد ہوتی تھی کہ اس چڑیا کو آج بھی انگریزی میں Amdavad یا Avadavat نام سے جانا جاتا ہے۔ لہٰذا ''احمد آباد'' کو ''آمداواد'' کہنے والے خود ایسے تلفظ کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو ''احمد آباد'' ہی کی ایک غیر ملکی شکل ہے۔ ''احمد آباد'' کہیں سے غیر ملکی نہیں، کہ یہ شہر ایک گجراتی بادشاہ نے بسایا تھا۔

احوال علامہ سید سلیمان ندوی کا پرانا قول ہے، اور یہ آج بھی درست ہے کہ ''احوال'' عربی میں جمع ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے اور ہمارے لئے واحد ہی درست ہے۔

اختراع دیکھئے: ''ابتلا''۔

اختراع فائقہ مونث، بمعنی ''شاہکار''۔ یہ لفظ مہدی افادی نے بنایا تھا لیکن چل نہ سکا۔ آج کل اس کی جگہ ''شاہکار'' مستعمل ہے۔

ادب پرور دیکھئے: ''ادب نواز''۔

ادب نواز چونکہ ''نواختن'' کے ایک معنی ''بجانا'' بھی ہیں، اس لئے ''بانسری نواز، سارنگی نواز، ستار نواز'' جیسے کلمات تو بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن آج کل ''ادب نواز'' کا قبیح اور مریبانہ فقرہ بھی استعمال ہونے لگا ہے، گویا ادب کوئی باجا ہو اور جن صاحب کو ''ادب نواز'' کہا جا رہا ہے وہ اسے بجاتے ہوں۔ یا پھر اگر ''نواختن'' کے معنی ''نوازش کرنا، مہربانی کرنا'' لے جائیں تو گویا ادب کوئی یتیم بچہ یا بے سہارا شخص ہے اور جن صاحب کو ''ادب نواز'' کہا جا رہا ہے وہ ادب پر مہربانی فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں ہی معنی ''ادب'' کے لئے نامناسب اور قابل اعتراض ہیں۔ ہم ادب دوست ہو سکتے ہیں، ادب پرست ہو سکتے ہیں، ادب شناس ہو سکتے ہیں، ''ادب نواز'' یا ''ادب پرور'' کہلانے کا استحقاق و مرتبہ نہیں رکھتے۔ بڑے سے بڑا شخص بھی ادب کو ''نواز'' نہیں سکتا، اور نہ تنہا اس کی پرورش کر سکتا ہے۔ یہ سب استعمالات تکلیف دہ اور واجب الترک ہیں۔

''ادب نواز'' کے طرز پر بعض لوگوں نے ''اردو نواز'' بنا لیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ مہمل اور افسوس ناک فقرہ اکثر ایسے لوگوں کے لئے برتا جاتا ہے جو اردو سے بخوبی واقف تک نہیں ہوتے، اس کی صرف شد بد رکھتے ہیں، یعنی سیاسی رہنما، وزرا و امرا، بڑے افسر وغیرہ۔ جو بھی نیتا یا بڑا افسر کسی مشاعرے میں آ کر بیٹھ جائے، یا کسی کتاب کی رسم اجرا میں موجود ہو، ہم اسے جھٹ ''اردو نواز'' کہہ دیتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اردو کو، یا کسی بھی زبان کو ''نواز'' نہیں سکتا۔ یہ زبان کی نوازش ہے کہ وہ ہمارا وسیلۂ اظہار بنتی ہے۔ ہم بہت سے بہت ''اردو دوست'' ہو سکتے ہیں، ورنہ ہمارا صحیح مقام ''خادم اردو'' کا ہے۔ ''ادب نواز''، ''ادب پرور''، ''اردو نواز'' جیسے فقروں کو مکمل طور پر ترک ہو جانا چاہئے۔

اردگرد اول چہارم مکسور، یہ لفظ عام، بے تکلف بول چال تک کے لئے تو ٹھیک ہے، لیکن اسے سنجیدہ گفتگو اور تحریر میں نہ لانا چاہئے۔ اس کے بجائے ''آس پاس''، ''گرداگرد''، ''گرد و پیش'' وغیرہ کو حسب موقع وضرورت استعمال کریں۔

اردوانا دیکھئے ''تاریہ''؛ دیکھئے ''گہرانا''۔

اردو کے حروف تہجی کا تلفظ اردو حروف تہجی کے تلفظ حسب ذیل ہیں: الف، بے، پے، تے، ٹے، ثے، جیم، چے، [بڑی] حے، خے، دال، ڈال، ذال، رے، ڑے، زے، ژے، سین،

شین، صاد یا صواد، ضاد یا ضواد، طو یا طوے، ظو یا ظوے، عین، غین، فے، قاف، کاف، گاف، لام، میم، نون، واو، ہے، ہمزہ، یے، بڑی یے۔ ہم لوگ جہاں بڑی یے مع کسرہ بولتے ہیں وہاں فارسی عربی میں الف بولا جاتا ہے: با، پا، تا، ثا، حا، خا، را، زا، ژا، فی، ہا، یا۔ عربی میں پ اور ژ نہیں ہیں لیکن فارسی والے ان کا تلفظ اس طرح کرتے ہیں جس طرح عربی میں کیا جاتا اگر یہ حروف عربی میں ہوتے۔ عربی میں چ اور گ نہیں ہیں۔ فارسی میں انھیں جیم فارسی اور کاف فارسی کہا جاتا ہے۔ فارسی میں ٹ، ڈ، ڑ نہیں ہیں اور وہاں ہمزہ کو حرف نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ فارسی میں آج کا رجحان تو حتی الامکان ہمزہ کو ترک کرنے کا ہے۔ دوچشمی ہ (ھ) کو اگر حرف تہجی مانا جائے تو اس کا تلفظ ''دوچشمی ہے'' ہوگا۔

اردو کے حروف تہجی کی ترتیب حروف تہجی کا وہی معاملہ ہے جو معنی اور املا کا ہے، یعنی جو رائج ہو جائے وہی درست ہے۔ ہم اردو والے غیر ضروری طور پر اپنے حروف تہجی کی ترتیب اور تعداد میں ''اصلاح'' کرنے کی کوشش اور دعوے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے انتشار ہی پیدا ہوتا ہے۔ لسانیات چاہے کچھ بھی کہے، رواج عام سب پر مرجح ہے۔ اس وقت اردو کے حروف تہجی کی ترتیب جو مروج ہے اور صحیح ہے، وہ حسب ذیل ہے:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ء ی ے

ممکن ہے ''سائنسی'' نقطۂ نظر سے یہ بالکل ''ٹھیک'' نہ ہو، لیکن جس ترتیب کو قائم ہوئے مدتیں گذر چکیں اور سب اسے قبول کر چکے، اس کو بدلنا غیر مناسب ہے۔ دوچشمی ہ (ھ) کو الگ سے حرف تہجی ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہاں پڑھانے میں سہولت کے خیال سے اسے الف بے کی تختی کے ساتھ پڑھانا بہتر ہے۔

اردو کے حروف تہجی کی تعداد بعض لوگوں نے ہائے مخلوط کی آواز کو الگ حرف کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، وغیرہ کو الگ حرف کا درجہ ملنا چاہئے۔ اور ہائے مخلوط والے حرف کو اصل حرف کے بعد لکھا جانا چاہئے۔ یعنی پہلے ب لکھئے، پھر بھ لکھئے۔ اگر آپ کوئی لغت یا اشاریہ وغیرہ بنا رہے ہیں تو پہلے ب اور ی کے

تمام اندراجات ختم کرلیں پھر بھ اور الف (بجا) سے شروع کریں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حروف تہجی کا وہی معاملہ ہے جو معنی اور املا کا ہے۔ یعنی جو رائج ہو جائے وہی درست ہے۔ ہم اردو والے غیر ضروری طور پر اپنے حروف تہجی کی تعداد میں ''اصلاح'' کرنے کی کوشش اور دعوے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے انتشار ہی پیدا ہوتا ہے۔ لسانیات کچھ بھی کہے، رواج عام سب پر مرجح ہے۔ اس وقت اردو میں ہائے مخلوط کی آواز والے حرفوں کو الگ حرف قرار دینے کا رواج نہیں ہے۔ بعض اہل لغت نے زبردستی کی ہے جو انھیں حرف کا درجہ دے دیا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ اردو کے حروف تہجی کو ''سائنسی'' بنانے کے دعوے کے ساتھ ''فضول'' یا ''فالتو'' حروف کو نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب ''ز'' موجود ہے تو ''ذ، ض، ظ'' فالتو ہیں۔ وقس علی ھذا۔ بہت سے استدلال اس ''اصلاحی'' کوشش کے خلاف لائے جا سکتے ہیں اور لائے گئے ہیں۔ لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ زبان کا صحیح پن (Validity) رواج عام سے قائم ہوتا ہے۔ رواج عام کے خلاف جانا زبان کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

اس وقت اردو کے حروف تہجی کی تعداد پینتیس (۳۵) ہے، جیسا کہ اوپر کی فہرست سے معلوم ہو گیا ہوگا۔

اردو کے حروف تہجی کی جنس

انشا نے ''دریائے لطافت'' میں حسب ذیل حروف کو مونث لکھا ہے:

ب، پ، ج، خ، ر، ز، ط، ظ، ف، و، ی

اس سے گمان گذرتا ہے کہ باقی حروف مذکر ہوں گے۔ صفیر بلگرامی نے ''رشحات صفیر'' میں حسب ذیل حروف کے مذکر ہونے کی سند فراہم کی ہے:

الف:

خوش نویسوں نے کہا دیکھ کے بینی اس کی — لکھا ہے کاتب قدرت نے الف کیا سیدھا

(بہادر شاہ ظفر)

شین:

کس طرح تو امر لڑائی میں نہ ہو فتح و شکست شین ہے مفتوح بھی مکسور بھی شمشیر کا

(مظفر علی اسیر)

صاد:

دکھایا جب کلام مدحت چشم و ید بیضا کسی پر ہیض ہوتا ہے کسی پر صاد ہوتا ہے

(علی اوسط رشک)

لام:

بندگی لازم ہے پیری میں جوانی کے سوا قد خم گشتہ نہیں یہ لام ہے تاکید کا

(مظفر علی اسیر)

میم:

معانی قل ہو اللہ احد کے ہیں عیاں ناسخ برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد کا

(ناسخ)

ن:

کیا ہی لپٹا ہے مرے دست تمنا کی طرح نون تیری ناف کا میم کمر ہونے لگا

(خواجہ وزیر)

صفیر بلگرامی یہ بھی لکھتے ہیں کہ کلب حسین خاں نادر نے میم کو مونث لکھا ہے اور دبیر نے واؤ کو مذکر۔ لیکن صفیر کو اس سے اتفاق نہیں۔ صفیر بلگرامی نے مزید لکھا ہے کہ میرے رسالے "رشحات صفیر" کی "بنا استادوں کی سند پر ہے۔ ہر چند سب کچھ معلوم ہے مگر اپنی جانب سے کچھ دخل نہ کیا گیا۔" اس کے باوجود وہ حروف تہجی کی جنس بیان کرنے میں غالب کی سند بھول گئے۔ غالب نے اپنے خط مورخہ ۱۸۵۶ میں مرزا یوسف علی خاں عزیز کو لکھا ہے:

> الف مذکر: ب، ت، ث، مونث: جیم مذکر: ح، خ مونث: دال، ذال مونث: رے، زے مونث: سین، شین مذکر: ص، ض، ط، ظ مونث: عین، غین مذکر: ف مونث: قاف، کاف، لام، میم، نون مذکر: واو، ہے، یے مونث: ہمزہ مذکر۔ لام الف حروف مفردہ میں نہیں، مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔

غالب نے ان حروف کا ذکر نہیں کیا ہے جو اردو سے مخصوص ہیں۔ ان کی مندرجہ بالا رائے کی روشنی میں ہم ان بقیہ حروف کی جنس حسب ذیل متعین کر سکتے ہیں:

پ، ٹ مونث: چ مونث: ڈ مونث: ڑ، ژ مونث: گ مذکر

دو چشمی ہ اگرچہ حرف نہیں لیکن وہ بھی ہ کے حکم میں ہے اور مونث بولی جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی مذکور کرنا ضروری ہے کہ آج کل بعض لوگوں کی زبان پر بعض حروف کی جنس غالب کی بیان کردہ جنس سے مختلف سنی جا رہی ہے۔ وہو ہذا:

مذکر: ج، خ، ر، ڑ، ز، ژ، ص [صاد پہلے بھی مذکر تھا، جیسا کہ رشک کے منقولہ بالا شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ نذیر احمد نے بھی ''توبۃ النصوح'' میں مذکر استعمال کیا ہے: ''تمھاری اس تجویز پر میرا صاد ہی۔'']

مونث: س، ش، م [میم پہلے بھی مونث تھی، جیسا کہ کلب حسین خاں نادر کے بیان سے معلوم ہوا]۔

مونث: ض، ف

''الف بے'' بمعنی ''مبادیات'' مونث ہے، مصحفی ؎

قیس و فرہاد کو ہم طفل دبستاں سمجھے یاد تھی ہم کو الف بے جو قد و ابرو کی

اردو نواز دیکھیے: ''ادب نواز''۔

ارقام میر کا شعر ہے ؎

زباں خامے کے جلتے ہی ہزاروں اشک گرتے ہیں حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کریے اب

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''ارقام'' غلط ہے، کیوں کہ یہ عربی میں نہیں ہے۔ بے شک یہ عربی میں نہیں ہے، لیکن اردو والوں نے اسے ''رقم'' سے بروزن افعال قیاس کر کے بنا لیا ہے۔ اردو لفظ کی حیثیت سے یہ بالکل صحیح ہے، عربی میں نہیں ہے تو اس سے ہمیں غرض نہیں۔

ارموت اول مفتوح، واو معروف، مشہور پھل۔ دیکھیے: ''امرود''۔

ارمود اول مفتوح، واو معروف، مشہور پھل۔ دیکھیے: ''امرود''۔

اڑان بھرنا ''پرواز کرنا''، ''اڑنا شروع کرنا'' کے معنی میں ''اڑان بھرنا'' بالکل غلط

ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اردو میں اس سے بچنا چاہئے۔

اڑوس پڑوس ''پاس پڑوس'' کی جگہ یہ فقرہ عامیانہ ہے۔اس سے تحریر و تقریر دونوں میں احتراز بہتر ہے۔ بے تکلف بول چال تک قابل قبول ہے۔

ازغیب اول سوم مفتوح، بمعنی ''علم غیب''، علاقۂ مشرق میں عام ہے۔ اسے پوربی اردو سے مخصوص سمجھنا چاہئے۔ دوسرے علاقوں میں ''علم غیب'' ہی بولتے ہیں۔ یہ دونوں عبارتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

(۱) انھوں نے یہ کیسے کہہ دیا؟ کیا انھیں ازغیب ہے؟/ ازغیب سے معلوم ہے؟/ ازغیب آتا ہے؟

(۲) انھوں نے یہ کیسے کہہ دیا؟ کیا انھیں علم غیب ہے؟/علم غیب سے معلوم ہے؟/غیب سے معلوم ہے؟

اژدر بمعنی ''اژدہا''، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے۔اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

اژدہا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے۔اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

اساتذہ دیکھئے: ''استاذ''۔

اس بیچ انگریزی کے فقرے ہیں:

In the mean time, Meanwhile, In the meanwhile

ہندی میں ان کا مرادف کوئی نہیں، اس لئے وہ لوگ ''اس بیچ'' لکھتے ہیں۔ لیکن روزمرہ کی اردو میں ''اس اثنا میں/ دریں اثنا/ اس درمیان/ اس درمیان میں'' وغیرہ فقروں کے ہوتے ہوئے ''اس بیچ'' کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاص کر جب کہ ''بیچ'' بمعنی ''In, Inside, میں'' اب اردو میں شاذ ہی بولا جاتا ہو۔ کبھی کبھی منھ کا مزہ بدلنے کے لئے ''دریں اثنا'' وغیرہ کی جگہ ''اس بیچ'' بول دیں تو ہرج نہیں۔ لیکن اس بدنما فقرے کو مسلسل استعمال کرنا، یا تحریر میں استعمال کرنا دانش مندی نہیں ہے۔

اسپ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے۔ اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

استاد ''استاذ'' اور ''استاد'' دونوں صحیح ہیں۔ فارسی میں استاذ (مع ذال) زیادہ مستعمل ہے، اردو میں ''استاد'' (مع دال)۔ ''استاذ'' اب جدید عربی میں بھی آگیا ہے۔ لیکن اردو میں کئی استعمالات ایسے ہیں جہاں ''استاذ'' خلاف محاورہ، بلکہ غلط ہے۔ مثلاً: موسیقی کے ماہر کو ہمیشہ ''استاد'' کہتے ہیں، ''استاذ'' نہیں۔ کسی بھی فن میں ماہر شخص کو بھی ''استاد'' کہتے ہیں، ''استاذ'' نہیں۔ مصحفی کا مصرع ہے ع

تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

اسی طرح، کسی کو بے تکلفی سے مخاطب کریں تو اس موقعے پر بھی ''استاد'' ہی کہیں گے۔ داغ کا مصرع ہے ع

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

علیٰ ہذا القیاس، ''استادی کا ہاتھ''؛ ''کسی کی استادی''، وغیرہ میں ''استاذ'' کہنا غلط ہے۔ فارسی اور اردو میں ''استاذ'' کی عربی جمع ''اساتذہ'' رائج ہے۔ جدید فارسی میں ''استاد'' کی بھی جمع عربی قاعدے سے بن گئی ہے، ''اساتید''۔ ''اساتید'' اردو میں بالکل مستعمل نہیں۔ ''میرے/ہمارے استاذ'' کے لئے اردو میں ''استاذی/استاذنا'' مروج ہے۔ یہاں ''استادی/استادنا'' کہنا غلط ہو گا۔

استاذ دیکھیے: ''استاد''۔

استاذی بمعنی ''میرے استاذ''، دیکھیے: ''استاد''۔

استفادہ حاصل کرنا ''استفادہ'' بیچارا لفظ ایسا ہے کہ وقتاً فوقتاً ہمارے نیم حکیم قسم کے ''ماہرین زبان'' کا تختۂ مشق بنتا رہا ہے۔ بعض لوگ مصر ہیں کہ ''استفادہ حاصل کرنا'' غلط ہے، کیوں کہ عربی لفظ ''استفادہ'' میں ''حاصل کرنا'' کے معنی موجود ہیں۔ اس موضوع پر پانچ برس گذرے ''ہماری زبان'' میں بہت لمبی بحث ہوئی تھی، لیکن ''استفادہ حاصل کرنا'' کو غلط کہنے والوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ بعض لوگوں نے اقبال سے منسوب ایک مراسلے کو جعلی قرار دیا، صرف اس

بنا پر کہ اس میں ''استفادہ حاصل کرنا'' استعمال ہوا تھا، اور ان کی رائے میں اقبال ایسی ''غلطی'' نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن حالی نے بھی ''استفادہ حاصل کرنا'' لکھا ہے۔ دلائل کے باوجود، کہ ''استفادہ حاصل کرنا'' صحیح ہے، کوئی نتیجہ نکلا، فریقین اپنے اپنے مسلک پر قائم رہے۔

کسی لفظ کے معنی کا دارومدار اس لفظ کے بولنے والوں کے گذشتہ اور موجودہ طریق عمل پر ہوتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ لفظ ''استفادہ'' اردو میں کن معنی میں برتا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو کی حد تک ''استفادہ حاصل کرنا'' غلط ہے ہی نہیں، بالکل درست ہے۔ اردو میں لفظ ''استفادہ'' کو ''فائدہ''، ''نفع'' کے معنی میں عرصے سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ شیکسپیر (John Shakespear) کے لغت مطبوعہ ۱۸۳۴ میں ''استفادہ'' کے معنی profit, advantage, attainment صاف صاف لکھے ہیں۔ زمانۂ حال کے بعض برخود غلط عربی دانوں نے اسے غلط قرار دیا اور اس پر اتنا اصرار کیا کہ ''استفادہ حاصل کرنا'' اب عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ شیکسپیر کا حوالہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ''استفادہ'' بمعنی ''فائدہ'' ہمارے یہاں مدت سے مستعمل ہے۔ اب مزید ملاحظہ ہو:

(۱) ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) کا لغت موسوم بہ A Dictionary: Hindustani and English (جو اب یو پی اردو اکیڈمی کی اشاعت نے متداول کر دیا ہے) ۱۸۶۶ میں چھپا۔ اس میں ''استفادہ'' کے ذیل میں یہ لکھا ہے:

seeking for gain, profit, advantage

(۲) انگریزوں کے مرتب کئے ہوئے لغات میں پلیٹس Platts کا لغت (۱۸۸۵) عام طور پر سب سے زیادہ مستند مانا جاتا ہے۔ اس میں اندراج حسب ذیل ہے:

seeking gain or advantage; attainment; profit, gain, advantage

(۳) ''امیر اللغات'' اور ''نور اللغات'' میں استفادہ'' کے معنی ''نفع اٹھانا، فائدہ حاصل کرنا'' لکھے ہیں۔ لہٰذا ان کے خیال میں ''استفادہ'' کے ساتھ ''حاصل کرنا''، ''اٹھانا'' لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ''آصفیہ'' اور فیلن (Fallon) اور ''لغات کشوری'' میں ''استفادہ'' درج ہی نہیں، یعنی ان حضرت کی رائے میں یہ لفظ اردو میں اتنا مستعمل نہ تھا کہ درج لغت ہوتا۔

(۵) ترقی اردو بورڈ کراچی کا ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' اردو کا سب سے بڑا لغت ہے اور اس میں مستند مثالوں کی کثرت ہے۔ وہاں ''استفادہ'' کے بارے میں حسب ذیل اندراج ہے:

فائدہ، نفع، مفاد۔ (اس کے بعد ایک سند ''گلستان ہندی'' (املا) اور ایک سند ''تنظیم الحیات'' کی بمعنی ''فائدہ'' موجود ہے)۔

(۶) فارسی زبان میں کم سے کم انیسویں صدی سے ''استفادہ'' بمعنی ''فائدہ'' مروج ہے، اور آج بھی ہے۔ چنانچہ حیّم کے فارسی انگلیسی لغت (مطبوعہ ۱۹۷۰) میں یوں ہے:

(Making) use; utilization, profit

اس کے بعد ''استفادہ جو'' کے معنی Profiteer لکھے ہیں۔

(۷) فضل علی کی A Dictionary of Persian and English Languages (مطبوعہ ۱۸۸۵) میں ''استفادہ'' کے بارے میں ہے:

receiving profit

(۸) اسٹائنگاس (Steingass) کے لغت (مطبوعہ ۱۸۹۵، جدید ایڈیشن) میں ہے:

seeking profit or advantage, gain, profit, advantage; attainment, result.

میں نے اوپر لکھا ہے کہ حالی نے ''استفادہ حاصل کرنا'' لکھا ہے۔ اس کی سند مرقوم الذیل ہے:

یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ حاصل کرتے اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں۔

''یادگار غالب'' کے دو ایڈیشن پیش نظر ہیں۔ ایک تو اول ایڈیشن (نامی پریس کانپور ۱۸۹۷)، اس میں مندرجہ بالا عبارت صفحہ ۴۲۸ پر ہے۔ دوسرا ایڈیشن مبارک علی اینڈ سنز (لاہور

۱۹۳۰ء)، اس میں مندرجہ بالا عبارت صفحہ ۳۸۲ پر ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں ''استفادہ حاصل کرنا/''استفادہ اٹھانا'' کو غلط کہنا غلط ہے۔ دونوں بالکل درست ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل بعض لوگ ''استفادہ کرنا'' کو درست اور باقی کو نادرست سمجھتے ہیں۔ اقبال نے ''استفادہ حاصل کرنا'' لکھ کر ہرگز کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

اسٹے آرڈر ''حکم امتناعی'' جیسے عمدہ لفظ کے ہوتے ہوئے بعض لوگ ''اسٹے آرڈر'' لکھ رہے ہیں۔ یہ محض عجز بیان ہے اور اردو کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ بھونڈا انگریزی لفظ واجب الترک ہے۔

اش اش اول سوم مفتوح۔ بہت سے علما کا خیال ہے کہ اس لفظ کا املا ''عش عش'' غلط ہے، کیونکہ یہ عربی نہیں ہے، اور حرف عین ''ہندی'' میں نہیں ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر کہ ہماری گفتگو ''اردو'' زبان سے ہے، اس میں ''ہندی'' کی ۔۔۔لانا درست نہیں، اردو کے حروف تہجی میں عین شروع سے شامل ہے۔ وہ چاہے جہاں سے آیا ہو، لیکن وہ ہے اردو کا حرف، اور اردو کو اختیار ہے کہ وہ اسے استعمال کرتے ہوئے نئے لفظ بنائے یا کسی پرانے لفظ کا املا عین سے متعین کرے۔

جناب رشید حسن خاں اور ان کے تتبع میں جناب عبدالرشید نے ''سحر البیان'' اور ''فسانۂ عجائب'' کے حوالے سے اس لفظ کو ''اش اش'' لکھا ہے، کیوں کہ ان کے مطابق ان دو کتابوں میں یوں ہی درج ہے: ''اش اش''۔ لیکن یہ قیاس مع الفارق کی مثال ہے۔ وہ ''سحر البیان'' اور ''فسانۂ عجائب'' کے مصنفین نہیں، بلکہ ان کے کاتبوں کی سند پر اس لفظ کو ''اش اش'' کہہ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ لغات، مثلاً ''آصفیہ'' اور ''نور'' کا بھی حوالہ دیتے ہیں کہ وہاں بھی ''اش اش'' ہی لکھا ہے۔ لیکن صاحبان لغت تو ''ہے'' ''نہیں، بلکہ ''چاہئے'' پر عمل کرتے ہیں، لہٰذا یہ سب استدلال بے معنی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا معاملہ عربی یا ہندی سے نہیں، بلکہ اردو سے ہے۔ عربی میں کیا غلط ہے کیا صحیح، یہ ہمارے لئے بے معنی ہے۔ اردو میں حرف عین استعمال ہوتا ہے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ اردو کے جن لفظوں میں عین ہے، وہ اکثر و بیشتر عربی سے آئے ہیں۔ لیکن یہ بات خیال میں رکھئے کہ وہ لفظ بھی عربی سے لئے گئے ہوں گے، لیکن اب اردو کے لفظ ہیں۔ بہت سے لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں، ان کو استعمال کرنے کے نحوی قاعدے عربی

سے مختلف ہیں، اور تلفظ تو تقریباً ہر لفظ کا بدل گیا ہے۔ لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ جو حروف اصلاً عربی کے ہیں ان سے کوئی اردو لفظ نہیں بن سکتا۔ آخر عربی کے حرف بھی تو عبرانی سے لئے گئے ہیں اور ان سے عربی لفظ بنائے گئے ہیں۔ یہ تو ہر زبان کا طریقہ ہے کہ غیر زبانوں سے لفظ، یا حرف، یا دونوں ہی مستعار لئے جاتے ہیں اور پھر انھیں اپنا لیا جاتا ہے۔

''عش عش'' کو عربی نہ ہونے کی بنا پر ''اش اش'' کی موافقت میں مسترد کرنا اپنی زبان کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ آخر **علی حدہ** کو ہم لوگوں نے ''علیحدہ/علیحدہ/علاحدہ'' کی انوکھی شکلیں اور تلفظ دے دیئے اور معنی بالکل ہی بدل دیئے۔ **تشنیع** کو ''تشنا'' اور **طعن و تشنیع** کو ''تانا تشنا'' بنا ڈالا۔ ''طمانیت'' جیسا فرضی لفظ گھڑ لیا، حالانکہ عربی میں ''طمانینت'' ہے۔ اور Anglo Arabic College کو ''اینگلو عربک کالج'' کہا۔ ہم لوگوں نے انگریزی Arabic کو اردو میں لیا اور اس میں عین بھی ڈال دیا حالانکہ انگریزی میں عین کا وجود نہیں۔ ہم نے فارسی ''شان'' سے عربی کے طرز پر ''تشمین'' بنا لیا، **صلوٰۃ** جیسے مقدس اور پاکیزہ لفظ کو ہم نے ''صلواتیں'' کرکے ''گالیاں، سخت سست باتیں'' کے معنی دے دیئے، تو کیا ہم ''عش عش'' جیسا لفظ بنانے کا اختیار نہیں رکھتے؟

اگر استدلال یہ ہے کہ ''ہندی'' لفظ میں عربی حرف نہیں آ سکتے، تو پھر ''مفلوک الحال'' اور ''ماتحت'' کو بھی چھوٹی وے سے کیوں نہ لکھا جائے، کہ وہ بھی تو آخر ''ہندی'' لفظ ہیں؟ تیسری اور آخری بات یہ کہ اگرچہ ''عش عش'' عام لغات میں نہیں ملتا، لیکن جو لوگ ملک عرب میں مدتوں رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اہل عرب جب کسی بات پر تحسین یا استعجاب کا اظہار کرتے ہیں تو اکثر ''عش! عش!'' کہتے ہیں۔ اردو میں بھی یہی محاورہ ہے: ''عش عش کرنا''، ''عش عش کر اٹھنا''۔

اس بحث کی روشنی میں یہی فیصلہ درست ہے کہ ''عش عش'' کو صحیح اور ''اش اش'' کو غلط قرار دیا جائے۔ جناب عبدالرشید کی یہ سفارش کچھ بہت زیادہ معنی نہیں رکھتی کہ دونوں کو درست مان لیا جائے۔ ہم اپنی اردو صرف اس لئے کیوں بگاڑیں کہ بعض لوگوں کو ضد ہے کہ ہم وہی لکھیں اور بولیں گے جو عربی کتابوں سے ثابت ہو؟ ''اش اش'' ابھی رائج نہیں ہوا ہے۔ اسے ٹکسال باہر کرنا چاہئے۔

اضافت کی علامت کا حذف

دیکھیے: ''فکِ اضافت''۔

اضافت اور واوِ عطف: ''ہندی'' اور غیر ''ہندی'' الفاظ کے مابین

عام طور پر خیال ہے کہ یہ صرف متقدمین کی روش تھی کہ وہ دیسی اور بدیسی لفظوں کے مابین عطف یا اضافت کو جائز سمجھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعد کے شعرا نے دیسی + بدیسی کو مرکب یا معطوف کرنا بہت کم کر دیا، لیکن انیسویں صدی میں یہ رسم بالکل ختم بھی نہیں ہوئی۔ سید محمد خاں رند کا شعر ہے ؎

یاد کرکے لبِ پاں خوردہ کی تیرے سرخی
خونِ دل آج پیا ہے کئی چلو اپنا

امانت (واسوخت دوم) نے بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے ؎

مسی ملوا کے جو ہیں تیرے ازاؤں دم میں
عمر بھر روئے لہو سرخیِ پاں کے غم میں

لیکن ممکن ہے یہ آزادی صرف ''پان/ پاں'' کے ساتھ برتی گئی ہو، کیونکہ بہادر شاہ ظفر نے بھی ''لبِ پاں خوردہ'' لکھا ہے۔ اس طرح کی اور کسی ترکیب کا سراغ ان کے یہاں نہیں ملا ؎

لبِ پاں خوردہ ہیں کیا تیرے حلاوت سے بھرے
لب بلب جام ہیں عناب کے شربت سے بھرے

بہر حال، ان اشعار سے اتنا تو ثابت ہے کہ بعض الفاظ کی حد تک فارسی اور ''ہندی'' کے مابین اضافت انیسویں صدی تک موجود تھی۔ یہی حال واوِ عطف کا بھی ہے۔ انیسویں صدی میں بھی دیسی اور فارسی الفاظ کے درمیان واوِ عطف لگانے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ضامن علی جلال کہتے ہیں ؎

ہمیشہ مستعدِ کارزار ہیں پلکیں
کبھی چھری کبھی تیر و کٹار ہیں پلکیں

انگریزی کے ساتھ اضافت کی ایک مثال دیکھیے۔ مردان علی خاں رعنا شاگرد غالب کا شعر ہے ؎

مشتعل رہتی ہے آہِ آتشیں مثلِ گیاس
سینۂ عشاق میں جلتا ہے بے روغن چراغ

رعنا مرادآبادی نے ''گیاس'' بمعنی Gas استعمال کیا ہے۔ حیدرآبادی اب بھی ''گیاس'' بولتے ہیں۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ دہلی اور دکن کی زبانیں اتنی مختلف نہیں ہیں جتنی کہ ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی تک تو سینکڑوں استعمالات دکن اور دہلی میں مشترک تھے۔

فارسی/عربی الفاظ کو دیسی الفاظ کے ساتھ مرکب کرنے کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں، اور

نہ ملی دلیل ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ایسی تراکیب قدیم اردو میں عام تھیں۔ حاتم کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے "اصلاح زبان" کی جو "مہم" شروع کی، اس میں اس بات پر بھی زور تھا کہ دیسی اور بدیسی الفاظ کو مع عطف و اضافت نہ لکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حاتم نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ جو پابندیاں انھوں نے بقول خود، اپنے اوپر عائد کیں (جن کا ذکر انھوں نے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں کیا ہے)، ان کی پابندی انھوں نے خود ہی نہیں کی تو پھر ان کے بیانات سے دوسروں کو بھلا کیا ترغیب حاصل ہوتی؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں دیسی اور بدیسی الفاظ کو مع عطف و اضافت جمع کرنے کو برا سمجھا جانے لگا۔ اور یہ بات صرف اہل دلی تک محدود نہیں، مولانا باقر آگاہ نے اپنی مثنوی "گلزار عشق" (۱۷۹۴) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندی اور فارسی/عربی (یعنی دیسی اور بدیسی) الفاظ کو مع عطف و اضافت جمع نہ کرنا چاہئے۔ انشا نے "دریائے لطافت" میں زبان کے بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں جو روشن خیالی اور راست فکری پر مبنی ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی ہندی اور فارسی/عربی الفاظ کو عطف و اضافت کے ساتھ جمع کرنے کی مناہی کی ہے۔ یہ تعصب کیوں پیدا ہوا، اور ہندوستان گیر کیوں کر ہوا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ لسانی تعصب تھا، "قومیت" اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جیسا کہ امرت رائے اور بعض دوسرے ہندو کٹر پنتھیوں نے دعویٰ کیا ہے۔

اضافت کی علامت (کا، کی، کے) میں تعقید

اگر اضافت کی علامت (کا/کے/کی) اپنے مضاف سے دور پڑ جائے تو اردو میں بہتر یہ ہے کہ علامت اضافت مذکر استعمال ہو، چاہے مضاف مونث ہی کیوں نہ ہو۔ آتش ؎

معرفت میں اس خدائے پاک کے ہوش اڑتے ہیں یہاں ادراک کے

کٹ کٹ گئے سب نیزے بھی اقبال سے اس کے میدان میں تھا حشر بپا چال سے اس کے

(میر انیس)

کیا جانوں لذت درد اس کی جراحتوں کے یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے

(میر)

کھولے لب ہائے صدف موجۂ بحرتن نے — کہ تلاطم سے گئی جان پہ اس کے بننے

(امانت، دواسوخت دوم)

اعتنا دیکھیے، ''اتنا''۔

اعداد، حروف تہجی کے دیکھیے، ''حروف ابجد''۔

اعراب بالحرف کسی حرف پر کون سی حرکت ہے، اسے ظاہر کرنے کے لئے اردو میں کوئی خاص نظام نہیں ہے۔ جہاں واؤ یا چھوٹی ی یا بڑی ے واقع ہوں، وہاں حرکت کا کچھ اندازہ لگ جاتا ہے۔ الف کا وقوع بھی حرکت کا کچھ اندازہ دیتا ہے اگر الف کا وقوع لفظ یا سالمے (Syllable) کے آخر میں ہو۔ زیادہ تر حالات میں تجربے اور حافظے کی بنیاد پر حرفوں پر زبر، زیر، پیش، سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے الفاظ، خاص کر غیر اردو لفاظ کو جب زبان میں داخل کرتے ہیں تو وہاں تجربہ یا حافظہ ہمیشہ معتبر نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا ان حالات میں بسا اوقات کسی حرف کی حرکت ظاہر کرنے کی غرض سے ایک حرف (واؤ، چھوٹی ی) زیادہ کر دیتے ہیں۔ اسے اعراب بالحرف کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

اودھر؛ اوس؛ ایدھر؛ ایڈیٹر؛ ایڈیشن؛ بوکر؛ چیک؛ لیکچر؛ یورش

ان لفظوں کو اگر واؤ / ی کے بغیر لکھیں تو صاف ظاہر نہ ہوگا کہ پہلے حرف پر کیا حرکت ہے۔ مندرجہ بالا فہرست میں انگریزی لفظوں پر غور کیجیے:

Editor; Edition; Booker; Cheque; Lecture

صاف ظاہر ہے کہ ان لفظوں کے اردو املا میں چھوٹی ی / واؤ صرف اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ حرف اول کو کس طرح ادا کریں۔ اسی طرح، ''اودھر / ایدھر''؛ ''اوس'' کو اس لئے بنایا گیا کہ صرف ''ادھر''/''اس'' سے صاف معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا لفظ مراد ہے۔ پھر ''ایدھر / اودھر'' مستقل لفظ بھی بن گئے، لیکن ''اوس'' مستقل لفظ نہ بنا۔ اس میں اعراب بالحرف ہی قائم رہا۔ دیکھیے، ''یورش''۔

افسانوی ''افسانوی'' کے معنی ہیں، ''افسانے کی طرح کا تجسس انگیز، رومانی اور دلچسپ۔'' مثلاً کسی کی شخصیت کو ''افسانوی'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسا آدمی جس کی طرح کا شخص [یقین نہ آنے

والے] افسانوں میں ملتا ہو، یعنی جس میں کچھ پر اسراریت ہو اور کشش ہو۔ پھر ''افسانوی'' کے معنی ہیں، ''غیر حقیقی''۔ اس لفظ کے تیسرے معنی ہیں، ''بہت مشہور، جسے انگریزی میں Legendary کہا جائے۔'' لیکن آج کل کچھ لوگ ''افسانوں کا مجموعہ'' کے معنی میں ''افسانوی مجموعہ'' لکھنے اور بولنے لگے ہیں لیکن مندرجہ بالا معنی کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ افسانوں کے مجموعے کو ''افسانوی'' کہنا مضحکہ خیز ہے۔ ''افسانوی مجموعہ'' کی جگہ سیدھا سیدھا ''افسانوں کا مجموعہ'' کہنا چاہئے۔

افشا عربی میں اول مکسور اور آخر میں ہمزہ ہے، بروزن ''انکار''۔ لیکن اردو میں اول ہمیشہ مفتوح بولا جاتا ہے اور ہمزہ اس لفظ میں نہ لکھا جاتا نہ بولا جاتا ہے۔ شان الحق حقی نے اول مکسور لکھا ہے، اور اس لفظ کا ایک املا مع ہمزہ بھی درج کیا ہے۔ یہ دونوں اندراجات اگر عربی تلفظ اور املا کی پابندی میں ہیں تو اہل اردو کے لئے غیر ضروری ہیں، اور اگر دہلی کا مقامی روزمرہ ہیں تو کسی اور کو ان کا تتبع غیر ضروری ہے۔

افعی اول مفتوح، عربی میں **افعیٰ** مع الف مقصورہ ہے۔ اردو میں یائے معروف سے ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''الف''؛ ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

افغاں اول مفتوح، بمعنی ''فغاں''۔ دیکھئے، ''فغاں''۔

اقارب اول مفتوح، چہارم مکسور، بمعنی ''عزیز دار، رشتہ دار''۔ دیکھئے، ''اقربا''۔

اقربا بمعنی ''عزیز دار، رشتہ دار''، اصل عربی میں اول مفتوح، سوم مکسور، اور ہمزہ کے ساتھ ''اقرباء'' ہے۔ لیکن اردو میں اول و سوم مفتوح کے ساتھ انھیں معنی میں مستعمل ہے۔ اردو کے جو لوگ سوم مفتوح کے ساتھ تلفظ کو غلط قرار دیتے ہیں وہ خود غلطی پر ہیں۔ ''اقارب'' بھی ''اقربا'' کے معنی میں اردو میں ہے۔ لیکن ''اقربا'' کو زیادہ تر قریبی عزیزوں کے لئے برتتے ہیں اور ''اقارب'' عمومی مفہوم میں رشتہ داروں کے لئے۔ اردو میں ''عزیز و اقارب'' زیادہ مستعمل ہے۔

اقلیت اصل میں اول دوم مفتوح، سوم مکسور اور یائے مشدد (یعنی بروزن فعالت) ہے۔ اردو

میں بہ تخفیف یا (یعنی بروزن فعلتن) بولتے ہیں اور یہی تلفظ فصیح ہے۔ ہاں حالت جمع میں (اقلیتیں، اقلیتوں) اور یائے صفت کے ساتھ (اقلیتی) دوم ساکن بولا جانے لگا ہے اور اسی کو درست ٹھہرانا چاہئے۔ ہاں تنہا لفظ کو بسکون دوم بولنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ لفظ نسبۃً نیا ہے، ''آصفیہ'' اور ''نور'' میں درج نہیں۔

اگر بعض لوگ ''اگر'' کی جگہ صرف ''گر''، اور ''اگرچہ'' کی جگہ صرف ''گرچہ'' لکھتے ہیں۔ یہ آزادی شاعری میں پہلے تھی، اب وہاں بھی کم نظر آتی ہے۔ نثر میں تو اس کا کوئی بھی جواز نہیں، بلکہ اس کا صرف نہایت درجہ تصنع کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ نثر میں ''گر'' اور ''گرچہ'' کا ترک واجب ہے۔

اگرچیکہ یائے مجہول۔ بعض لوگ ''اگرچہ کہ'' کی جگہ ''اگرچیکہ'' لکھتے ہیں۔ ''اگرچہ'' کے بعد کاف بیانیہ (یعنی ''کہ'') ہی غیر ضروری ہے، چہ جائے کہ اس کا املا بدل کر اسے ناقابل شناخت بنا دیا جائے۔ ''اگرچہ'' بہت کافی ہے، نہ ''اگرچہ کہ'' ہی کارآمد ہے اور نہ ''اگرچیکہ''۔

الائے بلائے پورب کی زبان میں ''بلا'' کی جگہ ''بلائے''، اور ''الا بلا'' کی جگہ ''الائے بلائے'' بھی مروج ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں ''الائے بلائے'' غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پلیٹس نے اس کلمے کا اندراج یوں کیا ہے گویا یہی اصل کلمہ ہو، اور ''الا بلا'' اس کی محرف شکل ہو۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''الائے بلائے'' کا اندراج علیحدہ لغت کے طور پر ہے۔ دیکھئے، ''بلائے''۔

التماس دیکھئے، ''ابتلا''۔

الٹی ''متلی'' کے معنی میں یہ لفظ اب دہلی اور اس کے مغرب میں بولا جاتا ہے، لیکن بہت عام نہیں، اور وہاں اسے زیادہ تر جمع کے صیغے میں بولتے ہیں۔ ہندی میں یہ لفظ البتہ ''متلی'' کے معنی میں متداول ہے۔ آج کی معیاری اردو کے اعتبار سے ''الٹی'' بمعنی ''متلی'' کو دہلی اور اس کے مغرب کا علاقائی لفظ سمجھنا چاہئے۔

الف الف کی تعریف عربی میں یہ ہے کہ یہ متحرک کبھی نہیں آتا، اور یا تو یہ ممدودہ ہوگا یا مقصورہ۔ ممدودہ سے مراد وہ الف ہے جسے کھینچ کر پڑھیں اور جو اصولاً دو الف کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

مقصورہ وہ الف ہے جو کھینچ کر نہیں پڑھا جاتا اور جسے اصولاً ایک الف کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ جیسے قرآن پاک کی آیت **ووجدک ضالا فھدیٰ** میں ضالا کا الف ممدودہ ہے اور **فھدیٰ** کا الف مقصورہ۔ اردو کے لئے یہ تعریفیں زیادہ کارآمد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں چونکہ الف کو متحرک نہیں قرار دیتے، اس لئے عربی لفظوں میں جہاں جہاں الف متحرک آتا ہے وہاں اسے ہمزہ فرض کرتے ہیں۔ اور جہاں الف کو ہمزہ سے بدلنا ممکن ہوتا ہے، وہاں الف کی جگہ ہمزہ ہی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ چونکہ عربی میں بے شمار الفاظ الف سے شروع ہوتے ہیں، لہذا عربی والے ان تمام الفوں کو ہمزہ کہتے ہیں۔ مثلاً **الی الآخر** میں پہلے الف کو ہمزہ کہیں گے، "یٰ" کو الف مقصورہ کہیں گے، اور "آ" کو الف ممدودہ کہیں گے۔ اگر ہمزہ نہ ہوتا تو مندرجہ ذیل طرح کے تمام الفاظ الف کے ساتھ لکھے جاتے:

آرائش [آراش]: پیدائش [پیداش]: تزئین [تزاین]: جائیے [جاایے]: رئیس [رایس]: کائی [کاای]: کوئی [کوای]: مطمئن [مطم ان]: مئی [م ای] وغیرہ۔

عربی کے زور میں بعض لوگ اردو میں بھی وہاں ہمزہ لگا دیتے ہیں جہاں اب اردو نے اسے ترک کر دیا ہے لیکن عربی میں وہ موجود ہے:

تأمل [ت امل] اردو میں صرف تامل: مؤرخ [م ارخ] اردو میں صرف مورخ، اور اس طرح کے تمام الفاظ: متأثر [م ت اثر] اردو میں صرف متاثر۔

ہمزہ سے غیر ضروری لگاؤ ہی اس بات کی وجہ ہے کہ بعض عربی داں لوگ اردو میں لفظ کے شروع میں آنے والے الف پر بھی ہمزہ لگا دیتے ہیں، یا لگانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب غلط ہے اور عربی کے الف/ہمزہ کو اردو پر لادنے کی احمقانہ کوشش کا نتیجہ ہے۔

اردو کے لئے ہر وہ الف ممدودہ ہے جو کھینچ کر پڑھا جائے، چاہے وہ لفظ کے شروع میں ہو یا بیچ میں یا آخر میں۔ اور الف مقصورہ وہ الف ہے جو عربی کے بعض الفاظ، مثلاً "حسنیٰ، عقبیٰ، عیسیٰ، لیلیٰ" وغیرہ میں ہے۔ جو الف کھینچ کر نہ پڑھا جائے وہ محض الف ہے، نہ مقصورہ نہ ممدودہ۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر"، اور بعض دوسرے لغات میں لفظ کے شروع میں آنے والے غیر ممدودہ الف کو "مقصورہ" کہا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ عربی کے لحاظ سے ایسا الف

ہمزہ ہے، اور اردو کے لحاظ سے محض الف، نہ مقصورہ نہ ممدودہ۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ عربی کے الف مقصورہ کو سیدھے الف میں بدل لینے کا رجحان اردو فارسی میں ایک عرصے تک رہا، لیکن اب بہت کم ہو گیا ہے بلکہ اردو میں اب رجحان اس کے خلاف ہی ہے، کیونکہ ''دعوا [دعویٰ]، اعلا [اعلیٰ]، استغنا [استغنیٰ] '' وغیرہ مقبول نہیں ہو سکے ہیں۔ فی الحال الف مقصورہ والے حسب ذیل الفاظ عموماً سیدھے الف یا چھوٹی ہ سے لکھے جاتے ہیں:

- بلوا [بلویٰ]؛ تقوا [تقویٰ]؛ حمقا [حمقیٰ]؛ حیات [حیوٰۃ]؛ دنیا [دنییٰ]؛ سوا [سویٰ]؛ شکوہ [شکویٰ]؛ صحارا [صحاریٰ]؛ عاشورہ [عاشوریٰ]؛ ماسوا [ماسویٰ]؛ ماوا [ماویٰ]؛ مربہ [مربیٰ]؛ ملجا [ملجیٰ]؛ منتہا [منتہیٰ]؛ مولا [مولیٰ]؛ ہوا [ہویٰ، بمعنی ''ہوس''] وغیرہ۔

الف مقصورہ اگر لفظ کے آخر میں ہو اور اس لفظ پر یائے نسبتی لگائی ہو تو الف مقصورہ کو واو میں بدل دیتے ہیں۔ مثلاً:

اخریٰ / اخروی؛ دنییٰ / دنیوی؛ عیسیٰ / عیسوی؛ کسریٰ / کسروی؛ مصطفیٰ / مصطفوی؛ موسیٰ / موسوی؛ وغیرہ۔

ملحوظ رہے کہ ''مطبع مجتبائی'' اور ''مطبع مصطفائی'' کی صورت دیگر ہے۔ چونکہ ''مجتبوی، مصطفوی'' اردو میں خاص پیغمبرؐ کی ذات سے منسوب اشیا کے لئے مختص ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان مالکان مطبع نے اپنے ادارے کو ''مجتبائی / مصطفائی'' لکھ کر پیغمبرؐ کی نسبت سے التباس کو زائل کر دیا، یعنی یہ واضح کر دیا کہ اس ادارے کے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ اسے ذات نبوی سے کوئی نسبت ہے۔ یہ احتیاط کا تقاضا تھا، اور خوب ادا ہوا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ''عیسائی'' اور ''موسائی'' مخصوص معنوں میں ہیں، یعنی ''دین عیسیٰ / دین موسیٰ کا ماننے والا۔'' اگر اور کوئی نسبت ظاہر کرنی ہو تو حسب معمول ''عیسوی / موسوی'' کہیں گے۔ ''موسائی'' اب بہت شاذ ہے۔ ''نور اللغات'' میں علی اوسط رشک کا یہ شعر سند میں مرقوم ہے ؎

موسائیوں کو طور کے جلوے سے کم نہیں جو دل کی ہے اس بت روشن ضمیر کی

غالب نے بھی اپنے ایک خط میں ''موسائی'' لکھا ہے۔ ''تولائی'' بھی مستثنیات میں ہے۔ چونکہ

اصل لفظ کا آخری حرف الف مقصورہ ہے، اس لئے اس پر یائے نسبتی لگاتے وقت الف مقصورہ کو واؤ میں بدل جانا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، شاید اس لئے کہ اس لفظ کو ''تبرا'' کے مقابل قیاس کرلیا گیا۔ ''تبرا'' میں الف مقصورہ نہیں، اس کا آخری حرف ہمزہ ہے اور اصل عربی میں یہ ''تبرّء'' ہے۔ اس طرح کے دیگر لفظوں کی طرح یہاں بھی اردو والوں نے ہمزہ حذف کر دیا ہے، اور پھر اس کے قیاس پر ''تولا/تولائی'' کرلیا۔ ناسخ ؎

خدایا مجھ کو اس سے ہے تولا اور اس کے دشمنوں سے ہے تبرا

غالب ؎

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے جو ائمہ کے ہیں تولائی

لفظ کے آخر میں الف مقصورہ والے ناموں (اعلیٰ، عیسیٰ، لیلیٰ، مرتضیٰ، مصطفیٰ، موسیٰ، وغیرہ) میں الف مقصورہ کو کھڑے الف سے لکھنا اردو یا فارسی میں بالکل ہی قبول نہیں کیا جا سکا ہے۔ ''صغریٰ'' کو کہیں کہیں ''صغرا'' لکھا ہوا دیکھا گیا ہے، مثلاً صغرا ہمایوں مرزا اپنا نام الف ہی سے لکھتی تھیں۔ لیکن میری رائے میں اس املا کا ترک انسب ہے۔ ترکیب کی صورت میں البتہ کبھی الف مقصورہ کو چھوٹی ی سے بدل لیتے ہیں، یا الف سے بدل لیتے ہیں۔ دونوں صورتیں صحیح ہیں، لیکن جو رائج ہو وہ انسب ہے:

تقویٰ جوانی، تقوائے جوانی؛ دعویٰ تمکیں، دعوائے تمکیں؛ عیسیٰ دوراں؛ لیلیٰ شب، لیلائے شب؛ موسیٰ عمراں، وغیرہ۔

آخر میں الف مقصورہ رکھنے والے ناموں اور الفاظ کو فارسی والے کبھی کبھی یوں برتتے تھے گویا آخری حرف، الف مقصورہ نہیں، چھوٹی ی ہے۔ غالب نے اسی وجہ سے لکھا ہے ؎

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسی نہ ہوا

یہاں ''تقوی، عیسی'' مع یائے تحتانی، یعنی بروزن ''خالی، سردی'' وغیرہ پڑھے جائیں گے۔ جیسا کہ خیال میں ہوگا، اس غزل کا مطلع ہے ؎

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

''افعی'' اور ''معنی'' دو لفظ ایسے ہیں جن میں الف مقصورہ چھوٹی ی کی طرح پڑھا جاتا ہے، یعنی اصلاً یہ الفاظ ''افعی'' اور ''معنی'' ہیں۔ دلی میں ''معنی'' بروزن ''پیدا'' اب بھی کبھی سنائی دے جاتا ہے، لیکن اب اس لفظ کو شاید ہی کوئی ''پیدا، ایسا، ہوا'' وغیرہ کا قافیہ کرتا ہو۔ اب ''معنی'' کا قافیہ ہمیشہ ہی چھوٹی ی والے الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ''اللہ، رحمن، زکواۃ، صلواۃ'' جیسے لفظوں میں تیسرا حرف الف ہی ہے جسے قاعدۂ کتابت کی رو سے دوسرے یا تیسرے حرف کے اوپر، یا واو کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ یہ الف مقصورہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''رحمان، زکات، صلات'' وغیرہ بھی لکھنا درست مانا جاتا ہے۔ ''اللہ'' کے بارے میں البتہ یہ مانا ہوا اصول ہے کہ اردو میں اسے ''اللاہ'' یا ''الاہ'' لکھنا صحیح نہیں، عربی میں بھلے ہی ہو۔ دیکھئے، ''ہمزہ'' ، ''ہمزہ کا غیر ضروری استعمال''۔

الفاظ کے جوڑے اردو کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس میں دو الفاظ پر مشتمل بہت سے فقرے ہیں۔ یہ الفاظ کم و بیش ہم معنی ہوتے ہیں اور ان دو لفظی فقروں میں ان کم و بیش ہم معنی الفاظ کی تکرار حسن کلام یا زور بیان کے لئے ہوتی ہے۔ یہ فقرے اب واحد لغت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، یعنی جوڑے کا کوئی لفظ بدل دیا جائے تو فقرے کے حسن، یا اس کی محاوراتی کیفیت، میں فرق آ جائے گا، بشرطیکہ بدلی ہوئی صورت کا جوڑا بھی واحد لغت کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح، جوڑے کے دونوں لفظ جس ترتیب سے رائج ہیں اس کے علاوہ کوئی اور ترتیب اختیار کی جائے تو وہ خلاف محاورہ ٹھہرے گی، بشرطیکہ بدلی ہوئی ترتیب اپنی جگہ پر خود بھی رائج نہ ہو۔ مثلاً ''رسم و راہ'' بھی ٹھیک ہے، اور ''راہ و رسم'' بھی ٹھیک ہے۔

یہ جوڑے تین شکلوں میں نظر آتے ہیں:

(۱) کلمتین کے درمیان حرف عطف ''واو'' ہے۔

(۲) کلمتین کے درمیان کوئی حرف عطف نہیں ہے۔

(۳) کلمتین کے درمیان حرف عطف ''اور'' ہے۔

مثال کے طور پر، حرف ''واو'' والے بعض فقرے حسب ذیل ہیں:

باغ و بہار، بوم و بر، تاج و تخت، تخت و تاج، تیز و تند، جام و پیمانہ، جوش و خروش،

حسن وخوبی، خط وکتابت، دارورسن، دل وجان، دل وجگر، رنج وغم، رشک وحسد، شان وشوکت، شاہ وشہر یار، شرم وحیا، شعر وادب، شعر وسخن، شک وشبہ، شکل وصورت، شور وشیون، شور وغل، عیش وعشرت، غم وغصہ، غیظ وغضب، قوانین وقواعد، لعل وگہر، لعل ویاقوت، مال ومتاع، مہر ومحبت، نالہ وشیون، نام ونشان، نام ونمود، ہوش وحواس، یار ومددگار، وغیرہ۔

کلمتین کے مابین کوئی حرف عطف نہ رکھنے والے بعض فقرے حسب ذیل ہیں:۔

آندھی طوفان، جان پہچان، جانچ پڑتال، جھاڑی جھنڈی، چال چلن، چولی دامن، چہرہ بشرہ، چہرہ مہرہ، حساب کتاب، خط کتابت، داؤ پیچ، دکھ درد، دل دماغ، دنیا جہان، دوا علاج، دور دراز، راہ باٹ، ساگ پات، سنگی ساتھی، شادی بیاہ، صورت شکل، غل شور، کھیل کود، گل بوٹا، گل پھول، گھر دوار، لڑکے بالے، مرز بوم، منت سماجت، ناک نقشہ، نام پتہ، وغیرہ۔

کلمتین کے درمیان لفظ ''اور'' رکھنے والے بعض فقرے حسب ذیل ہیں:۔

آندھی اور طوفان، تخت اور تاج، حسین اور جمیل، رسم اور راہ، ساز اور سامان، ظالم اور جابر، قانون اور قاعدے، وغیرہ۔

ملحوظ رہے کہ یہ صفت انگریزی میں بھی ہے۔ اسے Hendiadys (یعنی ''دو کے ذریعہ ایک'') کہتے ہیں، لیکن وہاں اس کا وقوع کم ہے، اور وہاں ایسے جوڑے ہمیشہ حرف عطف and کے ساتھ آتے ہیں، مثلاً:

down and out; heart and soul; house and home ; law and order; life and soul; might and main

شیکسپیئر نے حسب معمول یہاں بھی اختراعات کی ہیں، چنانچہ حسب ذیل جوڑے سب سے پہلے شیکسپیئر ہی نے استعمال کئے:

sound and fury

book and volume of my brain

angels and ministers of grace

fantasy and trick of fame

الفاظ کے جوڑوں کی کثرت، اور ایسی ہی بعض دیگر خوبصورتیاں اور بھی ہیں جو صرف اردو میں ملتی ہیں، یہ اردو کی خاص شان میں ہیں۔ کاش ہم ان کی مناسب قدر کر سکتے۔ دیکھئے: ''تابع موضوع''؛ ''تابع مہمل''؛ ''سابق مہمل''؛ ''گنتیوں کے جوڑے''۔

الف اور ہمزہ اردو کے لئے الف اور ہمزہ الگ الگ حرف ہیں۔ اکثر اوقات (خاص کر وسط لفظ میں) ہمزہ وہی کام کرتا ہے جو ہم الف سے بھی لے سکتے تھے، (مثلاً ''لائے''؛ ''سئیں''، وغیرہ کو ''لا اے'' اور ''س ایں'' لکھ سکتے ہیں)۔ لیکن اردو نے الف کی جگہ ہمزہ اختیار کیا کیونکہ اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ عربی میں ہمزہ اور الف ایک ہی چیز ہیں۔ عربی میں الف کو ہمیشہ ساکن فرض کرتے ہیں اور عربی میں ابتدا بسکون محال ہے، لہٰذا جن الفاظ کے شروع میں الف ہے ان میں الف کو ہمزہ فرض کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی الف پر ہمزہ لکھ بھی دیتے ہیں۔ عربی کے جن الفاظ میں وسط لفظ میں ہمزہ ہے، مثلاً ''جرأت''، ان میں بھی عربی والے الف کو بے وجود مانتے ہیں اور صرف ہمزہ پڑھتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سب باریکیوں کے باوجود عربی میں ہمزہ کوئی حرف نہیں۔ حرف تو الف ہی ہے، جب الف متحرک ہو جائے تو عربی والے اسے ہمزہ کہتے ہیں۔ دیکھئے: ''الف''؛ ''ہمزہ''۔

الف بے دیکھئے: ''اردو کے حروف تہجی کی جنس''۔

الف لیلوی بروزن ''غیر حاضری'' یا بروزن فاعلات فع، اول مفتوح، بمعنی ''الف لیلہ سے متعلق، الف لیلہ کی طرز کا، جو چیز الف لیلہ میں واقع ہو۔'' یہ لفظ عربی میں نہیں ہے، اردو والوں نے بنا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ''الف لیلہ'' داستانوں کے اس مجموعے کا نام ہے جسے انگریزی میں Arabian Nights کہتے ہیں۔ ''الف لیلہ'' میں ہائے ہوز دراصل تائے تانیث ہے، یعنی ''لیل'' کی جمع ''لیلہ'' اور عربی میں یہ مونث ہے۔ اردو میں ''لیلہ'' کو ''لیلیٰ'' فرض کر کے یائے نسبتی لگاتے وقت الف مقصورہ کو حسب قاعدہ واؤ میں بدل لیا گیا (دیکھئے: ''الف مقصورہ'')۔ اگر یہ خیال رکھا جاتا کہ اصل میں تائے تانیث ہے تو ''لیلوی'' کی جگہ ''لیلتی'' بناتے، جیسے ''برکت / برکتی؛ عشرت / عشرتی؛ نصرت / نصرتی'' وغیرہ۔ لیکن زبان یوں ہی اپنا عمل کرتی ہے۔

الف لیلہ اول مفتوح، دوم ساکن، سوم موقوف، بروزن فاعلات۔ اس لفظ کو دوم مکسور کے ساتھ بولنا، یا آخری حرف کو ہائے ہوز کے بجائے الف مقصورہ (الف لیلیٰ) لکھنا غلط ہے۔

الف مقصورہ دیکھیے ''الف''۔

الف ممدودہ دیکھیے ''الف''۔

الکحل انگریزی لفظ Alcohol ہر اس محلول کو کہتے ہیں جسے آگ پر ڈالیں تو بھڑک اٹھے۔ یہ دراصل عربی لفظ **الکحل** ہے، کیونکہ عربوں نے سب سے پہلے یہ بات دریافت کی تھی کہ سرمہ (جس کا سائنسی نام Antimony ہے) اور جس سے سرمہ (عربی میں **الکحل**) بنتا ہے، اسے کشید کر کے اس کا رسوب Precipitate نکالیں تو وہ رقیق ہوتا ہے لیکن آگ پر ڈالنے سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس رسوب کو بھی عربوں نے **الکحل** کہا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں نے اس لفظ کو عربی سے لے لیا اور اپنے اپنے تلفظ میں، لیکن اصل ہی معنی میں، استعمال کیا۔ اردو میں الکحل (بروزن فاعلن) لکھنا بہتر ہے۔ لیکن بعض لوگ انگریزی کی نقل میں ''الکوہل'' بھی لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ بروزن فاعلن یا مفعولن کرتے ہیں۔ میں الکحل کو ترجیح دیتا ہوں۔

الکوہل دیکھیے ''الکحل''۔

الگ تھلگ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ''الگ تھلگ'' اور ''الگ'' میں کوئی فرق نہیں، بلکہ ''الگ'' کے مفہوم کو زور دے کر کہنا ہو تو ''الگ تھلگ'' کہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''الگ تھلگ'' میں بے تعلقی اور مغائرت کا مفہوم ہے، اور ''الگ'' میں ''شامل کا نقیض، دور، جدا'' وغیرہ کا مفہوم ہے۔ ظفر اقبال ؂

تیرگی خیر میں شعلۂ شر ہے الگ   عیب ہے اپنا جدا، اپنا ہنر ہے الگ

اس کے برخلاف، کہ ''الگ تھلگ'' ایک نفسیاتی صورت حال کو ظاہر کرتا ہے۔ داغ ؂

کچھ اس کو وہم کچھ اس کو غرور رہتا ہے   الگ تھلگ وہ بہت دور دور رہتا ہے

بہادر شاہ ظفر ؂

کیونکے رہے نہ ہم سے وہ ماہ جبیں الگ تھلگ   رہتا ہے اک زمانے سے ماہ مبیں الگ تھلگ

دیا شنکر نسیم ؂

دن بھر تو الگ تھلگ رہے وہ　　　دو وقت سے شام کے ملے وہ

اس فقرے کو "کج سے، صفائی سے، بے لاگ" کے معنی میں بھی بولتے تھے، مثلاً "امیر اللغات" میں فقرہ درج ہے:

انھوں نے تال ایسی الگ تھلگ اٹھائی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

لیکن اب یہ معنی بہت شاذ ہیں، بلکہ معدوم ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو نئے معنی اس فقرے کو پہنائے جا رہے ہیں وہ البتہ غلط اور واجب الترک ہیں:

غلط: متعدی امراض کے بیماروں کو الگ تھلگ رکھنا چاہئے۔

غلط: پناہ گزینوں کو شہر سے الگ تھلگ رکھا گیا۔

غلط: اس معاملے کو الگ تھلگ رکھئے، اس پر پھر غور کریں گے۔

غلط: جلسے کے سب شرکا ایک ساتھ نہیں آئے، الگ تھلگ آئے۔

مندرجہ بالا چار میں سے اول تین میں "الگ تھلگ" کی جگہ صرف "الگ" درست ہے۔ چوتھے جملے میں "الگ تھلگ" نہیں، "الگ الگ" کہنا چاہئے۔

اللہ　　ادھر بعض عربی داں حلقوں میں، اور بعض پاکستانی رسالوں اور کتابوں میں "اللہ" کے بجائے "الله" لکھا جانے لگا ہے۔ یہ عربی میں صحیح ہوگا، لیکن اردو میں بالکل غلط ہے۔ اسم ذات پاک کے املا سے چھیڑ کرنا دانش مندی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ "اللہ" دیکھنے میں بھلا لگتا ہے اور اس کی علامتی معنویت بھی ہے۔ اردو میں "الله" لکھنا کچھ بہت بھلا نہیں لگتا اور نہ اس میں وہ علامتی معنویت ہے جو "اللہ" میں ہے۔ اس خوبصورت اور بامعنی املا پر کسی املا کو ترجیح نہیں۔

اللہ توکل　　یہاں "توکل" کا تلفظ بروزن "تولا" ہے، یعنی سوم مفتوح ہے۔ دیکھئے، "توکل"۔

اللہ حافظ　　کچھ عرصے سے پاکستان میں "خدا حافظ" کی جگہ "اللہ حافظ" بولا اور لکھا جانے لگا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض اہل ہند بھی اس راہ پر چل نکلے ہیں۔ اس تبدیلی کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ الوداعی سلام کے معنی میں "اللہ حافظ" اردو کا روزمرہ نہیں، "خدا حافظ" اردو کا روزمرہ ہے، بہادر شاہ ظفر ؎

ہم تو چلتے ہیں لو خدا حافظ　　　بت کدے کا بتو خدا حافظ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترقی اردو بورڈ، پاکستان کے ضخیم ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''اللہ حافظ'' بطور الوداعی سلام درج نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''اللہ'' تو عربی ہے، اور ''خدا'' فارسی، اس لئے ''خدا حافظ'' کہنا درست نہیں۔ اول تو یہ عربی فارسی کی دلیل بے معنی ہے، کیوں کہ ہم اردو سے بحث کر رہے ہیں، اور اردو میں بحث کر رہے ہیں۔ اردو اپنی جگہ پر مستقل زبان ہے، وہ کسی غیر زبان کی پابند کیوں ٹھہرائی جائے؟ دوسری بات یہ کہ اگر ''اللہ'' کو عربی، اور ''خدا'' کو فارسی ہونے کی بنا پر یکجا کرنا غلط ہے تو پھر اردو کے ان گنت فقرے غلط قرار دینے ہوں گے۔ مثلاً ''خدائے تعالیٰ''، ''خدائے عز و جل''، ''خدائے واحد''، ''خدا رکھے''، ''خدا واسطے کا بیر''، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب فقرے صحیح اور فصیح ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ''خدا حافظ'' بالکل صحیح اور مروج ہے۔ ''اللہ حافظ'' غلط نہیں، لیکن غیر ضروری اور ایجاد بندہ ہے۔ یہ اس لئے بھی غیر ضروری ہے کہ اسے اکثر برے معنی میں بولتے ہیں، مثلاً:

ان کی کارکردگی اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔

آپ کو گھر کی خبر ہے نہ دفتر کی، آپ کا بس اللہ حافظ ہے۔

بس میاں یہ بیل منڈھے چڑھ چکی، اللہ حافظ ہے۔

اللہ میاں بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''اللہ میاں کہتے ہیں'' وغیرہ میں شرک کا شائبہ ہے۔ لیکن زبان کا عمل اپنی ہی منطق رکھتا ہے۔ ہم لوگ احترام ظاہر کے لئے ایسے موقعوں پر جمع بولتے ہیں۔ فارسی اور عربی میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس میں شرک اور اثم کا کیا سوال۔ فقرہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں'' کے معنی یہ تھوڑی ہیں کہ نعوذ باللہ محمدؐ کے علاوہ بھی کوئی ہے جسے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ دیکھئے: ''مزاج''۔

اللہ [ہی] حافظ ہے دیکھئے: ''اللہ حافظ''۔

المیہ یہ لفظ ہمارے یہاں Tragedy (بطور صنف ادب، یا بطور واقعہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے عربی سمجھ کر اصرار کرتے ہیں کہ اس میں یائے تحتانی مشدد ہے اور اسے بروزن فعلاتن برتنا چاہئے (ال می یہ)۔ لیکن یہ سراسر بھول ہے۔ بے شک یہ لفظ عربی

''الم'' سے بنایا گیا ہے، لیکن Tragedy کے معنی میں یہ عربی نہیں، لہٰذا اس پر عربی قاعدے جاری کرنا بے معنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر یہ لفظ عربی میں بمعنی Tragedy ہوتا بھی، تو اردو میں دخیل ہو جانے کے بعد اسے اردو قرار دیا جانا چاہئے۔ لفظ جس زبان میں داخل ہوتا ہے، اس کا پابند ہو جاتا ہے۔ نئی زبان میں داخل ہونے کے بعد اس پر اس زبان کے قاعدے نافذ نہیں ہو سکتے جہاں سے وہ آیا ہے۔ دیکھئے: ''طربیہ''۔

الن اول مضموم، دوم مفتوح مشدد، بمعنی '' [illegible] ہے، لیکن [illegible] اں۔ نظیر اکبر آبادی کا شعر ہے۔

میں چھوڑوں اور چاہوں تمھیں اے بی الن ہے
عجب تم بھی کوئی الن سڑی خبطی دوانی ہو

دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

الو یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، لیکن کبھی کبھی اس کا مونث ''الن'' (دوم مشدد مفتوح) بولتے ہیں۔ دیکھئے: ''الن''، دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

الینڈنا اول مضموم، دوم مفتوح، بمعنی ''انڈیلنا''۔ یہ بہت دلچسپ لفظ ہے، کیونکہ یہ ''انڈیلنا'' کے حروف میں رد و بدل سے بنا ہے۔ محمد حسین آزاد نے سودا کے بیان میں ان کا ایک مطلع نقل کیا ہے جس میں ''الینڈ'' کا لفظ ہے، اور بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ یہ کوئی فرضی لفظ ہے۔ آسی کے مرتبہ کلیات سودا میں وہ غزل نہیں ہے جس کے مطلعے میں ''الینڈ'' نظم ہوا ہے۔ اس سے اور بھی شک گذرتا تھا کہ شاید یہ شعر ہی الحاقی ہو۔ لیکن ناجرہ ولی الحق کی مرتبہ غزلیات سودا میں وہ غزل موجود ہے۔ (''آب حیات'' میں اس مطلعے کا متن کچھ مختلف ہے) ۔

ترکش الینڈ سینۂ عالم کا چھان مارا مژگاں کے بان نے تو ارجن کا بان مارا

انشا نے بھی یہ لفظ برتا ہے اور حق یہ ہے کہ خوب برتا ہے ۔

جی یہ چاہے ہے ابھی شیشۂ صہبا کو الینڈ شمع سے دیجئے لگا چادر مہتاب میں آگ

دیکھئے: ''تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں''۔

امالہ، شہروں اور جگہوں کے ناموں میں اردو میں بہت سے الفاظ ہیں جن کے

آخر میں ہائے ہوز یا الف ہے۔ مفعول یا مجرور صورتوں میں ان کا آخری الف یا ہائے ہوز یائے تحتانی میں بدل جاتا ہے۔ اسے ''امالہ'' (جھکنا) کہتے ہیں۔ امالہ ایک مستقل اور ناقابل تبدیل عمل ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے قاعدے پوری طرح مقرر نہیں ہو سکے ہیں۔ صفیر بلگرامی نے ''رشحات صفیر'' میں اچھی کوشش کی ہے۔ بہر حال، بنیادی اصول یہ ہے کہ جن لفظوں میں امالہ درکار ہے، ان کو بولتے وقت امالہ ضرور کرنا چاہیے، خواہ ان کو ممال (یعنی امالے کی شکل میں) نہ لکھا گیا ہو۔

شہروں اور جگہوں (ملکوں نہیں) کے ناموں پر بھی امالہ جاری ہوتا ہے، خواہ لکھا نہ جائے۔ اکثر صورتوں میں ممال لکھنا کچھ بدنما بھی لگتا ہے، لہذا ممال کر کے لکھتے نہیں ہیں، لیکن پڑھتے اور بولتے امالے کے ساتھ ہیں۔ مثال کے طور پر:

پٹنہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

یہاں ''پٹنہ'' کا تلفظ ''پٹنے'' ہوگا۔

وہ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔

یہاں ''آگرہ'' کو ''آگرے'' بولیں گے۔

یہ سڑک سیدھی شملہ کو چلی گئی ہے۔

یہاں ''شملہ'' کو ''شملے'' بولیں گے۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شہروں اور جگہوں کے ناموں پر امالہ جاری کرنے کا رجحان اب کچھ کم ہو رہا ہے، خاص کر جب علامت مفعولی یا حرف جار ظاہر کیا گیا ہو۔ مثلاً:

وہ آگرہ گئے۔

کلکتہ کے لوگ بنگالی ہی بولتے ہیں۔

مندرجہ بالا صورتوں میں بھی [illegible] یا اور اچھی اردو کا تقاضا یہی ہے کہ امالہ کیا جائے۔

اُمڈنا ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''اُمڈنا'' اور ''امنڈنا'' میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اور یہ بالکل درست ہے کہ معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن تلفظ کا فرق کئی

حالات میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ''اندا'' اور اس کی تصریفی شکلیں زیادہ رائج ہیں۔ تلفظ کے فرق کی وضاحت کے لئے دیکھئے: ''امنڈنا''۔

ایمرجنسی ہندی میں لفظ Emergency کے لئے ''آپت کالین'' رائج ہے جو بھونڈا بھی ہے اور ہر جگہ مناسب بھی نہیں۔ مثلاً ''آپت کالین جلسہ/ بیٹھک'' نہایت نامناسب ہے۔ اردو میں لفظ ''ہنگامی/ ہنگامی حالات'' ہر جگہ کے لئے مناسب اور موزوں ہے۔ اس کے بجائے ایمرجنسی لکھنا اپنی لسانی مفلسی کا اعلان کرتا ہے:

ہنگامی جلسہ: ہنگامی اجلاس: ہنگامی بیٹھک: ہنگامی حالات (ملک میں ہنگامی حالات برپا کر دیے: ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی: اسپتال میں ان کا ہنگامی آپریشن ہوا: اسپتال میں ان کا ہنگامی عمل جراحی ہوا: یہ معاملہ ہنگامی ہے، وغیرہ)۔

امروت دیکھئے: ''امرود''۔

امرود اول مفتوح، واؤ معروف، مشہور پھل۔ ''موید الفضلا'' میں لکھا ہے کہ اس کا تلفظ ''بہ واؤ فارسی'' ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ فارسی میں واؤ مجہول رہی ہوگی۔ اس لفظ کا ایک تلفظ ''امروت'' بھی ہے، اور بعض لوگوں کی زبان پر ''ارموذ'' اور بعض کی زبان پر ''ارموت'' بھی سنا گیا ہے (ہر جگہ واؤ معروف)۔ دیکھئے: ''تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں''۔

املا اس لفظ کو مذکر اور مونث دونوں طرح سنا گیا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ Dictation کے معنی میں اب یہ عام طور پر مذکر ہے، اور ''ہجے'' کے معنی میں عام طور پر مونث۔ یعنی جب کسی کو کوئی عبارت لکھوائی جاتی ہے تو کہتے ہیں، مثلاً ''میں نے طالب علموں کو املا لکھوا دیا ہے''۔ اور کسی لفظ کی لکھاوٹ کے معنی میں بولیں تو مونث کہیں گے، مثلاً ''اس لفظ کی املا بڑی ح سے ہے، ہائے ہوز سے نہیں۔'' علی اوسط رشک ؎

نامہ جاناں ہے یا لکھا مری تقدیر کا خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے

مرزا فرحت اللہ بیگ، فقرہ: املا بھی اسی کی ہے، انشا بھی اسی کی ہے۔

رشید حسن خاں کا بیان ہے کہ آغا جو ہندی لکھنوی نے ''املا'' کو مختلف فیہ لکھ کر مونث کو مرجح قرار دیا ہے۔ (''زبان اور قواعد'' مصنفہ رشید حسن خاں، صفحہ ۱۸۴)۔ رشید حسن خاں نے غالب

کا بھی ایک حوالہ دیا ہے: ''املا اہل ہند کی املا کے موافق ہی رہی''۔ یہی قرأت ''تیغ تیز'' مرتبہ وزیر الحسن عابدی بہ عنوان ''افادات غالب'' (ص ۴۶) میں ہے۔ لیکن ایک خفیف سا امکان ہے کہ غالب نے ''املا اہل ہند کے املا کے موافق ہی رہے'' لکھا ہو، کیوں کہ اس زمانے میں مجہول معروف کو لازماً الگ الگ طرح سے نہیں لکھتے تھے۔ بہر حال گمان غالب یہی ہے کہ غالب نے ''املا'' کو مونث لکھا ہے۔

مختصراً، آج کی صورت حال یہ ہے کہ کوئی عبارت بول کر لکھائی جائے تو اس املا کو مذکر کہیں گے، اور'' ہجے یا لکھاوٹ'' کے معنی میں ''املا'' کو مونث کہیں گے۔ لیکن ''ہجے یا لکھاوٹ'' کے معنی میں اسے مذکر کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔

امنڈنا عام رواج یہ ہے کہ ''اُمڈنا/ اُمنڈنا'' کی جن تصریفی شکلوں میں حرف دوم ساکن ہے، وہ سب ''اُمڈنا'' کی شکلیں ہیں۔ (۱) فائز (۲) شاہ مبارک آبرو ؎

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

لبریز ہو انکھوں میں اُمڈا ہے آج برکا عاشق نے آ و نا سن آنگن تمام جھرکا

اگر حرف دوم کو متحرک رکھنا ہے تو ''اُمنڈ/ اُمنڈنا'' کہتے ہیں۔ وزن کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی ''اُمنڈ'' مع نون غنہ بروزن فعول نہیں ہے۔ نظیر اکبر آبادی ؎

جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں نالے امنڈ رہے ہیں برسے ہے مینھ سراسر بادل گھمنڈ رہے ہیں

بالفاظ دیگر: ''گھٹا امنڈ رہی ہے'' بہتر ہے، اور ''گھٹا اُمڈی ہے'' بہتر ہے۔

امید یہ لفظ آج کل عموماً دو طرح بولا جاتا ہے۔

بروزن فعول: اول مضموم، میم مخفف، یائے معروف [بروزن معید]

بروزن مفعول: اول مضموم، میم مشدد، یائے معروف [بروزن خورشید]

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی شخص اپنی سہولت یا فقرے کی ضرورت کے اعتبار سے کبھی مندرجہ بالا میں سے ایک تلفظ استعمال کرتا ہے اور کبھی دوسرا۔ لیکن اس لفظ کے کئی اور تلفظ بھی ہیں، اور سب صحیح ہیں اگر چہ ان میں سے کوئی تلفظ اب کم مستعمل ہے، اور کوئی بہت کم۔

بروزن فعول: اول مضموم، میم مخفف مفتوح، یائے مجہول [بروزن عبید]

بروزن مفعول: اول مضموم، میم مشدد مفتوح، یائے مجہول [بروزن مقیش]

بروزن فعول: اول مضموم، میم مخفف مکسور، یائے مجہول [بروزن نوید]

ان میں سے کئی تلفظ فارسی میں نہیں ہیں۔ اردو میں کم لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ اتنا لچک دار ہو۔ دیکھیے: ''توقع''؛ دیکھیے: ''زمرد''۔

اندیشہ دیکھیے: ''توقع''۔

ان دیکھی کرنا ''نظر انداز کرنا، خاص کر جان بوجھ کر نظر انداز کرنا، چشم پوشی کرنا'' کے معنی میں یہ عجیب وغریب فقرہ ہندی کی ایجاد ہے۔ افسوس کہ بعض اردو والے بھی اس پر مہربان ہو رہے ہیں۔ اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔

انسیت عربی لفظ ''انس'' سے ''انسیت'' نہیں بن سکتا لیکن بعض اردو والوں نے بنالیا ہے۔ ابھی یہ زیادہ رائج نہیں ہوا ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہیں، لہٰذا ''انسیت'' کا ترک بہتر ہے۔

انکساری اول مکسور، لفظ ''انکسار'' کے ہوتے ہوئے ''انکساری'' بے ضرورت اور واجب الترک ہے۔ اس میں چھوٹی سی کوئی کام نہیں کر رہی ہے، فاضل محض ہے۔ حالی ؎

خاکساروں سے خاکساری تھی سربلندوں سے انکسار نہ تھا

صحیح: ان کا انکسار حد سے بڑھا ہوا تھا۔

غلط: ان کی انکساری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

غلط: ان کی گفتگو میں انکساری نہ تھی، غرور تھا۔

صحیح: ان کی گفتگو میں انکسار نہ تھا، غرور تھا۔

انگریز یہ لفظ ہمارے یہاں مختلف شعرا نے برتا ہے، لیکن اس کی اصل اور تلفظ کے بارے میں کلام ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیے ؎

شاہ حاتم ؎

شہر میں چرچا ہے اب تیری نگاہ تیز کا دو کرے دل کے تئیں یہ نیمچہ انگریز کا

مصحفی ؎

حیف بیمار محبت ترا اچھا نہ ہوا کرنے کو اس کی دوا ڈاکٹر انگریز آیا

انشا ؎

انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رسی آویختہ ہے جس میں فرانسیس کی ٹوپی

ان سب سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ الف کے بعد نون غنہ ہے، اور پورا لفظ بروزن مفعول ہے۔ غالب نے بھی یہی لکھا ہے۔ اس کے برخلاف، ناسخ نے بروزن فاعلات باندھا ہے۔ ؎

دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے رہنا بدن میں روح کو قید فرنگ ہے

بہرحال، آج کل سب لوگ "انگریز" بروزن مفعول، یعنی بروزن "لبریز" ہی بولتے ہیں۔

ناسخ کے شعر میں ضرورت شعری کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن الف کی حرکت، اور لفظ کی اصل، پر ہمارے زمانے میں اختلاف رہا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی مرحوم اس کو بکسر اول بولنے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ لفظ پرتگالی Ingles سے بنایا گیا ہے، لہٰذا اس میں اول مکسور ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے بچپن میں بعض بزرگوں کو بھی یہ لفظ بکسر اول بولتے سنا ہے۔ لیکن آج کل سب اس لفظ کو بفتح اول بولتے ہیں۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں بھی اس کو پرتگالی Ingles سے وضع کیا ہوا، لیکن بفتح اول لکھا ہے۔

"انگریز" کو مع اول مکسور بولنے اور پرتگالی الاصل قرار دینے میں کئی قباحتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ "انگریز" بفتح اول، فارسی میں بہت پرانا لفظ ہے۔ "برہان قاطع" میں اس کے معنی "نوعے از مردم فرنگ" درج ہیں۔ "برہان" سے یہ "انجمن آرائے ناصری" اور پھر "آنندراج" میں نقل ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب کسی غیر لفظ میں کچھ تبدیلی کر کے اپنا لفظ بناتے ہیں تو غیر لفظ کی حرکات کو بالکل، یا کم و بیش، برقرار رکھتے ہیں۔ فارسی والوں نے بعد میں فرانسیسی Ingles (اسپینی میں بھی Ingles ہی ہے) سے "انگلیس/انگلیز" (دونوں بکسر اول) بنایا۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا (یعنی "انگلیس") لیکن نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ Ingles بکسر اول سے "انگریز" بفتح اول نہیں بن سکتا۔ اب رہا "انگریز" بکسر اول، تو تیسری بات یہ کہ مغربی لغت نویس "انگریز" (بفتح اول یا بکسر اول) کو پرتگالی سے مشتق نہیں بتاتے۔ شیکسپیر میں تو "انگریز" درج ہی نہیں، اس نے صرف "انگریزی" بفتح اول لکھا ہے اور اسے فارسی الاصل بتایا ہے۔ پلیٹس نے اسے بفتح اول لکھ کر English کی بگڑی ہوئی صورت بتایا ہے، لیکن یہ

صورت کس طرح ہی، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں۔

ایک بالکل قیاسی بات میرے ذہن میں یہ ہے کہ "انگریز" بفتح اول فرانسیسی Anglais بمعنی "انگریز" سے بنا ہو۔ ہر چند کہ Anglais کا فرانسیسی تلفظ "آنگلے" ہے، لیکن جب اس کے بعد کوئی مصوتہ ہوتا اسے "آنگلیز" ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ہمیں فرانسیسی میں کہنا ہو "انگریز یہاں پر ہیں" تو ہم کہیں گے :Les Anglais ont ici اب بیچ کے دو لفظوں کو ملا کر "آنگلیزون" بولا اور پڑھا جائے گا۔ لہٰذا شاید ایسا ہوا ہو کہ فارسی/اردو والوں نے Anglais کے آخری حرف کو Z سن کر اس کا تلفظ "آنگلیز" قیاس کر لیا ہو۔ یہاں سے "انگریز" بفتح اول تک پہنچنا طبعی بات ہے۔ چونکہ آج کل لفظ "انگریز" کا مقبول (بلکہ واحد) تلفظ بفتح اول ہے، اور اس کا خاصا امکان ہے کہ یہ فارسی سے ہمارے یہاں بفتح اول آیا، لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ "انگریز" کا صحیح تلفظ بفتح اول ہی ہے۔ لیکن پہلے زمانے میں بکسر اول بھی اس کا ایک تلفظ رہا ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ لفظ اغلباً انگریزی English اور فرانسیسی Anglais کے قیاس پر انیسویں صدی میں بنایا گیا ہو گا۔ Ivor Lewis کے لغت Sahibs, Nabobs and Boxwallahs میں Ingrez درج کر کے لکھا ہے کہ یہ انیسویں صدی کا لفظ ہے اور English کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کی سند میں G.C.Whitworth کی An Anglo Indian Dictionary, 1885 درج کیا گیا ہے۔ تنہا English سے "انگریز" بکسر اول بن جائے، یہ سمجھ میں نہیں آتا، لہٰذا ممکن ہے فرانسیسی Anglais نے یہاں بھی کوئی کام کیا ہو۔

مختصر یہ کہ لفظ "انگریز" آج کل بفتح اول ہے۔ انیسویں صدی میں بکسر اول بھی رائج ہوا، لیکن بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی سے اسے بفتح اول ہی بولتے ہیں، اور یہی تلفظ مرجح ہے۔

انگریزی الفاظ، اردو میں اردو میں بہت سے انگریزی (یا مغربی زبانوں کے) الفاظ مستعمل ہیں۔ ان کو حسب ذیل گروہوں میں رکھا جا سکتا ہے:

(۱) وہ الفاظ جو پوری طرح کھپ گئے ہیں اور اس ان پر غیر زبان ہونے کا گمان نہیں گذرتا۔ مثلاً ٹکٹ، اسٹیشن، ڈار، پارٹی، واٹ (watt)، انسپکٹر، بجٹ، ٹیکس، ہال، پروفیسر، لیکچرر، لیمپ، بلب، وغیرہ۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا تلفظ ہم لوگوں نے بدل لیا ہے، جیسے

پاؤنڈ (Pound) کی جگہ ''پنڈ''' ''پینٹلونس (Pantaloons) کی جگہ ''پتلون'' وغیرہ۔ اس گروہ میں جو الفاظ ہیں، ان کے مرادف اردو میں عام طور پر نہیں ہیں۔

(۲) وہ الفاظ جن کے اردو مرادف ہیں، لیکن وہ اب کم بولے جاتے ہیں۔ مثلاً ٹمپریچر بجائے درجۂ حرارت، ایئرپورٹ بجائے ہوائی اڈا، والو (valve) بجائے کھلمدن، کلاس بجائے درجہ، پنسل بجائے قلم سرمہ، ٹی کوزی بجائے چائے پوشی، وغیرہ۔

(۳) وہ الفاظ جن کے اردو مرادف موجود ہیں، لیکن انھیں زیادہ تر تحریر ہی میں برتا جاتا ہے۔ عام بول چال میں انگریزی لفظ سننے میں آتا ہے۔ مثلاً الکشن (Election) بجائے انتخاب یا چناؤ؛ میجارٹی (Majority) بجائے اکثریت؛ فلائٹ (Flight) بجائے اڑان؛ ڈیماکریسی (Democracy) بجائے جمہوریت؛ پنشن (Pension) بجائے وظیفہ؛ فارن ایکسچینج (Foreign Exchange) بجائے زرمبادلہ؛ پاورٹی لائن (Poverty Line) بجائے خط افلاس، وغیرہ۔

(۴) کمپیوٹر اور دوسرے جدید سائنسی علوم سے متعلق الفاظ، جن کے اردو مرادف بن سکتے ہیں، یا تجویز کیے جاسکتے ہیں، لیکن ابھی انگریزی ہی اصطلاح ہی قائم رکھی گئی ہے، یا قائم رکھی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا طرح کے تمام الفاظ میں سے کچھ تو اردو میں دخیل ہیں، اور کچھ ابھی دخیل ہونے کے مختلف مراحل میں ہیں، اور ہمیں ان سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں اردو کے اچھے خاصے الفاظ موجود ہیں، اور وہ مستعمل بھی ہیں، لیکن پھر بھی ان کو ہٹا کر انگریزی لفظ لایا جارہا ہے۔ مثلاً:

غلط: سیریز؛ لیکچر؛ گروپ؛ ورکر؛ والنٹیر؛ ٹیچر

صحیح: سلسلہ؛ خطبہ/تقریر؛ گروہ/جرگا/طبقہ؛ کارکن؛ رضا کار؛ استاد/استانی/معلم/معلمہ

اس سے بدتر یہ ہے کہ ان لفظوں کی جمع بھی انگریزی لکھی جائے۔

غلط اور قبیح: لکچرس/لکچرز، گروپس، ورکرز/ورکرس، والنٹیرز/والنٹیرس، ٹیچرز/ٹیچرس

جاننا چاہیے کہ غیر زبان کے وہ الفاظ، جو ہماری زبان میں پوری طرح دخیل ہو گئے ہیں اور

وہ بھی، جو ابھی پوری طرح دخیل نہیں ہوئے، جب جمع کی شکل میں آئیں گے تو ان کی جمع اردو قاعدے سے بنے گی۔ عربی فارسی الفاظ کی بات اور ہے۔ ہم نے بہت سے عربی فارسی الفاظ ان زبانوں سے مع جمع اخذ لیے ہیں، بلکہ یوں کہیں کہ جب ہم نے ایک لفظ لیا تو کبھی کبھی اس کے ساتھ اس کی جمعیں بھی حاصل کر لیں۔ یعنی ایک کی جگہ دو یا تین لفظ لے لیے۔ کبھی کبھی برعکس بھی کیا، کہ لفظ لے لیا لیکن جمع نہیں لی۔ اور کبھی کبھی صرف جمع لے لی، اصل [واحد] لفظ نہیں لیا۔ بعض اوقات یہ ہوا کہ عربی جمع کے ساتھ فارسی جمع بھی لے لی، یا لفظ عربی کا لیا اور اس کی جمع فارسی کے اعتبار سے بنائی یا فارسی لفظ کی جمع عربی قاعدے سے بنائی۔ علاوہ بریں، اکثر و بیشتر ہم نے عربی فارسی الفاظ کی عربی فارسی جمع اپنے ہی قاعدے سے بنائی۔ یہ سب پیچیدہ عمل ہماری زبان میں مدتوں سے ہوتے رہے ہیں اور ان کی نہج قائم ہو چکی ہے۔ انگریزی الفاظ کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے آئے، اور آمد کی یہ لے انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے بہت تیز ہو گئی۔ اب کم ہے، لیکن آج کی بول چال میں انگریزی کے الفاظ اواخر انیسویں صدی کے مقابلے میں بہت زیادہ رائج ہیں۔ لیکن انگریزی الفاظ کو ان کی جمع کے ساتھ کبھی نہیں لیا گیا۔ اب بھی یہی اصول برقرار ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف کرتے ہیں وہ زبان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کی جمع انگریزی ہی قاعدے سے بنانا انگریزی کو ایک طرح کی مراعات (Privilege) دینا ہے۔ اس کی وہ کسی بھی طرح مستحق نہیں ہے۔ علامہ کیفی نے عمدہ بات کہی ہے کہ اول تو یہی کیا کم زیادتی ہے کہ انگریزی کا لفظ اردو میں لایا جائے، چہ جائے کہ اس کی جمع بھی بدیسی قاعدے سے بنائی جائے۔

استعمال کرنا درست نہیں۔ ''پر'' کے بہت سے معنی ہیں، اور
یعنی'' اونچا ہونے کی صورت حال۔ ''بعض حالات
میں یہ '' آگے ہونے
حال'' کے بھی معنی دیتا ہے، یہ معنی ''پر'' میں نہیں
ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) عقاب کہیں اوپر آسمان میں اڑ رہا تھا۔

(۲) میرے اوپر کچھ نہ تھا، صرف خلا تھا۔

(۳) اوپر خدا کی ذات ہے نیچے آپ ہیں۔

(۴) اوپر لکھی ہوئی کہاوتوں پر غور کیجیے۔

(۵) کاٹھ گودام کے بہت اوپر نینی تال ہے۔

(۶) یہاں سے دس میل کے اوپر ایک قصبہ ہے۔

(۷) راستے میں دہلی پہلے آتا ہے، لاہور اس کے اوپر ہے۔

(۸) اوپر والا، بمعنی "خدا"، یا بمعنی "چاند"، یعنی "وہ جو ہمارے اوپر [بلندی پر]، یا ہم سے اوپر [بالاتر] ہے۔"

مندرجہ بالا تمام استعمالات صحیح ہیں۔ اب حسب ذیل پر غور کیجیے:

غلط: طاق کے اوپر کتاب رکھی ہے۔ (گویا طاق کے اوپر معلق ہے۔ "پر" کا محل ہے)۔

غلط: مجھے لگا کہ کوئی چھت کے اوپر چل رہا ہے۔ (اوپر کے جملے پر قیاس کریں، یہاں بھی "پر" کا محل ہے)۔

غلط: آج چوراہے کے اوپر بڑی بھیڑ تھی۔ ("اوپر" یہاں بے معنی ہے۔ "پر" کا محل ہے)۔

غلط: اللہ میاں آسمان کے اوپر ہیں۔ (ظاہر ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا کا عرش آسمان پر ہے۔ "اوپر" یہاں بھی بے معنی ہے؛ "پر" کا محل ہے)۔

اب مرقوم الذیل کو دیکھیے:

صحیح: وہ سب میرے اوپر پل پڑے۔ (بہتر تھا کہ "مجھ پر" کہا جائے، لیکن موجودہ صورت بھی اب رائج ہوگئی ہے)۔

صحیح: اوپر کی بات تو یہی ہے۔ (یعنی "ظاہری بات"۔ یہ استعاراتی استعمال اب روزمرہ بن گیا ہے)۔

صحیح: ان کے یہاں اوپر تلے دو جڑواں اولادیں ہوئیں۔ (یعنی ایک کے بعد ایک)۔

اوپر والا عورتوں میں یہ لفظ "چاند" کے معنی میں مستعمل تھا۔ ممکن ہے اب بھی کچھ علاقوں میں رائج ہو۔

اود بلاؤ بروزن فاعلات، یہاں واؤ اعراب بالحرف کے لئے ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے۔ اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

اور دیکھئے "واو عطف اور "اور" کا فرق"۔

"اور" بروزن فع مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ لفظ "اور" شعر میں جہاں بھی آتا ہے، روانی میں مخل ہوتا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر میں کئی جگہ "اور" کو بروزن فع یعنی بروزن "ار" باندھتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب نہیں، یہ سوال ضرور اٹھایا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں "اور" لکھیں یا "ار"؟ دیکھئے "آئینہ"۔

اہلیت اصل میں حرف چہارم کی تشدید کے ساتھ بروزن مفعولن ہے۔ لیکن اردو میں حرف چہارم کی تخفیف کے ساتھ بروزن فاعلن بولا جاتا ہے اور اردو میں یہی درست ہے۔ "اہلیہ" بمعنی "بیوی" اردو والوں کی اختراع ہے اور اب اردو میں بھی بہت کم مستعمل ہے۔ بہر حال، تلفظ اس کا بھی بروزن فاعلن ہی درست ہے۔ عربی میں بیوی کو "اہل" کہتے ہیں۔ ممکن ہے "اہلیہ" وہاں سے بنایا گیا ہو۔

اہلیہ دیکھئے "اہلیت"۔

اہمیت یہ لفظ عربی میں نہیں ہے، اردو والوں نے "اہم" سے بمعنی "اہم ہونا" بنالیا ہے۔ عربی میں "اہم" کی میم مشدد ہے، اس لئے بعض لوگوں کے خیال میں "اہمیت" کو بھی مع تشدید میم اور یائے معروف کی بھی تشدید کے ساتھ بولنا چاہئے۔ لیکن جب یہ لفظ عربی میں ہے ہی نہیں، تو اس کا تلفظ عربی قاعدے سے کرنا لایعنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ رواج عام کو قواعد پر ترجیح ہے، اور اردو میں "اہم" بہ تسہیل میم بروزن فعل، یا بروزن "شکم" بولتے ہیں، تو پھر "اہمیت" کی میم مشدد کیوں ہو؟ لہٰذا "اہمیت" اردو میں عموماً فعولن، یعنی بروزن "حقیقت" بولا جاتا ہے، اور کہیں کہیں بروزن فاعلن، یعنی بروزن "عافیت" بھی بولا جاتا ہے۔ فی الحال یہ دونوں تلفظ صحیح ہیں۔

واضح رہے کہ "اہمیت" نسبۃً نیا لفظ ہے۔ یہ پلیٹس، "آصفیہ"، اور "امیر اللغات" کیا، "نور" میں بھی نہیں ہے۔

ایآ دیکھیے ''آیا''۔

ایٹم انگریزی لفظوں Atom اور Atomic کے لئے ''جوہر'' اور جوہری'' بنائے گئے جو بہت مناسب لفظ ہیں۔ کم از کم تحریر کی حد تک انھیں ضرور استعمال میں رہنا چاہیے۔

ایٹمی دیکھیے ''ایٹم''۔

ایجاد پہلے زمانے میں مذکر تھا، جرأت ؎

دیکھا نہیں ہے ایسا ستم میرے دل پر کرتا ہے وہ ستم گر ایجاد اس طرح کا

موجودہ زمانے میں عموماً مونث ہے، امیر اللہ تسلیم ؎

رشکِ اعدا سے کیا تسلیم خستہ کو شہید دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کی

اگرچہ انیسویں صدی کے شعرا میں سے بعض نے اسے مونث تو بعض نے مذکر باندھا ہے، لیکن جناب عبدالرشید کے خیال میں یہ لفظ آج بھی مختلف فیہ ہے۔ اس رائے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

ایجاد بندہ ''ایجاد'' کی تذکیر یا تانیث میں بحث شاید ہو سکتی ہو، لیکن ''ایجاد بندہ'' ہمیشہ مونث ہے۔ اس سے اس رائے کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ ''ایجاد'' کو مونث ٹھہرایا جائے۔

ایڈی کانگ دوم یائے مجہول، یہ لفظ دلچسپ ہے اور تتمہ سے تدبھو بنانے کی عمدہ مثال ہے۔ فرانسیسی میں اس کا تلفظ ''اید [یائے مجہول] دِ کاں'' ہے اور معنی ہیں ''کسی بلند رتبہ افسر یا معزز شخص کا معاون ذاتی''۔ ہم لوگوں نے کچھ سن کر اور کچھ دیکھ کر اسے ''بلند رتبہ افسر یا حاکم کا ذاتی نائب'' کے معنی میں ''ایڈی کانگ'' بنا دیا۔ ''امیر اللغات'' میں ''مصاحب، رفیق'' معنی لکھے ہیں اور ''نور'' نے یہی الفاظ دہرا دیے ہیں۔ یہ لفظ نسبۃً جدید ہے، شیکسپیئر اور پلیٹس میں درج نہیں۔

ایک انگریزی میں لفظ The حرف تعریف (definite article) کے طور پر، اور حرف A حرف تعمیم (indefinite article) کے طور پر رائج ہیں۔ اردو میں نہ حرف تعریف ہے نہ حرف تعمیم۔ ہمارے یہاں The کا کچھ بھی ترجمہ ممکن نہیں، لیکن A کا ترجمہ اکثر ''ایک'' کیا جاتا ہے۔ یہ ہر جگہ درست نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انگریزی کی دیکھا دیکھی ہم لوگ بھی ''ایک'' کا

لفظ کم وبیش حرف تنکیر کی طرح لکھنے لگے ہیں۔ یہ اردو کے مزاج کے خلاف ہے۔ مثلاً John is a good man کے تراجم ملاحظہ ہوں:

غلط: جان ایک اچھا آدمی ہے۔

صحیح: جان اچھا آدمی ہے۔

اسی طرح A great poet makes no mistakes کے تراجم دیکھیں:

غلط: ایک بڑا شاعر غلطیاں نہیں کرتا۔

صحیح: بڑا شاعر غلطیاں نہیں کرتا۔

علیٰ ہذا القیاس، مندرجہ ذیل جملے دیکھئے:

غلط: ایک انسان کا فرض ہے کہ دوسروں کا ہاتھ بٹائے۔

صحیح: انسان کا فرض ہے کہ دوسروں کا ہاتھ بٹائے۔

غلط: غالب ایک بڑے شاعر تھے، سب اسے مانتے ہیں۔

صحیح: غالب بڑے شاعر تھے۔۔۔

غلط: ایک اچھے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ۔۔۔

صحیح: اچھے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ۔۔۔

ایودھیا ان دنوں اجودھیا کو ''ایودھیا'' لکھنے کا غلط رجحان نمایاں ہو رہا ہے۔ اردو کا طریقہ ہے کہ سنسکرت اور بعض پراکرتوں کے الفاظ کو جب اردو میں داخل کرتے ہیں تو ''ی'' کی جگہ اکثر ''جیم''، اور ''واؤ'' کی جگہ اکثر ''ب'' رکھ دیتے ہیں:

ایودھیا، غلط/ اجودھیا، صحیح؛ یوون، غلط/ جوبن، صحیح؛ یمنا، غلط/ جمنا، صحیح؛ ویش، غلط/ بیس، صحیح؛ وغیرہ۔

ان لفظوں میں جیم کی جگہ یائے اور بے کی جگہ واؤ بولنا اردو کے رواج کے بالکل خلاف ہے۔ خصوصاً ''ایودھیا'' تو بہت ہی قبیح ہے۔ ملحوظ رہے کہ ''اجودھیا'' میں واؤ اعراب بالحرف کے لئے ہے، اس لفظ کا تلفظ بروزن فعولن ہے۔ ''ایودھیا'' لکھیں تو یہ تلفظ بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ دیکھئے ''حت سم''، ''یوون''۔

بابر اس چغتائی ترکی لفظ کا اصل تلفظ سوم مضموم کے ساتھ بروزن ''چابک'' ہے۔ اردو میں بادشاہ ظہیر الدین بابر کا نام سوم مفتوح کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بعض لوگوں کا نام بھی ''بابر'' رکھتے ہیں اور اس کا تلفظ سوم مفتوح کے ساتھ کرتے ہیں۔ اردو میں یہی تلفظ درست ہے۔

بابل ایک قدیم شہر کا نام، بکسر سوم بروزن ''قابل'' ہے۔ ''برہان'' میں ہے کہ اس لفظ کا تلفظ سوم مضموم سے بھی بتایا گیا ہے۔ ''بہار'' کا بھی خیال ہے کہ ممکن ہے سوم مضموم کے ساتھ بھی اس لفظ کو ادا کرتے ہوں۔ ''آنندراج'' کے قول کے مطابق سوم مضموم کے ساتھ تلفظ غیر فصیح ہے۔ اردو کے لغات میں بعض نے صرف سوم مکسور لکھا ہے، اور بعض نے صرف سوم مضموم درج کیا ہے۔ اردو میں آج کل زیادہ تر لوگ سوم مکسور کے ساتھ بروزن ''قابل'' بولتے ہیں۔ بعض لوگ سوم مضموم کے ساتھ بروزن ''چابک'' بھی بولتے ہیں، لیکن ابھی یہ مروج نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا شہر کے نام کی حیثیت سے اردو میں سوم مکسور کے ساتھ ہی ٹھیک ہے۔ بروزن ''چابک'' کوئی بولے تو اسے غلط نہ کہا جائے گا، لیکن ترجیح بہر حال سوم مکسور کے ساتھ بروزن ''قابل'' ہی کو ہے۔

شادی کے بعد لڑکی کو رخصت کرنے کے وقت، اور اس طرح کے اور موقعوں پر جو گیت گایا جاتا ہے اسے ''بابل'' بروزن ''چابک'' (یعنی سوم کے ضمہ کے ساتھ) بولتے ہیں۔ ایسے گیتوں میں بھی اکثر یہ لفظ آتا ہے: چھوڑ بابل کا گھر۔۔۔ یا مجھ سے بابل چھوٹا جائے، وغیرہ۔ فراق گورکھپوری، رباعی ؎

آنکھوں میں سرشک جگمگاتا مکھڑا وہ جشن رخصتی سہانا تڑکا
جھرمٹ میں سہیلیوں کے اٹھتے ہیں قدم وہ گھر کی عورتوں کا بابل گانا

دراصل ''بابل'' یہاں ''باپ'' کے معنی میں ہے، اور ممکن ہے یہ فارسی لفظ ''باب'' بمعنی ''باپ'' کی تصغیر ہو، یا لام یہاں لام شفقت ہو۔ ''آصفیہ'' اور شیکسپیئر اور حقی کے ''لغات تلفظ'' میں ''باپ'' کے معنی میں ''بابل'' درج ہے، لیکن حرف سوم کو مضموم کے بجائے مفتوح لکھا ہے۔ یہ تلفظ کہیں سنا نہیں گیا۔ ''نور'' میں یہ ''رخصتی کے گیت'' کے معنی میں بضم سوم درج ہے، لیکن ''باپ'' کے معنی میں درج نہیں۔ پلیٹس (Platts)، ڈنکن فاربس (Duncan Forbes) اور

فیلن (Fallon) بھی "باپ" کے معنی میں اس لفظ سے واقف نہیں۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں ۹۳ البتہ دونوں معنی درج ہیں۔ دیکھئے: "بابو"۔

بابو عام خیال ہے کہ یہ لفظ بنگالی، یا کسی اور پوربی زبان کا ہے، اور اسے زیادہ تر تحقیری معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کو محبت، احترام، اور شفقت کا اظہار کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ "بابا" یا "باپ" کی تصغیر ہو، اور اس میں واؤ کا حرف علامت تصغیر ہو، یا وہ واؤ ہو جسے "واؤ شفقت" کہا جاتا ہے۔ اردو فارسی میں تصغیر بنانے کے لئے واؤ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً "شیخ / شیخو"؛ "پسر / پسرو"؛ "شیر / شیرو"؛ "چھوٹا / چھوٹو"؛ "شیام / شیامو" وغیرہ۔ ترکی اور ایران میں بعض صوفیوں کے نام کے آگے "بابو" لگانے کا رواج تھا۔ یہاں یقیناً اسے "باب" پر واؤ شفقت کے اضافے کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ شیکسپیر کا خیال ہے کہ عربی "اب / ابا / ابو"؛ فارسی "باب / بابا / بابو"؛ اردو "باپ / باپو" سب متحد الاصل ہیں۔ میرا خیال ہے اردو "بابل / بابُل" بمعنی "باپ" بھی اسی خاندان کا لفظ ہے۔ اور اس میں لام تصغیر یا شفقت ہے۔ دیکھئے: "ابا"؛ "بابل"۔

بات "بات ہونا، بات کرنا" عورتوں کی زبان میں "ہم بستر ہونا، ہم بستری کرنا" کے معنی میں ہے:

- او مورکھ، بس دیکھ لے، بات کرلے، اور کسی بات کا ارادہ نہ کرنا۔۔۔ [سیٹھ جی کو] ابھی تک تو میں نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔۔۔ پانچ برس تال کر۔ پہلے ان سے بات ہولے پھر تجھ سے بھی سمجھا جائے گا ("طلسم فتنۂ نور افشاں"، جلد دوم، از احمد حسین قمر، ص ۲۱۵)۔

واہ زہرہ مصری تم نے خوب ہمارا پاس کیا۔ اگر میاں سے اور تھوڑے دن نہ بات کرتیں تو کیا نقصان ہوتا۔ ("ہومان نامہ"، از احمد حسین قمر، ص ۷۰۶)۔

دیکھئے: "بولنا، مرد سے"۔

بادشاہ دیکھئے: "بادشاہت"۔

بادشاہت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی لفظ "بادشاہ" پر عربی کی تائے مصدری لگا کر

''بادشاہت'' بنانا غلط ہے، لہٰذا یہ لفظ واجب الترک ہے۔ یہ رائے درست نہیں۔ ''بادشاہت'' اردو کا لفظ ہے، عربی فارسی میں نہیں ہے۔ ''نزاکت''، ''فلاکت'' کی طرح یہ لفظ بھی اہل اردو نے اختراع کیا ہے۔ یہ اب ''بادشاہی'' کے معنی میں ہمارے یہاں رائج ہو گیا ہے۔ عربی فارسی میں یہ غلط ہوگا، لیکن اردو میں درست ہے۔ واضح رہے کہ یہ لفظ سراسر اردو ہے، یعنی فارسی میں نہ ''بادشاہت'' ہے، نہ ''پادشاہت''۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ فارسی میں ''بادشاہ'' بھی نہیں ہے، صرف ''پادشاہ'' ہے۔ اہل اردو نے غالباً پہلوئے ذم کو مدنظر رکھ کر ''پاد'' کو ''باد'' کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ''بادشاہی'' کے ہوتے ہوئے ''بادشاہت'' کی ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ نیا لفظ ہوتا تو اس بنا پر میں اس کی مخالفت کرتا۔ لیکن اب یہ مدت سے رائج ہے، اسے نکالنے کی کوئی وجہ اب نہیں۔ شیکسپیئر، فیلن، ''آصفیہ''، ''نور'' سب نے اسے جگہ دی ہے۔

باری بمعنی ''دفعہ، مرتبہ، نوبت'' وغیرہ، فارسی میں نہیں ہے، وہاں صرف ''بار'' ہے۔ اردو میں ''بار'' اور ''باری'' دونوں ہیں۔ بعض موقعوں پر ایک کو دوسرے کی جگہ برت سکتے ہیں، بعض موقعوں پر نہیں۔ مثلاً:

نامناسب: آج وہ چوتھی باری آیا۔

مناسب: آج وہ چوتھی بار آیا۔

مناسب: میری باری نہیں آئی۔

مناسب: میری بار نہیں آئی۔

مناسب: میری بار تو کہہ دیا کہ دکان بند ہے۔

مناسب لیکن کم مستعمل: میری باری تو کہہ دیا کہ دکان بند ہے۔

مناسب: اس کو باری کا بخار آتا ہے۔

غلط: اس کو بار کا بخار آتا ہے۔

مناسب: انھوں نے پہلی بار میں سورن بنائے۔

مناسب: انھوں نے پہلی باری میں سورن بنائے۔

یہ سب ٹھیک، لیکن ''پاری'' اردو میں ٹھیک نہیں۔ ہندی والے اسے شوق سے بولیں، اردو میں

''پاری'' ہے ہی نہیں۔

باز یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے۔ اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

باعث سوم مکسور۔ پہلے ''بہ باعث'' بولتے تھے، کیونکہ ''باعث'' کے معنی ''وجہ'' قرار دیے جاتے تھے۔ مثلاً: ''آپ نہیں آئے کیا باعث تھا؟'' یہ معنی اب بھی ہیں، لیکن اب ایک اور معنی ''وجہ سے'' رائج ہیں، مثلاً: ''تختے میں سوراخ ہو جانے کے باعث کشتی ڈوب گئی۔'' یعنی سوراخ ہو جانے کی وجہ سے۔ پہلے زمانے میں یوں کہتے: ''تختے میں سوراخ ہو جانے کے بہ باعث کشتی ڈوب گئی''۔

باقر عربی میں سوم کے کسرہ کے ساتھ بروزن ''نادر'' ہے، لیکن اردو میں زیادہ تر سوم مفتوح کے ساتھ بروزن ''باہر'' بولا جاتا ہے اور وہی مرجح ہے۔ بعض لوگ پانچویں امام حضرت امام محمد باقر کے نام ''باقر'' کو، یا اگر ان کا اپنا نام ''باقر'' ہے تو اپنا نام، سوم کے کسرہ کے ساتھ بروزن ''نادر'' ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنا نام بفتح سوم بولتا ہے تو دوسروں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ خواہ مخواہ اس کا نام سوم مکسور کے ساتھ بولیں۔ امام عالی مقام کے اسم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ بعض لوگ بفتح سوم بولتے ہیں اور بعض لوگ بکسر سوم۔ جو لوگ مع کسر سوم بولتے ہیں، وہ عربی کا اتباع کرتے ہیں، اردو کے روزمرہ کا نہیں۔ علامہ عقیل الغروی کی رائے میں ''باقر'' بروزن ''ساغر'' غلط ہے اور ''باقر'' بروزن ''نادر'' ہی ہر موقعے کے لیے درست ہے۔ لیکن استعمال عام وہی ہے جو میں نے درج کیا ہے۔

دیکھیے، ''باغی'' ''بغاوت''۔

بالاخرچی فارسی میں اس کے معنی ہیں، ''وہ خرچ جو مقررہ تخمینے یا حساب سے زائد ہو۔'' صاحب ''بہار عجم'' کا کہنا ہے کہ ہندوستانی فارسی والوں نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ''خرچ بالائی'' کی ترکیب اختراع کی ہے۔ مزید بحث کے لیے دیکھیے ''خرچ بالا دستی''؛ ''خرچ بالائی''۔

بالائی آمدنی ایسی آمدنی جو وجہ مقرری یا تنخواہ کے اوپر ہو، اسے ''بالائی آمدنی'' کہتے ہیں۔

اس فقرے کو ہمیشہ برے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور عموماً اس سے رشوت کی آمدنی، یا ناجائز آمدنی مراد لیتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ ''خرچ بالائی'' کے یہ معنی نہیں ہیں، اگرچہ ''خرچ بالائی'' میں لفظ ''خرچ'' کے معنی ''زر، روپیہ پیسہ'' ہی ہیں۔ دیکھیے: ''خرچ بالائی''۔

بالائی خرچ ''بالائی آمدنی'' کا متضاد، یعنی وہ خرچ جو مقررہ تخمینے یا حساب کے اوپر ہو، ''بالائی خرچ'' کہا جاتا ہے۔ دیکھیے: ''خرچ بالائی''۔

باھمن لفظ ''برہمن'' کا یہ تلفظ پوربی اردو میں سننے میں آتا ہے۔ بھوج پوری میں یہی لفظ رائج ہے۔ تحریری اردو میں اسے صرف خاص ماحول، مثلاً مکالمہ، یا طنزیہ/مزاحیہ سیاق و سباق میں استعمال کرتے ہیں، الا یہ کہ کہاوت برتی جائے: ''جو میرے من میں وہی باھمن کی پوتھی میں''۔

باھمنی چھپکلی کی ایک ذات جو چھوٹے چمکیلے سانپ جیسی لگتی ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ببر بلی خاندان کے جانور Lion کے معنی میں بفتح اول و بسکون دوم اور بفتحتین، دونوں طرح درست ہے۔ میر ببر علی انیس اپنا نام بسکون دوم بولتے تھے۔ غالب کے ایک دوست کا نام ''ببر علی'' بفتحتین تھا، غالب ؎

مسیح کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے کہ جو اسد تپش نبض آرزو جانے

پنجابی میں بہ تشدید دوم ''ببّر'' ہے۔ اردو میں بھی ''ببّر شیر'' کبھی کبھی سنا جاتا ہے، لیکن تنہا لفظ کو ہمیشہ ''ببر'' بفتحتین بولتے ہیں۔

بتاسا دیکھیے: ''بتاشا''۔

بتاشا اول مفتوح، دیبی پرشاد سحر بدایونی نے ''بتاشہ'' کو درست اور ''بتاسہ'' کو غلط بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''بتاشہ/بتاشا'' ہی اب عام طور پر بولا جاتا ہے۔ میر نے ''بتاشا'' ہی لکھا ہے ؎

ہائے اس شربتی لب سے جدا کچھ بتاشا سا گھلا جاتا ہے جی

''آصفیہ'' میں ''بتاسا'' لکھا ہے اور کہا ہے کہ آج کل ''بتاشا'' عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''بتاسا'' بالکل شاذ بھی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ''بتاسا'' کو الف سے لکھنے اور ''بتاشہ'' کو چھوٹی ہ سے لکھنے کا رواج اب عام ہو رہا ہے۔

بجائے اس لفظ کو مع ہمزہ ''بجائے'' بھی لکھا جاتا ہے، اس میں کوئی عیب نہیں۔ لیکن اگر ہمزہ سے لکھنا ہے تو اس اصول کی پابندی ہر جگہ کرنی چاہئے، مثلاً ''برائے'' کو بھی مع ہمزہ لکھنا چاہئے۔ ''بجائے'' کو بعض لوگ مونث لکھتے ہیں۔ یہ آج کل مروج نہیں لیکن اہل پنجاب کے یہاں نظر آ جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری بھی ''کی بجائے'' لکھتے تھے۔ لہٰذا اسے غلط نہیں کہا جا سکتا، خلاف محاورۂ جمہور ضرور کہا جائے گا۔

بچولیا یہ بدصورت لفظ اہل ہندی نے ان لوگوں کے لئے اختیار کیا ہے جو کسی تجارتی سودے میں خریدار اور بیچنے والے کے درمیان غیر قانونی طور پر گماشتے کا کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اردو میں ''میانجی'' [میان + جی]، اور ان کے کام کو ''میانجی گری'' کہتے ہیں۔ میر نے ''میاں گیری'' استعمال کیا ہے، وہ بھی بہت خوب ہے ؎

پیام اس گل کو پہنچا پھر نہ آئی   نہ خوش آئی میاں گیری صبا کی

غالب نے بھی علاء الدین احمد خان علائی کے نام ایک خط میں ''میانجی گری'' لکھا ہے۔ اتنے خوبصورت اور بامعنی الفاظ کو ترک کرنا اور ''بچولیا'' جیسا فضول لفظ اختیار کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ یہ بات صحیح ہے کہ ''بچولیا'' بعض اردو لغات، مثلاً شیکسپیئر، اور ''آصفیہ'' میں ملتا ہے، لیکن جدید اردو کا مزاج ایسے لفظ کو قبول نہیں کرتا۔

بچھو یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

بچھی پورب کے بعض علاقوں میں ''بچھو'' کی جگہ ''بچھی'' (اور کہیں کہیں ''بیچھی'') بولتے ہیں۔ اسے مونث بولتے ہیں، لیکن اس سے نر بھی مراد لیتے ہیں، یعنی نر ''بچھی/بیچھی'' کے لئے الگ سے کوئی لفظ نہیں، جس طرح مادہ ''بچھو'' کے کوئی لفظ نہیں۔

بیچھی دیکھئے، ''بچھی''۔

بحال پورب اور دکن میں یہ لفظ ''تقرر'' کے معنی میں بھی رائج ہے۔ مثلاً ''حکومت نے نئے اساتذہ کو بحال کرنے سے انکار کیا''؛ یا ''میں وہاں اس زمانے میں بحال ہوا تھا جب ادھر بجلی نہیں آئی تھی۔'' ان معنی میں یہ لفظ پرانی اردو میں شمال میں بھی رائج تھا، مثلاً ''اردو لغت، تاریخی اصول

پر" میں ۱۸۴۸ کی سند "تاریخ ممالک چین" نامی کتاب سے درج ہے:

جہاں تک سرکاری عہدے مملکت ختا میں ہیں، سب پر فاضلوں کے سوا کوئی بحال نہیں ہوتا۔

اب یہ معنی دکن اور پورب کے مقامی معنی کہلائیں گے۔ "طبیعت کا بحال ہونا/ آنا" الگ محاورہ ہے، بمعنی طبیعت کا کسی گھبراہٹ یا مرض کے بعد درستی پر آنا۔

بخرید "بقرعید" کا یہ تلفظ مشرقی یو۔ پی۔ اور بہار میں سنائی دیتا ہے۔ یہ واضح نہ ہوا کہ اس میں "خ" کی آواز "ق" کی متبادل ہے، جیسا کہ دکن میں ہوتا ہے، یا یہ بھی اپنی جگہ پر آزاد ایک رائج تلفظ ہے۔ موخر الذکر صورت میں "بکرید" کو "بخرید" کا عوامی تلفظ بھی کہہ سکتے تھے۔ "بخرید" کسی لغت میں نہیں ملا۔ اس وقت اسے شاذ اور غریب کہنا چاہئے۔ دیکھئے "بقرعید"؛ "بکرید"۔

بد بدانا اول سوم مضموم؛ "زیر لب یا منھ ہی منھ میں کچھ بولنا" کے معنی میں یہ لفظ اردو کے اکثر پرانے لغات میں ملتا ہے، لیکن جدید اردو میں اس کا رواج بہت کم تھا۔ اب شاید ہندی کے زیر اثر یہ پھر رواج پانے لگا ہے، لیکن ابھی یہ پوربی اردو تک محدود ہے اور پورب کے علاقے کے باہر اس کے مروج ہو جانے کا امکان زیادہ نہیں لگتا۔ فی الحال اسے پوربی اردو کا علاقائی لفظ سمجھنا چاہئے۔

بدلاؤ "تبدیلی" یا "تغیر" یا "تغیر حال" کے معنی میں یہ لفظ ہندی والوں کا گھڑا ہوا ہے۔ اردو میں اس بھونڈے اور غیر ضروری لفظ کا صرف بیجا ہے۔

برادر "بھائی" کے معنی میں لکھنؤ میں بفتح اول بولتے ہیں۔ اسے لکھنؤ کا مقامی تلفظ کہنا چاہئے۔ لکھنؤ کے باہر ہر جگہ اول مکسور بولا جاتا ہے۔

برادر نسبتی بیوی کے بھائی کو "برادر نسبتی" کہتے ہیں۔ فارسی میں "برادر نسبت" ہے، لیکن اردو میں "برادر نسبتی" ہی مستعمل ہے۔

برام اودھ اور پورب کے دیہاتوں میں "بیمار" کو "بمار" مع اول مکسور مجہول بولتے ہیں۔ اس کی تقلیب "برام" مع اول مکسور مجہول بھوج پوری کے علاقے میں سننے میں آتی ہے۔ دیکھئے: "تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں"۔

براہ خدا یہ فقرہ اب پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر ہے اور بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے: ''براہ کرم''۔

براہ کرم ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' دونوں صحیح ہیں۔ اگرچہ لغات میں ''براہ کرم'' درج نہیں لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر مدت سے ہے۔ اسی طرح، حسب ذیل بھی صحیح ہیں، اگرچہ لغات میں نہیں ملتے:

براہ خدا: براہ مروت: براہ مہربانی: براہ نوازش۔

یعنی مندرجہ بالا فقروں میں ''برائے'' لکھیں یا ''براہ'' لکھیں، دونوں صحیح ہیں۔ لیکن ملحوظ رہے کہ حسب ذیل فقروں میں صرف ''برائے'' ہے، ان میں ''برائے'' کو ''براہ'' سے نہیں بدل سکتے:

برائے اصلاح: برائے بیت: برائے تسلی: برائے چندے: برائے نام

دیکھئے: ''برائے''۔

براہ مروت یہ فقرہ اب پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر ہے اور بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے: ''براہ کرم''۔

براہ مہربانی یہ فقرہ اب پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر ہے اور بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے: ''براہ کرم''۔

براہ نوازش یہ فقرہ اب پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر ہے اور بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے: ''براہ کرم''۔

برائے ''برائے'' (اول مفتوح) اردو فارسی کا مستقل لفظ ہے، لیکن یہ تنہا کبھی نہیں آتا۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں، ''واسطے، لئے''۔ اردو میں بھی یہی معنی ہیں، اور اردو میں بھی یہ تنہا کبھی نہیں آتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ فارسی میں اس کا املا مع ہمزہ تھا یا بدون ہمزہ، کیونکہ پرانے لغات میں یہ لفظ درج نہیں۔ اور اگر ہوتا بھی تو املا کی تحقیق ہو جانا ضروری نہ تھا، کیونکہ ممکن ہے کاتب نے غلطی کر دی ہو۔ بہر حال، ''فرہنگ آنند راج'' مطبوعہ ایران میں اس کا املا ''برای'' یعنی بدون ہمزہ لکھا ہوا ہے۔ حیم کی فارسی انگریزی ڈکشنری میں بھی یہی املا ہے۔ اردو میں فیلیپیز، ''آصفیہ''، ''نور''، اور ترقی اردو بورڈ کراچی کی ''اردو لغت''، ان سب میں مع ہمزہ (یعنی

''برائے'') درج ہے۔ پلیٹس میں بدون ہمزہ (یعنی ''برای'') لکھا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں 'برائے' بدون ہمزہ لکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، لیکن مع ہمزہ (''برائے'') بھی بالکل درست ہے۔ دیکھیے: ''براہ کرم''۔

برائے اصلاح اس فقرے کو ''براہ اصلاح'' سے نہیں بدل سکتے، جیسا کہ ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' کا معاملہ ہے، کہ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن یہاں ''برائے'' ہی درست ہے، ''براہ'' نہیں۔

برائے بیت اس فقرے کو ''براہ بیت'' سے نہیں بدل سکتے، جیسا کہ ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' کا معاملہ ہے، کہ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن یہاں ''برائے'' ہی درست ہے، ''براہ'' نہیں۔

برائے تسلی اس فقرے کو ''براہ تسلی'' سے نہیں بدل سکتے، جیسا کہ ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' کا معاملہ ہے، کہ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن یہاں ''برائے'' ہی درست ہے، ''براہ'' نہیں۔

برائے چندے اس فقرے کو ''براہ چندے'' سے نہیں بدل سکتے، جیسا کہ ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' کا معاملہ ہے، کہ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن یہاں ''برائے'' ہی درست ہے، ''براہ'' نہیں۔

برائے کرم دیکھیے: ''براہ کرم''۔

برائے نام اس فقرے کو ''براہ نام'' سے نہیں بدل سکتے، جیسا کہ ''براہ کرم'' اور ''برائے کرم'' کا معاملہ ہے، کہ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن یہاں ''برائے'' ہی درست ہے، ''براہ'' نہیں۔

برپانا ''برپا کرنا'' کے بجائے ''برپانا'' ہندی والوں کی بدعت ہے جسے اردو اخبار بھی اختیار کر رہے ہیں۔ یہ بدصورت اختراع ترک ہونی چاہیے۔

برس/ برسوں؛ دن/ دنوں؛ روز/ روزوں؛ سال/ سالوں

''برس'' اور ''دن'' کی جمع کم سے کم استعمال ہو تو بہتر ہے:

(۱) نامناسب: میں یہاں چار برسوں سے آتا جاتا ہوں۔

(۲) مناسب: میں یہاں چار برس سے آتا جاتا ہوں۔

(۳) نامناسب: میں نے انھیں کئی دنوں بعد دیکھا۔

(۴) مناسب: میں نے انھیں کئی دن بعد دیکھا۔

اور اگر "برس"، "دن"، "روز"، "سال" کے بعد حرف جار ہو تو جمع کا استعمال بالکل غلط اور غیر فصیح ہے:

(۱) غلط اور غیر فصیح: بیس برسوں کے بعد ہم ملے۔
صحیح اور فصیح: بیس برس بعد ہم ملے۔

(۲) غلط اور غیر فصیح: وہاں تو چار دنوں ہی میں صفایا ہو گیا۔
صحیح اور فصیح: وہاں تو چار دن ہی میں صفایا ہو گیا۔

"روز" کی جمع "روزوں" اب بہت کم بولی جاتی ہے، چاہے جس صورت حال میں ہو۔
غلط اور غیر فصیح: آج یہاں کئی روزوں سے پانی نہیں برسا۔
صحیح اور فصیح: آج یہاں کئی روز سے۔۔۔
غلط اور غیر فصیح: ان روزوں مجھ پر بڑی مشکل ہے۔
صحیح اور فصیح: ان دنوں۔۔۔

"سال" کی جمع "سالوں" میں پہلوے ذم واضح ہے، اس لئے اسے بالکل نہ برتا جائے۔

برکت عربی کے بہت سے چار حرفی لفظ ہیں جو اردو میں تاے مستتار یا ہاے ہوز پر ختم ہوتے ہیں۔ عربی میں ایسے تمام لفظوں کے حرف دوم پر حرکت ہے۔ مثلاً: بَرَکت؛ ثَمَرہ؛ جَلَبہ؛ حَرَکت؛ دَرَجہ؛ صَدَقہ؛ طَبَقہ؛ وغیرہ۔ ان سب لفظوں میں حرف دوم مفتوح ہے۔ اسی طرح کا ایک لفظ "کلِمہ" بھی ہے، لیکن وہاں حرف دوم مکسور ہے۔ اردو میں یہ سب الفاظ بسکون دوم بولے جاتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔ اگر کوئی از روے احتیاط حرف دوم کو متحرک لکھتا ہے تو اسے غلط نہ کہیں گے، لیکن حرف دوم کو متحرک لکھنے/ بولنے پر مصر ہونا دانش مندی نہیں۔

برہمن اس لفظ کو بروزن فعولن بھی بولتے ہیں اور بروزن فاعلن بھی۔

ملتا ہے دیر میں کف افسوس اب تلک   جس دن سے برہمن کو تم آئے دکھا کے ہاتھ
(مظفر علی اسیر)

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے   تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
(اقبال)

اقبال ؎

تو سید ہاشمی کی اولاد میری کف خاک برہمن زاد

برہمنہ لفظ ''برہمن'' کا یہ روپ فارسی میں دیکھا گیا۔ اردو میں کہیں نظر نہیں آیا، لیکن استعمال ہو تو مضائقہ نہیں۔

برہنہ اس لفظ کو بفتح دوم اور بسکون سوم بروزن فعولن بھی استعمال کرتے ہیں اور بسکون دوم و بفتح سوم بروزن فاعلن بھی استعمال کرتے ہیں۔ غالب ؎

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

علی اوسط رشک ؎

عشق سے جس برہنہ پا کو ملی تکلیف سیر سات اقلیموں سے صحرائے مغیلاں بڑھ گیا

بڑائی دیکھیے ''بڑپن''۔

بڑپن سوم مشدد، ہندی والوں نے ''عظمت'' کو شاید ثقیل سمجھ کر انھیں معنی میں ''بڑپن'' ایجاد کیا، یا یوں کہیں کہ بھوجپوری سے لے لیا۔ بعض لوگ ''لڑکپن'' کے نمونے پر قیاس کر کے اسے ''بڑکپن'' بھی بولتے ہیں۔ اردو میں اسے ''عظمت'' کے معنی میں، لیکن اس سے ذرا کچھ کم شدت اور زور ظاہر کرنے کے لئے بولنے لگے ہیں۔ لیکن یہ سراسر بدعت قبیحہ ہے، کیونکہ ہم لوگ ایسے موقعے پر ''بڑائی'' بولتے ہیں۔ ہندی میں ''بڑپن/بڑکپن'' انھیں معنی میں بولا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں ''بڑائی'' کو ''عظمت'' کے معنی میں بھی بولتے ہیں اور اس سے ہلکے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ ایسی صورتمیں ''بڑپن/بڑکپن'' جیسا بھونڈا لفظ غیر ضروری ہے:

درست اور فصیح: پتہ پتہ اللہ کی بڑائی/عظمت بیان کرتا ہے۔

درست اور فصیح: اکبر کی بڑائی/عظمت اس بات میں تھی کہ اس نے ہمیں قومی یک جہتی کا سبق سکھایا۔

درست اور فصیح: آپ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، یہ آپ کی بڑائی ہے۔

درست اور فصیح: ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کی خوبیوں کا ذکر کیا۔

آخری دو جملوں میں ''بڑائی'' کی جگہ ''عظمت'' نہیں آسکتا اور ''بڑپن/بڑکپن'' یہاں بھونڈا اور غلط ہے۔

بڑکپن دیکھیے، ''بڑپن''۔

بڑی بمعنی دال کی بنی ہوئی ایک شے خوردنی، دیکھیے، ''بچھر''۔

بزرگ بعض لوگ اس لفظ کا تلفظ اول مفتوح کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں۔ اول مضموم ہی درست ہے۔

بسکٹ اردو میں یہ لفظ اول کے کسرہ اور سوم کے ضمہ کے ساتھ بولتے ہیں (biskut) لیکن اس لفظ کے جدید انگریزی تلفظ میں سوم مکسور ہے۔ اٹھارویں صدی تک انگریزی میں اس کا تلفظ bisket بروزن ''بیکٹ'' تھا، اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں میں اب بھی ہے۔ یعنی وہاں کے انگریزی جاننے والے اسے عموماً bisket بولتے ہیں۔ انگلستان کی انگریزی میں اس کا تلفظ biskit کیوں ہوا، اس باب میں قیاس آرائی ہی ممکن ہے۔ فرانسیسی میں اس لفظ کو ''بسک + وی'' (biskwi) بولتے ہیں۔ شاید وہاں کا کچھ اثر لے کر انگریزوں نے biskit کہنا شروع کر دیا ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ محض کمزور سا قیاس ہے۔ اس سے بڑا معما یہ ہے کہ اردو میں یہ biskut کیسے بن گیا؟ مصحفی ؎

ناگن تو ترا یوں ہی ستم جائے ہے کٹ کٹ کس واسطے پھر تو اسے روزائے ہے بگٹ
ہے یہ فلک سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی رکھتا ہے مہ و خور سے جو ساتھ اپنے دو بسکٹ

اس وقت تو یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہم لوگوں نے یہ لفظ انگریزوں سے سن کر نہیں، بلکہ کسی فرانسیسی کتاب میں لکھا دیکھ کر حاصل کیا ہوگا۔ یعنی پہلے ہم لوگ ''بسکوٹ'' (biskwit) بولتے رہے ہوں گے، بعد میں کثرت استعمال سے ''بسکٹ'' (biskut) ہو گیا۔ فرانسیسی سے واقفیت زیادہ نہ رکھنے کی وجہ سے یہ نہ معلوم رہا ہوگا کہ فرانسیسی ''بسک وی'' میں آخری حرف نہیں بولا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم لوگوں نے اس لفظ میں T کا حرف فرانسیسی زبان سے لیا، اور UI کا تلفظ (یعنی کسرۂ خالص = I) انگریزی سے حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بعید از قیاس بات کیا ہوگی۔ لہٰذا موجودہ اطلاعات کی روشنی میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ ہم لوگوں نے یہ تلفظ (اول مکسور، سوم مضموم) کہاں سے حاصل کیا۔

بسم اللہ کی برکت یہ فقرہ دلچسپ ہے، کہ اس میں ''برکت'' کو ہمیشہ بفتح ثانی اور کاف

عربی کو ہمیشہ مشدد بولتے ہیں۔ یعنی اس فقرے میں "برکت" کا تلفظ بر کَت ہے بروزن فعولن۔ اور کوئی تلفظ کیا جائے تو وہ غلط ہوگا۔

بشارت "مژدہ" کے معنی میں یہ لفظ عربی میں بکسر اول یا بضم اول ہے۔ اردو میں بفتح اول بر وزن "سخاوت" رائج ہو گیا ہے اور اردو کے لئے وہی صحیح ہے۔

بط اول مفتوح، یہ فارسی لفظ "بت" کا معرب ہے، عربی میں دوم مشدد ہے، فارسی اردو میں ایسی کوئی قید نہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے: "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

بطخ اول دوم مفتوح، دوم کبھی کبھی مشدد بھی سنائی دیتا ہے۔ یہ لفظ بہت دلچسپ ہے۔ فارسی "بت" کے عربی "بط" بنا، پھر فارسی والوں نے اس پر اپنا کاف تصغیر لگا کر "بطک" بنایا، لیکن حرف دوم پر تشدید نہیں لگائی۔ اردو والوں نے اسے یوں ہی قبول کیا اور تشدید بھی لگالی۔ پھر کسی کو خیال آیا کہ "بطک" تو گنوارو معلوم ہوتا ہے، دراصل "بطخ" ہوگا (ایسی مثالیں اور بھی ہیں)۔ اس طرح موجودہ لفظ حاصل ہوا۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے: "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

بغاوت بمعنی "باغی ہو جانے کا عمل"، یہ لفظ عربی سے بنایا گیا ہے لیکن عربی میں ہے نہیں۔ اردو میں بہر حال یہ فصیح و صحیح ہے۔ باغی کے معنی میں پہلے "بغی" بولتے تھے لیکن اب یہ مروج نہیں۔ "باغی" اور "بغی" کا فارسی لفظ "باغ" سے کوئی تعلق نہیں۔

بغی دیکھئے: "بغاوت"۔

بقراعید "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں "بقرعید/ بقراعید" درج ہے، گویا دونوں برابر کی درستی کے حامل ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "بقراعید" بروزن مفعولات کم پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں رائج ہے، اور وہ بھی بہت کم۔ یہ تلفظ قابل ترک ہے۔ دیکھئے: "بقرید"؛ "بقرعید"؛ "بقرید"؛ "بکرید"۔

بقرعید یہ لفظ کبھی کبھی بسکون دوم (بق رعید) بروزن فاعلات بھی بولا جاتا ہے۔ "آصفیہ" اور فیلن میں یہی تلفظ درج ہے۔ آج کل یہ تلفظ بہت کم سننے میں آتا ہے اور قابل ترک ہے۔ اس

لفظ کا کتابی تلفظ اول و دوم کے فتحہ کے ساتھ ''بقر عید'' بروزن مفاعیل ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں یہ شعر درج ہے؎

جو قرباں بقر عید کے دن کریں سواری کریں اوس او پر چڑھ چلیں

اس شعر کی تاریخ ۱۷۶۹ درج ہے۔ مصرع ثانی غلط چھپا ہے، ممکن ہے ''سواری کریں اوس او پر چڑھیں'' ہو، بہر حال ''بقر عید'' بروزن مفاعیل کی سند اس شعر سے مل جاتی ہے۔ یہ تلفظ آج کل تقریباً معدوم ہے۔ عام بول چال میں یہ لفظ ''بقرید'' بروزن مفعول ہر طرف مقبول ہے، اور اسی طرح شعر میں لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ دیکھئے، ''بکرید''؛ ''بقر عید''؛ ''بقرید''؛ ''بکرید''۔

بقرید ''بقر عید'' کا یہ تلفظ بروزن مفعول عام بول چال میں بہت مدت سے ہے۔ چنانچہ نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہے، (نظم ''عید الفطر'')؎

ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

آج کل ہر جگہ یہ تلفظ رائج ہے اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ شعر میں بھی یوں ہی بندھے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ دیکھئے، ''بکرید''؛ ''بقر عید''؛ ''بقرید''؛ ''بکرید''۔

بکرا عید لفظ ''بقر عید'' کے تحت فیلن نے ''بکرا عید'' بھی Popular تلفظ درج کیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ''بقرا عید'' کے قاف کو کاف میں بدل کر بنایا گیا ہو، یا ''بکر قصاب'' کی طرح ''بکرید'' بنا ہو، پھر لوگوں نے ''بکرا'' کی مناسبت سے ''بکرا عید'' کہنا شروع کر دیا ہو۔ اب یہ بہت کم سنائی دیتا ہے۔ دیکھئے، ''بکرید''؛ ''بقر عید''؛ ''بقرید''؛ ''بکرید''۔

بکرید غالب نے مکتوب بنام نبی بخش حقیر، مورخہ ہفتم نومبر ۱۸۵۳ میں لکھا ہے:

بکرید کو کچھ کہا ہی نہیں، ایک رباعی پڑھ دی تھی۔

بظاہر یہ تلفظ اس لئے رائج ہوا کہ اس تیوہار میں بکرے بہت قربان کئے جاتے ہیں۔ اور جس طرح بکروں کے قصائی کو ''بکر قصاب'' کہتے ہیں، اسی طرح اس تیوہار کو ''بکرید'' کہنے لگے ہوں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اسے ''عوامی'' تلفظ کہا ہے، اور کوئی سند نہیں دی ہے۔ غالب کی سند پر اسے ''عوامی'' نہیں کہہ سکتے۔ یہ ضرور ہے کہ مدت دراز سے یہ تلفظ سننے میں نہیں آیا۔ اس کے درست ہونے میں کلام نہیں۔ فیلن نے اسے Popular یعنی مقبول العوام تلفظ لکھا ہے۔

شان الحق حقی نے ''بکرید'' ایک مستقل لغت کے طور پر درج کیا ہے۔ دیکھیے، ''بقرعید''؛ ''بقرید''؛ ''بکرید''۔

بلاے الف پر ختم ہونے والے کئی لفظ فارسی میں ہیں جن میں حسن یا مزید زور کی خاطر یاے تحتانی کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس اضافے سے لفظ کے بنیادی مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عموماً اردو میں ایسا نہیں ہے۔ لیکن بعض ایسے استعمالات فارسی سے اردو میں بھی آ گئے ہیں اور بعض الفاظ میں اردو والوں نے ایسا اضافہ خود ہی کر دیا ہے۔ چنانچہ ''بلا''، جو عربی ہے، پورب میں عورتوں کی زبان پر تحتانی کے اضافے کے ساتھ ''بلاے'' رائج ہے۔ میرے بچپن میں جب کوئی لڑکا کسی ساتھی سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتا تو اکثر یہ مصرعے بھی پڑھتا ۔

کہو کہانی سردی جائے جاڑا پالا بری بلاے

دیکھیے، ''الاے بلاے''؛ ''جاے''؛ ''دریاے''؛ ''یاے زائدہ''۔

بلبل مولانا محمد حسین آزاد نے ''بلبل'' کی تانیث کے ثبوت میں ایک دلچسپ مزاحیہ لیکن فحش فقرہ لکھا ہے کہ اس میں تو ''ڈبل تانیث ہے''۔ اس کے باوجود، واقعہ یہ ہے کہ ''بلبل'' کو مذکر بھی بولتے ہیں اور مونث بھی۔ میر انیس کا مشہور مصرع ہے ع

بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں

اور غالب کا بھی اتنا ہی مشہور مصرع ہے ع

بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

دیکھیے، ''عندلیب''۔

بل بے استعجاب یا تحسین کا اظہار کرنے کے لیے یہ بڑا عمدہ فقرہ تھا۔ افسوس کہ اب بہت کم سننے میں آتا ہے۔ اسے رائج کرنا چاہیے۔ ذوق ۔

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے

اف ری بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

بیخود دہلوی:

بل بے چتون تری معاذ اللہ اف رے ترچھی نگاہ کیا کہنا

فراق گورکھ پوری:

پڑتی ہے آسمان محبت پہ چھوٹ سی تل بے جبین ناز تری جگمگاہٹیں

بلوائی دیکھیے ''بلوہ''۔

بلوہ عربی میں الف مقصورہ سے ''بلویٰ'' ہے، اردو میں ہائے ہوز سے ہی صحیح ہے۔ لیکن اسم فاعل ''بلوائی'' ہی بنے گا۔

بنانا ''کھانا پکانا'' کی جگہ ''کھانا بنانا'' ہندی کا روزمرہ ہے لیکن افسوس کہ اردو میں بھی بعض لوگ اسے برتنے لگے ہیں۔ کھانا پکانے، یا کھانے کی کوئی اور چیز پکانے کے لئے اردو میں اس محاورے کی کوئی ضرورت نہیں، خاص کر اس وجہ سے کہ ''بنانا'' کا مصدر کھانے کی چیزوں کے لئے ہمارے یہاں اچار، چائے، چٹنی، حلوہ، قہوہ [کافی] اور مربہ کے لئے مستعمل ہے۔ زبان کی خوبی یہ ہے اس میں مختلف چیزوں اور کاموں کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بیش از بیش ہو۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم بعض چیزوں کے لئے ''بنانا'' بہتر سمجھتے ہیں اور بعض کے لئے ''پکانا''۔ یعنی ہم نے ''پکانا'' اور ''بنانا'' میں تفریق کی ہے۔ اگر کھانے کی سب چیزوں کے ساتھ ''بنانا'' بولا جائے تو یہ تفریق غائب ہو جائے گی اور زبان ایک قوت سے محروم رہ جائے گی۔ بیدار بخت بتاتے ہیں کہ میں نے ٹورانٹو سے دلی اپنی ایک بزرگ کو لکھا کہ مجھے آلو گوشت بنانے کی ترکیب لکھ بھیجئے۔ انھوں نے جواب میں لکھا: ''بیٹا، گوشت تو قصائی بناتا ہے۔ تم شاید پکانے کی ترکیب جاننا چاہتے ہو۔'' واضح رہے کہ انگریزی کھانوں، مثلاً آملیٹ، اسٹیک (Steak)، پڈنگ، پیتسا (Pizza)، سوپ، کیک، وغیرہ کے ساتھ ''بنانا'' بولتے ہیں۔ اور ''آچار/اچار'' کے ساتھ ''بنانا'' اور ''ڈالنا'' دونوں مستعمل ہیں۔

بنکاک تھائی لینڈ کا دارالخلافہ۔ اسے انگریزی میں Bangkok (بینگ کاک) کہتے ہیں، لیکن اردو میں اول مفتوح اور کاف عربی کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے۔

بوال میں نے یہ لفظ سب سے پہلی بار ۱۹۴۵/۱۹۴۶ میں اعظم گڈھ میں اپنے ایک اسکولی ساتھی کی زبان سے سنا تھا، بمعنی ''پریشانی، جھنجھٹ''۔ بلکہ اس نے ''بوال کٹنا'' بمعنی ''پریشانی کم ہونا، جھنجھٹ دور ہونا'' کے معنی میں بولا تھا۔ میں دیر تک محو حیرت رہا تھا کہ یہ عجب لفظ ہے، ممکن

ہے" وبال" کا گنوارو تلفظ ہو، اگرچہ معنی کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ اب کوئی ساٹھ برس بعد یہی لفظ ہندی میں تقریباً انھیں معنی میں رائج دیکھتا ہوں، یعنی "جھنجھٹ، جھگڑا، تنازعہ، بحث مباحثہ"۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا جب اردو کا ایک ادبی رسالہ اس قسم کا جملہ بے تکلف چھاپے گا:

[فلاں معاملے] پر مچے بوال کے تناظر میں کافی کارآمد اور پر مغز مضمون ہے۔

ڈنکن فوربس نے اپنے لغت میں دیہاتی اور بازارو الفاظ کو درج کرنے کا اہتمام کیا ہے لیکن اس کا لغت بھی "بوال" سے خالی ہے۔ یہ لفظ اردو ہے ہی نہیں، پھر اسے کوئی کیوں لکھے اور کوئی مدیر اسے اپنے صفحے پر کیوں جگہ دے؟

بوتیمار بمعنی "بگلا"۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

بوزنہ واؤ معروف، سوم ساکن یا مکسور، بمعنی "بندر"۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ انھیں معنی میں "بوزینہ" (واؤ معروف، یائے معروف) بھی ہے۔ میر: "کپی کا بچہ" سے

طنز ہے یہ بات اگرچہ ہے کپی جو کرے انسان تو بوزینہ بھی

دیکھیے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

بوزینہ بمعنی "بندر"۔ دیکھیے "بوزنہ"۔

بوگی انگریزی لفظ Bogie بمعنی "ریل کا بڑا ڈبہ" جب زبان میں آیا تو اسے اصل شکل ہی میں قبول کر لیا گیا۔ (ملحوظ رہے کہ ان معنی میں یہ لفظ معیاری انگریزی میں نہیں ہے، ہم لوگوں نے بنا لیا ہے۔)

بولنا، مرد سے عورتوں کی زبان میں یہ محاورہ "ہم بستر ہونا" کے معنی میں ہے:

میں نے اس امر کو ترک کر دیا اور پارسا ہو گئی۔ صرف دیکھنے بھالنے کے لیے ایک دو مرد سے بول لیتی ہوں۔ ("آفتاب شجاعت"، جلد دوم، از شیخ تصدق حسین، ص ۲۵۴)۔

دیکھیے، "بات"۔

بوم واؤ معروف، بمعنی ''الو'' یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ فارسی میں اس لفظ کے معنی ''زمین'' بھی ہیں۔ ان معنی میں اردو میں تنہا مستعمل نہیں، شاعری میں شاید کبھی برتا گیا ہو۔ ادبی نثر میں بھی فقروں یا مرکب شکل میں نظر آتا ہے، مثلاً ''بوم و بر'' [خطۂ زمین]؛ ''زاد بوم'' [جائے پیدائش]؛ ''مرز بوم'' [وطن، ملک]۔ شیکسپیئر، ڈنکن فوربس، اور پلیٹس نے زمین کے معنی میں ''بوم'' کو مذکر لکھا ہے۔ ''نور'' میں کچھ درج نہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں مونث لکھا ہے، اور آج کل یہی مرجح ہے۔ اس لفظ کا سنسکرت تت سم ''بھوم'' ہے۔ اس سے اردو میں دو تد بھو بنے ہیں، ''بھوئیں'' بروزن فع، اور ''بھوم'' بروزن فعل۔ بھوج پوری میں ''بھوئیاں'' بروزن فع لن بھی ہے، اردو میں نہیں سنا گیا۔ ''بھوئیں'' بھی ولی کے بعد شاید کسی نے نہ باندھا ہو ؎

خاکساراں کے انجھوتی کوں ہیں منظور نظر جوں کہ مقبول ہیں خورشید کو بھوئیں سوں شبنم

بہاراں اول مفتوح، بمعنی ''بہار''۔ یہاں الف و نون زائد ہے اور کوئی معنی نہیں دیتا۔ دیکھئے، ''آباداں''۔

بھالو یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

بہت زیادہ اس فقرے میں حد سے تجاوز کرنے، یا ناپسندیدہ ہونے کا مفہوم غالب ہے۔ اسے توصیف کے لئے نہ استعمال کرنا چاہئے:

غلط: فارسی میں ان کی لیاقت بہت زیادہ تھی۔
صحیح: فارسی میں ان کی لیاقت بہت تھی۔

غلط: اداریہ پڑھ کر آپ کے خلوص کا بہت زیادہ احساس ہوا۔
صحیح: اداریہ پڑھ کر آپ کے خلوص کا شدت سے احساس ہوا۔

غلط: آپ کی نظر کا عمق بہت زیادہ بڑھ چکا ہے۔
صحیح: آپ کی نظر میں بہت عمق آگیا ہے۔

صحیح: ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے، وہ جلسے میں شریک نہ ہوسکیں گے۔

بہرحال اول دوم مفتوح، بے اضافت۔ بعض لوگ بسکون دوم اور مع اضافت بولتے ہیں جو غلط ہے۔

بھلا رے اس فقرے میں لام پر تشدید ہے۔ استعجاب اور تحسین ظاہر کرنے کے لیے یہ بھی عمدہ فقرہ تھا، لیکن اب اس قدر گم نام ہے کہ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں بھی درج نہیں۔ (ہاں ''بھلا رے'' البتہ درج ہے۔) میر سوز ؎

بھلا رے عشق تیری شوکت وشان   بھائی میرے تو اڑ گئے اوسان

انشا نے بھی خوب باندھا ہے ؎

جمال و عظمت و اوار و خالق ملکوت   خیال کر کے یہ کہتا ہوں بھلا رے جبروت

ایسے عمدہ فقرے کو ادبی زبان میں پھر رائج ہونا چاہیے۔ دہلی کے روزمرہ میں اب بھی رائج ہے۔

بھنگا اول مضموم، ایک بہت چھوٹا پردار کیڑا۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

بھیڑیا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ پہلے زمانے میں ''بھیڑیا'' کے لیے ''لانڈگا'' (مذکر) اور ''لانڈگی'' (مونث) بھی رائج تھے۔ بعد میں صرف ''لانڈگی'' مذکر مونث دونوں کے لیے بولا جانے لگا۔ اب یہ الفاظ بالکل مستعمل نہیں۔

بے پروا ''بے پروا'' اور ''لا پروا'' دونوں درست ہیں۔ دیکھیے: ''لا پروا''؛ ''لا پرواہی''۔

بے پناہ ظاہر ہے کہ جس چیز سے پناہ نہ مل سکے اسے ''بے پناہ'' کہیں گے۔ استعاراتی طور پر یہ فقرہ بعض صفات کی کثرت اور شدت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ صفاتی الفاظ ایسے ہوں جن سے پناہ مانگنے، یا جس میں وہ صفت ہو اس شے کے ساتھ پناہ کا تصور بھی ممکن ہو۔ مثلاً:

بے پناہ تیزی؛ بے پناہ خوبصورتی/حسن؛ بے پناہ قوت، وغیرہ۔

مندرجہ بالا تمام استعمالات صحیح ہیں۔ ادھر چند دنوں سے یہ فقرہ اسما کی صفت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے اور اس کے معنی ''بہت، بہت زیادہ، حد سے بڑھ کر'' اور کبھی کبھی ''بہت ہی خوب'' مراد لیے جانے لگے ہیں اور امکان ہے کہ اس کے اصل معنی کو پس پشت ڈال

دیا جائے۔ مندرجۂ ذیل پر غور کریں:

غلط: وہ لڑکی بے پناہ خوبصورت ہے۔

صحیح: اس لڑکی میں خوبصورتی بے پناہ ہے۔

غلط: اقبال نے اپنے بے پناہ اسلوب کی وجہ سے۔۔۔

صحیح: اقبال کے اسلوب کی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے۔۔۔

غلط: آج وہاں بے پناہ بارش ہوئی۔

صحیح: آج وہاں بے حد بارش ہوئی۔

غلط: میں تو بے پناہ تھکا ہوا تھا۔

صحیح: میں تو بہت زیادہ/ بے حد/ انتہائی تھکا ہوا تھا۔

بیگم اس لفظ کے ساتھ کلمۂ تعظیم لگانا ہو تو لفظ کے پہلے ''جناب'' لگایا جائے گا اور لفظ کے بعد ''صاحب''۔ یعنی ''جناب بیگم صاحب'' کہا جائے گا۔ صرف ''جناب بیگم'' نہیں کہتے، اور نہ ''جناب'' کہتے ہیں۔ دیکھئے، ''جناب'' ؛ ''صاحب''۔

پاخانہ خلاصہ ہونا دیکھئے، ''خلاصہ کرنا''۔

پارسا اس لفظ کے دو معنی ہیں: (۱) گناہوں سے پرہیز کرنے والا، اور (۲) پارس، یعنی ایران کا رہنے والا۔ موخر الذکر معنی میں یہ لفظ اردو میں نہیں ہے، لیکن فارسی کا ایک مصرع ہمارے یہاں ضرب المثل ہے ع

من خوب می شناسم پیران پارسارا

اس مصرعے میں ''پارسا'' بمعنی ''ایرانی، پارسی'' ہے۔ حافظ سے منسوب ایک شعر میں ''پیران پارسا'' اور ان کے ایک مصدقہ شعر میں ''رندان پارسا'' استعمال ہوا ہے

گر مطرب حریفاں ایں پارسی بخواند — در رقص حالت آرد پیران پارسا را

خوبان پارسی گو بخشندگان عمراند — ساقی بدہ بشارت رندان پارسا را

غالب نے بھی فارسی میں ''رندان پارسا'' بمعنی ''ایران کے رند'' برتا ہے

بہ بادہ داغ خودی از رواں فروشستہ — بلاک مشرب رندان پارساستے

پاری ''کھیلنے کی باری'' کو ہندی میں ''پاری'' کہتے ہیں جو غالباً ''پالی'' کی تسہیل ہے۔ لیکن اردو میں اس مفہوم کے لئے ''باری'' ہی ہے۔ بعض اخبار نویس بالکل بے وجہ ہندی کی نقل میں ''باری'' کے بجائے ''پاری'' لکھتے ہیں۔

غلط: ہندوستان نے پہلی پاری میں تین سو رن بنائے۔

صحیح: ہندوستان نے پہلی باری میں تین سو رن بنائے۔

دیکھئے: ''باری''۔

پاس پڑوس دیکھئے ''آس پڑوس''؛ ''اڑوس پڑوس''۔

پانچوں عیب شرعی یہ محاورہ بہت عام ہے، مثلاً ''فلاں شخص اچھا آدمی نہ تھا۔ اس میں پانچوں عیب شرعی موجود تھے''۔ جن پانچ برائیوں کی طرف یہاں اشارہ ہے، وہ حسب ذیل ہیں: چوری کرنا، شراب پینا، جھوٹ بولنا، جوا کھیلنا، زنا کرنا۔

پانو دیکھئے: ''پاؤں''۔

پانیوں ''پانیوں'' بمعنی پانی کی کثیر مقدار، یا بہت طرح کا پانی، اردو میں مستعمل ہے، لیکن لغات میں درج نہیں۔ یہ شاید اس وجہ سے کہ ''پانیوں'' میں استعاراتی کیفیت ہے اور لغات میں استعاراتی معنی بہت کم درج کئے جاتے ہیں۔ انجیل کی کتاب ''پیدائش'' Genesis کے بالکل شروع کی آیتوں میں لفظ Waters بار بار آیا ہے اس انجیل کے تمام پرانے تراجم میں Waters کا ترجمہ ''پانیوں'' ہی کیا گیا ہے۔ اگر عبارت کا مضمون اس کا تقاضا کرتا ہو تو لفظ ''پانیوں'' میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

پاؤں بعض کا قول ہے کہ یہ لفظ بروزن فع لن درست نہیں ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ پہلے زمانے میں بروزن فع لن کثرت سے مستعمل تھا۔ اب کم سنائی دیتا ہے، لیکن غلط بہر حال نہیں ہے۔ میر ؎

ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں پکھایا کچھ چونٹیوں کو لے کر پاؤں تلے مل ڈالا

اس لفظ کا املا بعض لوگ ''پانو'' کرتے ہیں، اس کا ترک مناسب ہے۔ ایک لفظ کا ایک ہی املا ہو تو بہتر ہے۔

پاے بمعنی "پاؤں" مع یاے زائدہ۔ دیکھیے "جاے"۔

پپڑانا ہونٹ، یا کسی نرم جگہ پر پپڑی پڑ جانا۔ اسم سے مصدر بنانے کی صلاحیت اردو میں ہے، مثلاً گرم/گرمانا = گرم کرنا، گرم ہونا؛ شرم/شرمانا = شرم محسوس کرنا، ہونا؛ نرم/نرمانا = نرم پڑ جانا، وغیرہ۔ لیکن افسوس کہ یہ صرف چند ہی مصادر پر جاری کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں نئے مصادر بننے کا میدان بہت تنگ رہ گیا۔ انگریزی میں تقریباً ہر اسم کو مصدر بنا سکتے ہیں۔ آج کی اردو میں اسم سے مصدر بنانے کا رواج پہلے سے بھی کم ہے۔ لیکن جو الفاظ پہلے تھے، مثلاً "پپڑانا"، انھیں دوبارہ رائج کرنا چاہیے۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی ممکن ہے ایسے مزید لفظ رائج ہو جائیں۔

زبان خشک تھی، ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے۔ ("توزک نامہ"، جلد دوم،
از شیخ تصدق حسین، ص ۷۰۵)

لیکن اس طرز کے نئے مصادر بنانے سے پہلے پرانے مصادر کو رواج میں دوبارہ لانا چاہیے تاکہ مصدر سازی کا مزاج پیدا ہو۔ ہر شخص اپنی من مانی کرنے لگے، اس سے اچھا ہے کہ پرانے ہی مصادر پر فی الحال قناعت ہو۔ مثلاً "برپا کرنا" کے لیے "برپانا" اور "گھبرا کرنا" کے لیے "گھبرانا" قابل قبول نہیں۔

پپیہا مشہور پرندہ۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

پتنگ اول دوم مفتوح، بمعنی "پروانہ"، یا "کوئی چھوٹا پردار کیڑا"۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ ملحوظ رہے کہ یہ لفظ فارسی نہیں ہے، براہ راست سنسکرت سے ہمارے یہاں آیا ہے۔ دیکھیے "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

پتنگا اول اور دوم مفتوح، یہ وہی "پتنگ" ہے جو اوپر گذر چکا۔ الف یہاں مزید علیہ ہے، اصل سنسکرت میں "پتنگا" تھا۔ اقبال ؎

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

پتہ کرنا ''معلوم کرنا''، ''پتہ لگانا'' کے مفہوم میں ''پتہ کرنا'' آج کے نوجوانوں کی زبان پر ہے۔ یہ محاورہ نہ اردو ہے نہ ہندی، اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ اسے ترک کرنا چاہئے۔

غلط اور نامناسب: پتہ کر کے بتائیے کہ نئے سیب بازار میں کب آئیں گے۔

صحیح و فصیح: معلوم کر کے بتائیے/ بتائیں۔۔۔

غلط اور نامناسب: میں وہاں پتہ کرنے گیا تھا لیکن وہاں کوئی ملا ہی نہیں۔

صحیح و فصیح: میں وہاں پتہ لگانے/معلومات حاصل کرنے۔۔۔

پٹائی یہ لفظ ہمارے یہاں مزاحیہ یا غیر رسمی استعمال کے لئے مخصوص ہے۔ اسے آج کل بالکل نامناسب طور پر ''زدوکوب'' یا ''مار پیٹ'' کے معنی میں استعمال کیا جارہا ہے۔

غلط: پولیس نے بے گناہ طالب علموں کی پٹائی کی۔

صحیح: پولیس نے بے گناہ طالب علموں کو زدوکوب کیا/ مارا پیٹا۔

غلط: استاد نے بچوں کی پٹائی کی۔

صحیح: استاد نے بچوں کو زدوکوب کیا/ مارا پیٹا۔

پر بطور حرف جار اردو میں کئی معنی رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں یہ لفظ مقام یا جائے وقوع کی وضاحت کرتا ہے اور ''میں'' کے معنی دیتا ہے:

آج آپ میرے گھر پر کھانا کھائیں۔

ریڈیو پر مشاعرہ کل ہوگا۔ آج ٹی وی پر مباحثہ ہے۔

ہڑتالیوں نے پارلیمنٹ ہاؤس پر دھرنا دیا۔

ریل گاڑی پر سفر کرنا اب مشکل ہوتا جارہا ہے۔

یہ سب استعمالات بالکل صحیح اور فصیح ہیں۔ اس لفظ کا دوسرا استعمال بطور حرف عطف ہے۔ حرف جار اور حرف عطف (بمعنی ''لیکن'') صورتوں میں اس کا دوسرا روپ ''پہ'' ایک زمانے میں مقبول تھا، خاص کر شعر میں۔ لیکن اب مدتوں سے یہ رائج نہیں رہ گیا۔ کبھی کبھی بعض لوگ شعر میں بضرورت لاتے ہیں، یا شاید اسے ''شاعرانہ'' سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ادھر کچھ لوگوں کے یہاں نثر میں بھی اس کا استعمال نظر آنے لگا ہے۔ یہ نہایت قبیح اور واجب الترک ہے۔

شعر میں تو برا معلوم ہوتا ہے لیکن برداشت کیا جا سکتا ہے، نثر میں اس کا جواز کچھ بھی نہیں۔ دیکھیے، ''پٹّی''۔

پردہ فاش کسی جرم کا پتہ لگ جانے کے معنی میں ''پردہ فاش / پردہ فاش ہونا'' کا استعمال ہندی والوں کی ایجاد ہے۔ اردو میں اس کا وجود نہیں، لیکن افسوس کہ بعض اردو والے اسے اپنے یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ترک اولیٰ ہے۔ اردو میں ''کسی کا پردہ فاش ہونا'' اس موقعے پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کی چھپی ہوئی بات کو ظاہر کردے، یا کسی کی چھپی ہوئی بات خود بخود ظاہر ہو جائے۔ آتش کا شعر ہے ؎

رونے کے بدلے حال پر اپنے ہنسا کیے	پردہ ہوا نہ فاش ہمارے ملال کا

''پردہ فاش کرنا'' اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کا راز یا خفیہ حالات ظاہر کردے۔ مثلاً ''طلسم ہوش ربا''، جلد اول از محمد حسین جاہ میں ہے (صفحہ ۸۵۲):

[عمرو] سمجھا کہ یہ پردہ فاش کرے گی، پس کمند مار اس کو گرایا۔''

غلط اور قبیح: قتل کا پردہ فاش، مجرم گرفتار [خبر کی سرخی]۔

صحیح اور فصیح: قتل کے مجرم کا راز / پردہ فاش، مجرم گرفتار۔

غلط اور قبیح: دھوکے کا پردہ فاش [خبر کی سرخی]۔

صحیح اور فصیح: فریبی کا [یا فریبیوں کا] کا پردہ فاش۔

غلط اور قبیح: خود کار رائفلوں کے سودے کا پردہ فاش کرتے ہوئے وزیر نے کہا۔۔۔ [ایک خبر]

صحیح اور فصیح: ۔۔۔ سودے میں بدعنوانیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے وزیر نے کہا۔۔۔

یاد رکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ''پردہ فاش ہونا / کرنا'' کے ساتھ حرف جار ''کا'' آتا ہے۔ یعنی ''کسی کا پردہ فاش ہونا'' ٹھیک ہے، لیکن ''کسی پر سے پردہ فاش ہونا'' درست نہیں۔ اگر ''کسی پر سے'' کے ساتھ صرف کرنا ہے تو ''پردہ کھولنا / اٹھانا'' ٹھیک ہوگا۔

پرند دیکھیے، ''پرندہ''۔

پرندہ اس لفظ میں ہائے ہوز زائد ہے، ''چڑیا'' کے معنی کے لحاظ سے ''پرند'' اور ''پرندہ'' میں کوئی فرق نہیں۔ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے، تو فارسی میں یہ بفتح اول و دوم بروزن ''کمند'' ہے۔

''نور اللغات'' میں بھی یہی تلفظ دیا ہے۔ لیکن اردو میں دوم مکسور بھی بولتے ہیں، بالخصوص جب ''چرند پرند'' کہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں دونوں تلفظ دیے ہیں، اور یہی موقف صحیح ہے۔ واضح رہے کہ ''ریشمی چادر، شال'' کے معنی میں یہ لفظ صرف ''پرند'' (اول دوم مفتوح) ہے۔ یعنی ''پرندہ'' کے معنی ''ریشمی چادر، شال'' نہیں۔

پرہیز یہ لفظ بالاتفاق مذکر ہے۔ لیکن اقبال نے اسے مونث باندھا ہے ؎

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

سچ یہ ہے کہ ''پرہیز'' کو مونث باندھنا یہاں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ''موجہ'' کا ہے جو بالاتفاق مذکر ہے لیکن ناصر کاظمی نے اسے مونث باندھا ہے۔ دیکھئے ''موجہ''۔

پریوار اردو کے بعض کرم فرما ''خاندان، گھرانہ، خانوادہ، گھر بار، کنبہ، ٹبر، اہل خانہ، اہل خاندان'' جیسے لفظوں کے ہوتے ہوئے ''پریوار'' جیسا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اسے اردو کی بدنصیبی نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ ''سنگھ پریوار'' کی بات اور ہے، کہ وہ ایک اصطلاح ہے۔ لیکن عام حالات میں ''پریوار'' کا استعمال نہایت نامناسب ہے۔

پسینہ یہ لفظ فارسی ہے۔ بعض لوگ اسے ''ہندی'' سمجھتے ہیں اور اسی لئے اسے ''پسینا'' لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ''ہندی'' الفاظ کو الف سے لکھنے کی تجویز کے بارے میں اس کتاب میں دیکھئے ''ہائے مختفی''۔

پلس وار اول مضموم معروف، دوم مکسور معروف۔ دیکھئے ''پولیس''۔

پنسن اردو کی ایک عجیب صفت ہے کہ بعض غیر زبانوں کے لفظ کی ''ش'' کو ''س'' کر لیتے ہیں۔ ''پنسن'' بھی ایسا ایک لفظ ہے۔ غالب کے زمانے تک اسے مع سین مہملہ بولتے تھے۔ غالب، بنام میر مہدی مجروح، مورخہ اکتوبر ۱۸۵۸:

> تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کے زمانے میں اس لفظ کا تلفظ کیا تھا؟ Pension کا انگریزی تلفظ ''پنشن'' مع سوم مفتوح ہے۔ اردو والے ''پنشن'' مع اول سوم مکسور معروف بروزن ''چل بل'' بولتے

ہیں۔

پلس دیکھیے: ''پولیس''۔

پولیس اردو میں اس لفظ کا املا واؤ معدولہ اور یائے تحتانی کے ساتھ ہے، جیسا کہ اوپر درج کیا گیا، اور اس کا تلفظ ''پلس'' بروزن فعل یعنی بروزن ''خورش'' ہے۔ ہندی میں یہ ''پولس'' لکھا جاتا ہے۔ بعض اردو اخبارات بھی اب لاعلمی کی بنا پر ''پولس'' لکھنے لگے ہیں، یہ غلط محض ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پرانے وقتوں میں ''پلس'' اور کبھی کبھی ''پولس'' بھی اس لفظ کے معروف املا تھے۔ پرانے زمانے میں ''پولیس کے سپاہی'' کے معنی میں ''پلس وار'' بولتے تھے، افسوس کہ یہ اتنا اچھا لفظ بھی ترک ہو گیا۔

پہ ''پر'' کا دوسرا روپ۔ اب یہ رائج نہیں رہ گیا، پہلے زمانے کے شعر میں بکثرت ہے۔ بعض لوگ اس کا تلفظ اول مفتوح کے ساتھ کرتے ہیں۔ بعض لوگ حرف جار کے معنی میں اول مکسور مجہول بولتے ہیں اور حرف ربط کے معنی میں اول مفتوح۔ دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ دیکھیے: ''پر''۔

پیترا اس لفظ کے معنی ''پاؤں کا نشان، پاؤں کے نشان کا قرینہ'' بھی ہیں (''پے'' بمعنی ''پاؤں'' اور ''ترا'' بمعنی ''تلا''):

> لقا کو خبر ہوئی کہ مہتر قران بڑی عیاری کر گیا۔ کس پھرتی سے دونوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔۔۔ حکم دیا کہ تم جا کر دیکھو تو مہتر قران ہی اٹھا لے گیا ہے یا اور کوئی غائب کر لے گیا۔۔۔ خواب گاہ میں آئے تو معلوم ہوا کہ پیترا مہتر قران کا ہے۔۔۔ لقا سے عرض کیا، یا خداوند بے شک یہ کام مہتر قران کا تھا۔ پیترا اسی کا معلوم ہوتا ہے (''بالا باختر''، از شیخ تصدق حسین، ص ۲۱۱)۔

پیٹ کھانا یائے معروف۔ ''مار کھانا'' یا ''پٹنا'' کے معنی میں یہ محاورہ کبھی کبھی سننے میں آتا ہے، لیکن اس کی کوئی سند نہیں۔ اس کا ترک اقرب ہے۔ ہاں ''مار پیٹ کھانا'' میں کوئی قباحت نہیں۔

پیش فرمانا آج کل بعض لوگ جب بخیال خود بہت تکلف سے کام لیتے ہیں تو ''پیش کرنا'' کی جگہ ''پیش فرمانا'' بولتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پیشکش کے سیاق و سباق میں ایک پہلو

عاجزی کا ہے۔ یعنی جب کوئی چیز پیش کی جاتی ہے یا پیش ہوتی ہے تو یہ عمل کسی چھوٹے کی طرف سے کسی بڑے کی طرف، یا کسی کم مرتبہ والے کی طرف سے کسی شخص برتر کی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا ''پیش فرمانا'' کہنا اجتماع ضدین کا حکم رکھے گا۔ اگر پر تکلف انداز اختیار کرنا ضروری سمجھا جائے تو ''پیش فرمانا'' کی جگہ ''ارشاد فرمانا'' کہنا چاہیے:

نامناسب اور قبیح: اب جناب صدر سے درخواست ہے کہ صدارتی کلمات / خطبہ/ مقالہ/ تقریر پیش فرمائیں۔

مناسب اور فصیح: ۔۔۔ ارشاد فرمائیں۔

نامناسب اور قبیح: اب ہمارے مہمان شاعر اپنا تازہ کلام پیش فرمائیں گے۔

مناسب اور فصیح: ۔۔۔ ارشاد فرمائیں گے۔

نامناسب اور قبیح: اب مہمان خصوصی/ جناب صدر انعامات پیش فرمائیں گے۔

مناسب اور فصیح: ۔۔۔ انعامات عطا/ تقسیم/ تفویض فرمائیں گے۔

پیش نظر ''پیش نظر'' اور ''مدنظر'' میں فرق یہ ہے کہ ''مدنظر'' کے پہلے حرف جار ''کو''، اور اس کے بعد فعل ناقص ''رکھتے ہوئے'' آتا ہے۔ ''پیش نظر'' کے پہلے حرف جار ''کے'' آتا ہے اور اس کے بعد فعل ناقص ''رکھتے ہوئے'' نہیں آتا۔ ''پیش نظر'' کے پہلے بھی حرف جار ''کو'' اور بعد میں ''رکھتے ہوئے'' درست ہے، لیکن اب اس طرح بہت کم بولا جارہا ہے۔

غلط: غیر ملکی سیاحوں کی آمد کے مدنظر ہوائی اڈے پر انتظامات بڑھا دیے گئے ہیں۔

صحیح: ۔۔۔ کو مدنظر رکھتے ہوئے ۔۔۔

صحیح: ۔۔۔ کے پیش نظر ۔۔۔

صحیح: ۔۔۔ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۔۔۔

غلط: بارش کے امکان کے مدنظر جلسہ ملتوی کردیا گیا۔

صحیح: بارش کے امکان کے پیش نظر جلسہ ملتوی کردیا گیا۔

دیکھیے، ''مدنظر''۔

پیل بمعنی ''ہاتھی'' یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری

نام، جانوروں کے"۔ملحوظ رہے کہ" پیل" فارسی ہے اور" فیل" اس کا معرب ہے۔" فیل" کا بھی مونث اردو میں کچھ نہیں۔

پینگ دلی میں یہ لفظ یائے معروف کے ساتھ بروزن" پینگ" بولتے ہیں۔ دلی، اور اس کے علاوہ کچھ اور علاقوں میں بھی، یہ تلفظ سننے میں آجاتا ہے۔ مگر کم۔ پلیٹس، "نور اللغات" اور" اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں مع یائے معروف (بروزن" پینگ") اور مع یائے مجہول (بروزن" گیند") دونوں طرح لکھا ہے۔ شان الحق حقی نے صرف یائے معروف سے لکھا ہے۔ یہ لفظ آج کل عام طور پر یائے مجہول کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ یائے معروف کے ساتھ اسے دلی کا علاقائی تلفظ سمجھنا چاہیے۔

تابع موضوع ہماری زبان کی بے نظیر شانوں میں ایک شان یہ بھی ہے کہ کلام میں زور یا حسن کی خاطر بعض الفاظ جوڑوں میں لائے جاتے ہیں۔ ایسے جوڑے مستقل فقرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ان میں تبدیلی نہیں کر سکتے، یعنی دونوں لفظ ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں حرف عطف بھی نہیں ہوتا۔ عموماً ایسے جوڑوں کا پہلا لفظ بامعنی اور دوسرا لفظ بے معنی ہوتا ہے۔ اگر دوسرا لفظ بھی بامعنی ہو تو اس کو" تابع موضوع" کہتے ہیں۔ مثلاً:

پانچ سات: جان پہچان: جھاڑ پھونک: جھاڑی جھنڈی: دوا دوش: دوڑ بھاگ: دوڑ دھوپ: دوست احباب: سعی سفارش: کام دھندا: کپڑا لتا: گھر بار: گھر دوار: لڑکے بالے: لوٹ مار اس طرح کے جوڑے میں اگر دوسرا لفظ بے معنی ہو تو اسے" تابع مہمل" کہتے ہیں۔ دیکھیے" تابع مہمل"، دیکھیے" سابق مہمل"۔

تابع مہمل کلام میں زور یا خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے بہت سے الفاظ جوڑے کی شکل میں بولے جاتے ہیں۔ ان جوڑوں کی حیثیت مستقل فقرے کی ہوتی ہے اور ان میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ ایسے جوڑوں میں پہلا لفظ عموماً بامعنی ہوتا ہے۔ اگر دوسرا لفظ بھی بامعنی ہو تو اسے "تابع موضوع" کہتے ہیں (" دیکھیے تابع موضوع")۔ اور اگر دوسرا لفظ بے معنی ہو تو اسے" تابع مہمل" کہتے ہیں۔ ایسے جوڑے کا دوسرا لفظ اکیلا کبھی نہیں بولا جاتا۔ مثلاً:

آن بان: بچا کھچا: پانی وانی: توبہ تلا: جھاڑ جھنکاڑ: روی سدی: شادی وادی: بغل

غپاڑا: کپڑ او پڑا: گول مال: لوٹ کھسوٹ: مار دھاڑ

دیکھئے: ''تابع موضوع''، دیکھئے: ''سابق مہمل''۔

تاریخ شاہد/گواہ ہے یہ فقرہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی مشہور بات، یا پہلے سے کسی مروج رائے کی تردید کرنی ہو۔ کسی ثابت شدہ اور بین بات کو بیان کرنے کے لئے ''تاریخ شاہد/گواہ ہے'' لکھنا سراسر غلط ہے۔

صحیح: لوگ کہتے ہیں اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔

صحیح: کہا گیا ہے کہ عورت بزدل ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورتوں میں ایک سے ایک جری جنگجو سپہ سالار ہوئے ہیں۔

غلط: تاریخ شاہد ہے کہ اکبر اعظم نے پانی پت کے میدان میں ہیمو بقال کو شکست دی۔

(یہاں کہنا چاہئے: ''تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔۔۔'')

غلط: تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں متعدد عظیم المرتبت حکما اور فلاسفہ پیدا ہوئے۔

(یہاں کہنا چاہئے: ''تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے۔۔۔'')

تارید کسی غیر زبان کے لفظ کو اردو کے طرز پر بنانا، یا کسی غیر زبان کے طریقے پر کوئی اردو لفظ بنانا۔ لفظ ''تارید'' خود اس کی ایک مثال ہے، کہ یہ عربی نہیں ہے، لیکن عربی مصدر (باب تفعیل) کے طور پر ''اردو'' سے بنا لیا گیا ہے۔ ''تارید'' کی جگہ ''اردوانا'' اور ''تہنید'' بھی بولتے ہیں۔ ''تہنید'' بھی باب تفعیل کے مصدر کے طور پر ''ہند'' سے بنا لیا گیا ہے، معنی وہی ہیں جو ''تارید'' کے ہیں۔ دیکھئے: ''گہرانا''۔

تانیث سے عاری نام، جانوروں کے حسب ذیل جانور ہمیشہ مذکر بولے جاتے ہیں، ان کی تانیث نہیں ہے۔ اگر بطور خاص ان کی مادہ کا ذکر مقصود ہو تو نام کے پہلے ''مادہ'' یا ایسا ہی کوئی لفظ لاتے ہیں:

اجگر، اژدہا، الو (اس کی مادہ کبھی کبھی ''الن'' کہی جاتی ہے، لیکن بہت شاذ)، اود بلاؤ، باز، بچھو کھوپڑا/بس کھوپڑا، بچھو، (لیکن دیکھئے ''بچھی'')، بھالو، بھنگا، بھیڑیا، پتنگ، پتنگا، پپیہا، پسو، توسن، جرہ، جگنو، جھینگر، چکور، چیتا، دریائی گھوڑا، زراف،

سانپ، (مگر دیکھئے "سانپن" اور "دومہی سانپ")، سمندر، سیمرغ، شاہین، شکرخورا، طاؤس، عقاب، عنقا، غزال، کچھوا (اس کی مادہ "کچھوی" بولی جاتی ہے، مگر بہت شاذ)، کوا، کھٹمل، کیچوا، گدھ [اس کی ایک صورت "گد" بھی ہے، مگر شاذ]، گرگٹ، گوسفند، گھڑیال، گھن، گھونگا، گیدڑ، گینڈا، لکڑ بگھا، مچھر، مگرمچھ، مچھلیوں [دریائی] کے اقسام، ناق، ہدہد، ہما، وغیرہ۔

بہت سے جانوروں کے عربی فارسی نام، خاص کر وہ جو عام بول چال میں کم رائج ہیں، ہمیشہ مذکر بولے جاتے ہیں:

آہو، ابابیل، اژدر، اسپ، افعی، بوتیمار، بوزنہ، بوم، بیل، تعفور، ثور، خر، خنزیر، راہوار، زاغ، (لیکن "زغن" اور "ظلیع از" مونث ہیں)، سگ، سمند، سوسمار، شپرہ، شتر، عصفور، فرس، فیل، کرگدن، کرگس، گورخر، گوزن، گوسفند، مار، مور، موسیقار، یوز، وغیرہ۔

یہ بھی واضح رہے کہ "ابابیل" اگر مونث ہے تو اس کا کچھ مذکر نہیں، اور اگر مذکر ہے تو اس کا کچھ مونث نہیں۔

مندرجہ بالا تمام الفاظ میں اگر یہ واضح کرنا ہو کہ مونث مراد ہے، تو لفظ "مادہ"، یا ایسا ہی کوئی لفظ، لاحقے یا سابقے کے طور پر برتنا ہوگا۔ بعض نام ایسے ہیں کہ جن کی تانیث موجود ہے، لیکن وہ صرف نر سے تفریق بیان کرنے کے لئے بولی جاتی ہے۔ مثلاً: بندر/بندریا۔ جب عام طور پر بندر مراد لینا ہو، تو مثلاً یوں کہیں گے، "اس درخت پر بندر بہت ہیں۔" لیکن اگر تخصیص سے کہنا ہو تو یوں کہیں گے، "مداری کے پاس دو بندریاں تھیں۔" خچر، ریچھ، شیر، کبوتر، مور، ناگ، نیولا، ہاتھی، ہرن، وغیرہ کا بھی وہی حال ہے۔ "خچر" سب سے انوکھا لفظ ہے کہ اس کا مونث "خچری" ہے اور خود "خچر" بھی مونث باندھا گیا ہے۔ سودا کا مصرع ہے ع

جو خچریں ہیں پیا ہے انھوں نے آب حیات

ملحوظ رہے کہ "سانڈنی" بمعنی "سانڈ کی مادہ" نہیں ہے۔ جو تیز رفتار اونٹنی سواری کے لئے استعمال کی جائے اسے "سانڈنی" کہتے ہیں۔ اسی طرح، "سانڈا" کا کوئی تعلق سانڈ سے نہیں۔

''سانڈا'' ایک بڑی چھپکلی ہے جسے عرفِ عام میں ''بس کھوپڑا / بچھ کھوپڑا'' کہتے ہیں۔ دیکھیے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''؛ ''جانوروں کے نام''؛ ''مچھر''۔

تبادلہ یہاں علامہ سید سلیمان ندوی کا قول نقل کرنا بہت کافی ہے کہ لفظ ''تبادلہ'' عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے۔ اس کو چھوڑ کر ''مبادلہ'' یا ''تبادل'' بلوانے کی کوشش زبردستی ہے۔

تبدیلی یہاں بھی علامہ سید سلیمان ندوی کا قول نقل کرنا بہت کافی ہے کہ ''تبدیل'' کے مقابلے میں ''تبدیلی'' عربی قاعدے سے غلط ہے، مگر ہمارے یہاں صحیح ہے۔

تب ہی اردو میں عموماً ''تبھی'' کو ترجیح ہے، اور اسے تاکید کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان دنوں اسے صرف ''تب'' یا ''اس وقت'' کے معنی میں لکھا جاتا ہے۔ یہ بالکل نامناسب ہے:

غلط اور نامناسب: اس کا بچہ گھر سے اسکول جا رہا تھا، تب ہی اسکوٹر نے اسے ٹکر مار دی۔
صحیح اور مناسب: ۔۔۔ اس وقت ۔۔۔ / ۔۔۔ کہ ۔۔۔
غلط اور نامناسب: وہ گھر پہنچا اور تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
صحیح اور مناسب: ۔۔۔ اور فون کی گھنٹی ۔۔۔ / اس کے گھر پہنچتے ہی فون کی گھنٹی ۔۔۔
صحیح اور مناسب: پہلے سبق یاد کرو، تبھی کھانے کو دوں گی، اس کی ماں نے کہا۔
غلط اور نامناسب: میں راستہ ڈھونڈ رہا تھا، تب ہی ایک راہگیر نے میرا ہاتھ تھاما۔
صحیح اور مناسب: ۔۔۔ اس وقت / تب ۔۔۔ / ۔۔۔ کہ ۔۔۔

تت سم اول سوم مفتوح۔ غیر زبان سے لئے ہوئے لفظ کی اصل کو تت سم کہا جاتا ہے اور اس کی بدلی ہوئی رائج مقامی شکل کو ''تدبھو'' کہتے ہیں۔ عام اصول ہے کہ تت سم کے مقابلے میں تدبھو زیادہ سبک اور سڈول ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح سنسکرت علما نے ایجاد کی تھی اور عموماً سنسکرت ہی الفاظ کے لئے بولی جاتی ہے۔ اصولاً اس کو تمام غیر زبانوں کے الفاظ کے لئے برتنے میں کوئی ہرج نہیں۔ مثال کے طور پر بعض سنسکرت تت سم اور اردو تدبھو حسب ذیل ہیں:

تت سم	تد بھو
آدتیہ وار	اتوار/ ایتوار
آشچریہ	اچرج
اکشر/ اکھر	اچھر/ اکھر
ایودھیا	اجودھیا
ویاکل	بیکل
دگدھ	دودھ
کشیتر	کھیت
گرہ	گھر
مرتیہ	مرنا/ مرن
یوون	جوبن

اسی طرح، انگریزی تت سم اور اردو تد بھو کی بعض مثالیں مرقوم الذیل ہیں:

تت سم	تد بھو
Aide de camp (اصل تلفظ: ایڈ ڈ کاں)	ایڈی کانگ
Attache Case (اصل تلفظ: اتاشے کیس)	اٹیچی کیس
Bobbin Net	بابرلیٹ
Bull Dog	گلڈانگ
Cabinet	کابینہ
Captain	کپتان
Glass	گیلاس/ گلاس
Parliament	پارلیمان/ پارلیمنٹ

دیکھیے: "یوون"۔

تتلی

یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے: "تذکیر سے عاری نام، جانوروں

کے'' ؛ دیکھیے '' تیتری''۔

تجربہ عربی میں اول مفتوح اور سوم مکسور ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہیں '' آزمائش''، اور فارسی میں اس کے معنی ہیں، '' آزمائش''، اور ''کسی کو کچھ سکھانا''۔ اردو میں اس لفظ کو Experiment اور Experience کے معنی میں بولتے ہیں۔ ''آزمانا'' کے معنی بھی کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ اردو میں یہ لفظ اول اور دوم مفتوح کے ساتھ بروزن فعولن بولتے ہیں۔ اول مفتوح اور سوم مفتوح بروزن فاعلن بھی اردو میں سنا جاتا ہے۔ دونوں درست ہیں لیکن مع اول دوم مفتوح بروزن فعولن بہتر ہے۔ بعض لوگ اول مفتوح اور دوم مضموم بولتے ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں۔

تد بھو اول سوم مفتوح۔ غیر زبان سے کسی لفظ کو لے کر اس کا املا اور تلفظ اپنی زبان کے مزاج کے موافق ڈھال لیا جائے تو ایسے لفظ کو اصل لفظ (یعنی ''تت سم'') کا ''تد بھو'' کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح سنسکرت علما کی ایجاد کی ہوئی ہے اور عموماً ان لفظوں کے لئے برتی جاتی ہے جو سنسکرت الاصل ہوں۔ لیکن اصولی طور پر کسی بھی تت سم سے بنائے ہوئے لفظ کو ''تد بھو'' کہہ سکتے ہیں۔ دیکھیے، ''تت سم''؛ ''یودن''۔

تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے اردو زبان میں یہ بات بھی پر لطف ہے کہ جہاں ہم لوگ تذکیر اور تانیث الفاظ کے بارے میں بہت تردد اور استقصا کرتے ہیں وہاں ہمارے یہاں اکثر جانوروں کے نام یا صرف مذکر ہیں، یا صرف مونث۔ اگر بطور خاص نر مراد لینا ہو تو نام کے پہلے ''نر'' یا ایسا ہی کوئی لفظ لگاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔ مثلاً ''مچھلی'' یا ''فاختہ'' اگر نر بھی ہوں تو کوئی ''نر فاختہ'' یا ''نر مچھلی'' نہیں کہتا۔ اس کے برخلاف مشہور مچھلیاں ''روہو'' اور ''مہاشیر'' ہمیشہ نر بولی جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ دریائی مچھلیوں کی تمام قسموں کے نام مذکر ہیں۔ حسب ذیل جانور ہمیشہ مونث بولے جاتے ہیں، ان کا تذکیری نام نہیں ہے:

باشھی، بط، بطخ، تتلی، چھپکلی، چیل، دیمک، زغن، سانڈنی [بمعنی ''تیز رفتار اونٹنی جو سواری کے کام آتی ہے'']، عندلیب، غلیواز، فاختہ، قاز، قمری، کویل، گاومیش، گوریا،

گوہ، لومڑی، مچھلی، مرغابی، مکھی، مکس، وغیرہ۔

واضح رہے کہ "چمگادڑ" دونوں طرح درست ہے، لیکن پوربی علاقوں میں اسے "گادڑ" (سوم مضموم) بھی کہتے ہیں۔ وہاں یہ صرف مذکر ہے۔ "مرغی" من حیث النوع بھی ہے، مثلاً "مرغی پالنا" یعنی Chicken پالنا، یعنی یہاں جنس کی قید نہیں۔ اور "مرغی اور مرغے کی شکل ایک سی نہیں ہوتی" یہاں "مرغی" بطور مادہ ہے اور "مرغا" بطور نر۔ یہ بھی واضح رہے کہ "ابابیل" اگر مونث ہے تو اس کا کچھ مذکر نہیں، اور اگر مذکر ہے تو اس کا کچھ مونث نہیں۔ "طوطی" کا معاملہ کچھ مختلف ہے۔ دیکھیے، "طوطی"۔ دیکھیے، "جانوروں کے نام، اردو میں"۔

تذکیر و تانیث دیکھیے، "مذکر اور مونث الفاظ کی پہچان، اردو میں"۔

تذکیر و تانیث، جانوروں کے نام کی دیکھیے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"؛ "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

ترپ سر ترپ کے پتے کو "ترپ سر" بھی کہتے ہیں۔ پروفیسر وحید قریشی کہتے ہیں کہ ایک بار میں چار ہاتھوں کی جیتی ہوئی گڈی کو بھی "سر" کہتے ہیں۔ "سر" میں اول مفتوح ہے۔ اس زمانے میں، جب "ترپ" کی جگہ "ٹرمپ" مستعمل ہو گیا ہے، تو "ٹرمپ سر" بھی اسی معنی میں بولتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارا لفظ "ترپ" انگریزی Trump کا اردو روپ ہے۔ آہستہ آہستہ اصل انگریزی لفظ اردو والے ہوئے روپ پر حاوی ہو گیا۔ خود "ترپ" کا لفظ بھی "رنگ" اور "سر" کے الفاظ کو ہٹا کر قائم ہوا تھا۔ ویسے اب بھی یہ دونوں الفاظ "ترپ" کے معنی میں کبھی کبھی سنائی دیتے ہیں۔ دیکھیے "سر ہونا"۔

ترجمان اول مفتوح، سوم مضموم۔ دیکھیے، "ترجمہ"۔

ترجمہ عربی میں اول و سوم مفتوح ہیں۔ اردو میں بھی یہی تلفظ زیادہ تر سننے میں آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں سوم مضموم بھی سنائی دے جاتا ہے، شاید اس وجہ سے کہ اس کا اسم فاعل "ترجمان" سوم مضموم کے ساتھ (بروزن "بدگمان") بولا جاتا ہے۔ بہر حال، "ترجمہ" کے تلفظ میں فی الوقت اول سوم مفتوح کو ترجیح ہے۔ "ترجمان" میں البتہ سوم مضموم بولنا انسب ہے۔ انگریزی کا لفظ Dragoman "ترجمان" کے معنی میں اسی "ترجمان" سے بنا ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس لفظ کے

اصل معنی Translation ہیں۔ عرب تہذیب کے اعتبار سے اگر ہم نے کسی شخص کے سوانح بیان کئے تو گویا اس کا ''ترجمہ'' کردیا، کہ ترجمے کا کام ہے، نامعلوم کو معلوم کردینا۔ اسی لئے کسی کے سوانح حیات یا حالات کو عربی میں ''ترجمہ'' کہتے ہیں۔ یہ معنی اردو میں بھی ہیں، لیکن بہت معروف نہیں۔ تلفظ بہر حال اول وسوم مفتوح کے ساتھ ہے۔

تشنہ یہ لفظ اول مضموم اور اول مکسور دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ شان الحق حقی نے صرف اول مکسور لکھا ہے۔ اس کے برخلاف، ''نور اللغات'' نے لکھا ہے کہ اول مفتوح ہی صحیح ہے اور اول مکسور بولنا خطا ہے۔ فی الوقت دونوں تلفظ یکساں طور پر رائج ہیں اور دونوں ہی کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ جدید فارسی میں اول مکسور بولتے ہیں۔

تشہیر اس لفظ کے معنی تو ''شہرت'' ہی کے ہیں، لیکن اردو روزمرہ کے بموجب اس میں تھوڑا سا شائبہ برائی کا بھی ہے۔ یعنی ''تشہیر'' یا تو بری بات یا چیز کی ہوتی ہے، یا ایسی بات کی جسے راز میں رکھنا مقصود تھا۔ یا پھر کسی بات کی شہرت برے طور پر کی جائے تو اسے ''تشہیر'' کہیں گے۔ مثلاً:

مناسب: آج کل قرۃ العین حیدر کے ناول ''چاندنی بیگم'' کی بہت شہرت ہے۔

مناسب: عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی (غالب)

مناسب: مخالفوں نے اس کی رشوت خوری کی خوب تشہیر کی۔

مناسب: اس بات کو پوشیدہ رکھنا، اس کی تشہیر نہ ہونے دینا۔

مناسب: قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے (سودا)

نامناسب: اپنے سورماؤں کی خوب تشہیر کرو کہ دشمن کے حوصلے پست ہوں۔

مناسب: اپنے سورماؤں کو خوب شہرت دو۔۔۔۔

تعقید، اضافت کی علامت میں دیکھئے: ''اضافت کی علامت (کا، کی، کے) میں تعقید''۔

تعقید لفظی ظفر احمد صدیقی نے اپنے ایک مفصل مضمون میں دکھایا ہے کہ کتب لغت وفن کے مطابق ''تعقید'' کی اصطلاح اسی صورت میں صادق آتی ہے جب الفاظ کی نحوی ترتیب بدل دینے کے باعث معنی سمجھنے میں مشکل ہو۔ ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن اردو میں حسرت موہانی

اور شوق نیموی نے اس اصطلاح سے یہ معنی نکالے ہیں کہ کہیں بھی اور کبھی بھی جب الفاظ اپنی نحوی ترتیب سے نہ آئیں تو اسے تعقید کہا جائے گا، خواہ معنی میں خلل واقع ہو یا نہ ہو۔ یہاں ہم ''تعقید'' پر گفتگو انھیں معنی کے لحاظ سے کریں گے جو حسرت اور شوق نے بیان کئے ہیں۔

اردو میں تعقید لفظی کی خاص اہمیت ہے اور کلام میں اثر اور زور لانے کے لئے اچھے انشا پرداز اسے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں کوئی قاعدے نہیں ہیں کہ تعقید لفظی کہاں مناسب ہے اور کہاں نہیں۔ لیکن اچھا انشا پرداز خود پہچان لیتا ہے کہ تعقید لفظی کب غلط یا نامناسب لگتی ہے۔ مثلاً یہ عبارتیں دیکھئے:

(۱) کھڑی کھڑی وہ عورت توڑتی تھی پتھر۔

(۲) میں وہاں رہا تھا جا، لیکن پھر نہ جانے کیوں گیا رک۔

(۳) آسٹریلیا کو ہرا دیا جاپان نے سیمی فائنل میں۔

(۴) پہنچ گئیں امریکہ کی فوجیں چین کے ساحل پر۔

(۵) بولی بڑے زور سے وہ، نہ وہاں جاؤں گی میں۔

(۶) گیا تھک تو میں ضرور تھا لیکن خوش بھی ہوا میرا جی۔

مندرجہ بالا جملوں میں سے نمبر ایک اور دو اردو کی حد سے باہر ہیں۔ نمبر تین بھی باہر ہے لیکن یہ اس وقت اردو میں ممکن ہے جب اس کے سیاق و سباق میں کچھ ہو:

(۳) آسٹریلیا کے بارے میں امید تھی کہ ورلڈ کپ جیتے گا، لیکن آسٹریلیا کو ہرا دیا جاپان نے سیمی فائنل میں۔

اب یہ جملہ قابل قبول ہے، لیکن بہت اچھا پھر بھی نہیں ہے۔ اچھا جملہ یوں ہوگا:

(۳) آسٹریلیا کے بارے میں امید تھی کہ ورلڈ کپ جیتے گا، لیکن آسٹریلیا کو تو جاپان نے سیمی فائنل ہی میں ہرا دیا۔

جملہ نمبر چار بھی اردو کی حد سے باہر ہے لیکن یہ اس وقت اردو میں ممکن ہے جب اس کے سیاق و سباق میں کچھ ہو:

(۴) پھر کیا تھا، پہنچ گئیں امریکہ کی فوجیں چین کے ساحل پر۔

جملہ نمبر پانچ اور چھ کسی بھی طرح اردو نہیں ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج اردو کے اخبارات اس طرح کی عبارت لکھ رہے ہیں:

(۱) سہارا انڈیا پریوار نے کیا'' سہارا یو اتسو'' کا آغاز۔

(۲) ونود اور مینو نے سب سے تیز ایتھلیٹ۔

(۳) فن کاروں کے شہر میں امنڈ پڑا انسانی سیلاب۔

یہ سب استعمالات اردو کے لحاظ سے بالکل غلط ہیں۔ تعقید لفظی کے غلط اور بھونڈے استعمال کا چلن ہمارے یہاں ہندی اور ٹی وی کی دیکھا دیکھی شروع ہوا ہے اور اب اردو اخبارات بھی اس کو پھیلا رہے ہیں۔ ہندی میں اس کی وجہ یہ ہے کہ کھڑی بولی ہندی میں ابھی وہ پختگی نہیں آئی ہے کہ زبان کی ان باریکیوں کو ملحوظ رکھ سکے جن کو سمجھنے کے لئے قواعد کی نہیں، معیاری زبان کے عینی تصور اور اس سے مزاولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، ہندی والے سمجھتے ہیں کہ تعقید اگر محاورے کے خلاف ہو تب بھی اچھی ہے۔ اردو میں ایسا نہیں۔ اردو والے بے وجہ ہندی کے دباؤ میں آکر اپنی زبان خراب کر رہے ہیں۔

تغدر اول مضموم، سوم مفتوح، بمعنی Great Indian Bustard۔ اسے ''تغدری'' بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے،'' تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں بعض الفاظ کا عوامی یا عامیانہ تلفظ حرفوں کی تقدیم و تاخیر سے بنتا ہے۔ مثلاً:

ارمود [ت] / امرود [ت]؛ الینڈنا / انڈیلنا؛ برام / بیمار؛ چھکلا / چھلکا؛ حریان [حیران]؛ [سفیل] / فصیل؛ لکھلو / لکھنؤ

ایسے چند لفظ اور بھی ہیں، مثلاً ''مطلیب'' [بجائے ''مطلب''] جو بعض علاقوں میں صرف کم پڑھے لکھوں کی زبان پر ہے، یا مزاحیہ انداز میں کبھی کبھی بول دیا جاتا ہے۔ تلفظ میں اس تغیر کی وجہ نہ معلوم ہو سکی، لیکن بعض تغیر بہت پرانے ہیں۔ ''ارموذ'' بمعنی ''امرود'' کا اندراج ''برہان قاطع'' میں ہے جو ۱۰۸۲ مطابق ۱۶۷۱ / ۱۶۷۲ میں مکمل ہوئی۔ ''برہان'' میں تو ''امروت'' بھی ہے،

لیکن معنی صاف نہیں بیان کئے۔ ''معطل'' اور ''برام'' کے علاوہ درج بالا سب تلفظ بلا تفریق علاقہ ہر جگہ سنے گئے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ تقلیب حروف کی یہ صورت صرف اردو میں ہے۔

تقرری لفظ ''تقرر'' کے ہوتے ہوئے ''تقرری'' بے ضرورت ہے، کہ اس میں چھوٹی سی کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔ فاضل محض اور واجب الترک ہے۔

تقوی اردو میں الف مقصورہ کے ساتھ ''تقویٰ'' مروج ہے۔ لیکن اصولاً اسے بروزن ''سردی'' استعمال کر سکتے ہیں۔ غالب ؎

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا

غزل کے قافیے ''تسلی''، ''معنی'' وغیرہ ہیں۔ لہٰذا یہاں ''تقوی'' بروزن ''سردی'' ہی پڑھیں گے۔ اسی طرح: ''تقوی زاہد'' بمعنی ''زاہد کا تقویٰ''، بالکل ٹھیک ہے۔ دیکھئے: ''الف''۔

تکان آج کل یہ لفظ صرف ''تھکاوٹ، تھکان'' کے معنی رائج ہے۔ ''دھمک، صدمہ'' کے معنی میں یہ لفظ پہلے بہت رائج تھا۔ اب ذرا کم سننے میں آتا ہے۔ ان معنی میں یہ لفظ بہت کارآمد ہے اور پھر رائج کئے جانے کا تقاضا کرتا ہے:

کئی سو من کا پتھر۔۔۔ کھڑکھڑاتا ہوا۔۔۔ قریب زال کے آیا۔۔۔ زال اس کی تکان میں گرا کہ شانہ اور کولھا دونوں اکھڑ گئے۔ (''ایرج نامہ''، جلد اول، از شیخ تصدق حسین، ص ۷۰۶)۔

تکیہ اول مفتوح، اس لفظ کو ''فقرا و صوفیا کے قیام کی جگہ''، اور ''سرہانا'' کے علاوہ ''قبرستان'' اور ''قبر'' کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ وزیر علی صبا کا شعر ہے ؎

شہید عشق کی مٹی بہت خراب ہوئی نہ تکیے کا مرا مردہ ہوا نہ مرگھٹ کا

ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ یہاں ''تکیہ'' بمعنی ''قبرستان'' ہے، نہ کہ قبر، حالانکہ ''مرگھٹ'' کی مناسبت سے ''قبر'' زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال، لیکن مندرجہ ذیل شعر میں امداد علی بحر نے ''قبر'' کے معنی مراد لئے ہیں ؎

لیٹے ذرا جو پاس تو کہتے ہو دور دور تکیے میں جا ئیں گے جو اٹھیں گے پلنگ سے

تلمذ ''شاگردی، شاگرد بنانا'' کے معنی میں یہ لفظ، اور تفعیل کے وزن پر اسی قبیل کا دوسرا لفظ

''تلمیذ'' (بمعنی ''شاگرد'') عربی معلوم ہوتے ہیں لیکن عربی میں نہیں ہیں۔ فارسی اردو کے کئی پرانے لغات میں یا ''تلمذ'' درج ہے یا ''تلمیذ''۔ دونوں یکجا کم نظر آتے ہیں۔ ''منتخب'' میں ''تلمیذ'' بکسر اول درج کر کے اس کی جمع ''تلامذہ'' بتائی گئی ہے۔ آگے لکھا ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ یہ لفظ عربی فصیح نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ''تلمیذ'' کا معرب ہے۔ ''منتخب'' میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ''تلمیذ'' کو کس زبان سے معرب کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ شٹیپیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، عبرانی میں کوئی لفظ ''تلمیذ'' ہوگا (غالباً بفتح اول) جس سے عربی ''تلمیذ'' بکسر اول بنا لیا گیا۔ ''دہخدا'' نے دونوں درج کئے ہیں لیکن یہ بھی کہا ہے کہ اصل لفظ ''تتلمذ'' ہے اور ''تلمذ'' غلط العام۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ دونوں صحیح ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان میں اگر ''تلمیذ'' (بکسر اول) ہے بھی تو ''تلمذ'' نہیں ہے۔ اردو فارسی والوں نے ''تلمیذ'' کی جمع بھی عربی کے طرز پر ''تلامذہ'' بنائی ہے۔ عربی میں، ظاہر ہے کہ ''تلامذہ'' بھی نہیں ہے۔ شٹیپیر نے ''تلمذ'' نہیں درج کیا ہے لیکن ''تلمیذ'' درج کیا ہے، بمعنی ''شاگرد بنانا'' (یعنی جن معنی میں ہم ''تلمذ'' استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ''تلمیذ'' بمعنی شاگرد ہے)۔ شٹیپیر کا کہنا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور وہاں اس کا مادہ ''لمذ'' ہے۔ ''آنندراج'' میں ''تلمذ'' ہے، لیکن ''تلمیذ'' نہیں ہے۔ شٹیپیر کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ عبرانی ''لمذ'' سے ''تلمیذ'' (غالباً بفتح اول) مشتق ہوا، پھر عربی میں آ کر وہی لفظ بکسر اول ہو گیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس کے معنی ''شاگرد'' متعین کئے گئے ہوں۔ بعد میں ''تلمیذ'' کو عربی مصدر بروزن تفعیل قیاس کر کے کسی نے اسے باب تفعل میں ڈال کر ''تلمذ'' بنا لیا اور اس کے معنی ''شاگرد ہونا، شاگرد بنانا'' قرار پائے۔

اردو کی موجودہ صورت یہ ہے کہ ''تلمذ/تلمیذ/تلامذہ'' سب درست ہیں لیکن عربی الفاظ ہونے کا گمان ان پر نہ کیا جائے۔ یہ بھی خیال رہے کہ اردو میں ''تلمیذ/تلمذ/تلامذہ'' سب میں اول مفتوح ہے۔

تلمیذ دیکھئے: ''تلمذ''۔

تمازت بعض لوگ اس لفظ کو غلط سمجھتے ہیں، کیوں کہ عربی میں ''تموز'' تو ہے، ''تمازت''

نہیں ہے۔ بے شک یہ عربی میں نہیں ہے، لیکن اردو والوں نے اسے بروزن "ہلاکت" قیاس کر لیا ہے۔ اس طرح یہ مہند بالعربی ہے اور اردو کی حد تک بالکل صحیح ہے، جس طرح "فلاکت" اور "نزاکت" اردو میں بالکل صحیح ہیں، اگرچہ عربی نہیں ہیں۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" سے فقرہ "تمازت آفتاب" نقل کیا ہے، یعنی ظہیر دہلوی لفظ "تمازت" کو فارسی/عربی الفاظ کی طرح مرکب کرنا صحیح سمجھتے تھے۔

تماشا یہاں حرف آخر الف ہے، نہ کہ ہائے ہوز۔ بعض لوگ اس لفظ کو ہائے ہوز سے لکھتے ہیں۔ یہ غلطی کچھ بہت پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں بھی در آنے لگی ہے۔ وزیر آغا کی ایک کتاب کا نام ہے، "غالب کا ذوق تماشہ۔" اگر "تماشا" کو ہائے ہوز سے لکھیں تو اس لفظ کے مرکبات، مثلاً "تماشائے گلشن" کو صحیح لکھنا دشوار ہو جائے گا، اور "تماشائی" وغیرہ لفظوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

تنزلی لفظ "تنزل" کے ہوتے ہوئے "تنزلی" بے ضرورت ہے، کہ اس میں چھوٹی ی کوئی کام نہیں کر رہی ہے، فاضل محض ہے۔

تنسیخ بمعنی "منسوخ ہونا/کرنا"۔ یہ لفظ خالص اردو ہے، بدیں معنی کہ اردو والوں نے عربی مادہ ن س خ سے تفعیل کے وزن پر یہ لفظ بنا لیا ہے۔ "منتخب" اور "آنندراج" اور "دہخدا" میں اس کا اندراج نہیں ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں اس کو عربی بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ عربی نہیں ہے۔ "نور" اور پلیٹس کو بھی یہی دھوکا ہوا ہے۔ شیکسپیر میں یہ لفظ درج نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ہمارے یہاں بھی بہت پرانا نہیں ہوا ہے۔ بہر حال، اردو میں یہ بالکل صحیح ہے۔ صرف یہ خیال رہے کہ اس پر عربی کا گمان نہ کرنا چاہئے۔

توجہ عربی میں سوم مضموم ہے، اور اردو میں بھی یہی تلفظ عام ہے۔ لیکن لکھنؤ کے لوگ سوم مکسور بھی بولتے ہیں۔ اس کو لکھنؤ کا مقامی تلفظ کہنا چاہئے، اوروں کے لئے اس کا اتباع غلط ہے۔

توڑ مع واو مجہول، تیر اندازی کی اصطلاح میں (۱) اس فاصلے کو کہتے ہیں جہاں تک تیر اپنے نشانے کے اندر دھنس سکتا ہو، اور (۲) تیر کی قوت دخول۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ کو آج کے آتشی اسلحہ کی ضمن میں بھی برت سکتے ہیں:

اکثر تیر ہوائی جاتے تھے، یا ان میں زیادہ توڑ نہ رہ گیا تھا۔ (''آفتاب شجاعت''، جلد چہارم، از شیخ تصدق حسین، ص ۵۱۹)۔

جو تیر جاتا تھا دو دو تین تین کو گرا لیتا تھا۔ ایک تو کمان کا زور، دوسرے ہوا کی قوت، تیر کا توڑ چوگنا ہو گیا تھا۔ (''تورج نامہ''، جلد دوم، از شیخ تصدق حسین، ص ۷۵)

عام زبان میں ''توڑ'' کے معنی ہیں، کسی چیز یا صورت حال کا تدارک، کسی کی ترکیب یا تدبیر کو بے اثر کرنے والا کوئی کام، کسی خراب چیز کے اثر کو زائل کرنے والی کوئی چیز۔ مثلاً:

ان کی تدابیر کا توڑ میرے پاس ہے۔

افسوس کہ اس زہر کا کوئی توڑ نہیں۔

توسن بمعنی ''گھوڑا''، خاص کر شوخ اور چالاک گھوڑا۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

توقع ''توقع'' عمومی لفظ ہے، اس میں اچھا، برا، اور غیر جانب دار (یعنی عامۃ الورود) تینوں پہلو ہیں۔ لہٰذا یہ بڑی حد تک ''امکان'' کے معنی رکھتا ہے۔ مثلاً:

(۱) مجھے ان سے جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔

(۲) توقع ہے کہ اس بار وہ کامیاب نہ ہوگا۔

معنی کی شدت کے اعتبار سے ''توقع'' کے نیچے ''اندیشہ'' ہے، جس کے معنی ''خوف'' کے ہیں، اور توقع کے اوپر ''امید'' ہے، جو ہمیشہ اچھے معنی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل پر غور کیجئے:

(۱) آج بارش کی توقع ہے۔ (یعنی کہنے والے کے دل میں کوئی خوف یا امید یا تمنا نہیں ہے کہ بارش ہو۔ وہ صرف ایک اطلاع دے رہا ہے۔)

(۲) آج بارش کا اندیشہ ہے۔ (یعنی کہنے والے کے دل میں بارش کا خوف ہے۔)

(۳) آج بارش کی امید ہے۔ (یعنی کہنے والے کو بارش کی تمنا تھی اور آج اس کے پورے ہونے کا امکان ہے۔)

غالب کا شعر ہے ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یہاں ظاہر ہے کہ متکلم عمومی بات کہہ رہا ہے کہ مجھے نہ کسی سے کچھ اندیشہ ہے، نہ کسی سے کچھ امید ہے۔ یعنی میرے خیال میں اب کسی بات کا امکان ہی باقی نہیں، تو پھر کسی اچھی بات کے نہ ہونے یا کسی بری بات کے واقع ہونے کا گلہ کیوں ہو؟

ایک اور مثال:

(۱) امید ہے کہ مریض آج رات مر جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہاں عام حالات میں "اندیشہ" کا محل ہے۔ لیکن اگر کہنے والا شخص مریض کا دشمن ہے، تو "امید" کا محل ہے۔ اور اگر کہنے والے کو اس بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ مریض مرے یا بچ جائے، تو وہ کہے گا:

(۲) توقع ہے کہ مریض۔۔۔

توکل اس لفظ میں سوم مضموم مشدد ہے، بروزن "تکلف"، لیکن بعض لوگ اسے سوم مفتوح کے ساتھ بروزن "تولا" بولتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اسے عربی فقرے **تَوَکّلتُ علی اللہ** پر قیاس کرتے ہیں۔ تنہا "توکل" بولیں تو اس کا تلفظ "تولا" کے وزن پر، یعنی سوم مفتوح کے ساتھ ٹھیک نہ ہوگا۔ لیکن "اللہ توکل" میں "توکل" کا تلفظ سوم مفتوح کے ساتھ ہی درست ہے، کہ یہ اسی طرح رائج ہے۔ مثلاً: "مرتا کیا نہ کرتا، اللہ توکل نکل کھڑا ہوا۔" یہاں "توکل" کا تلفظ مع سوم مفتوح ہی درست ہے۔

تولائی اول دوم مفتوح، سوم مشدد، بمعنی "محبت رکھنے والا"۔ دیکھیے "الف"۔

تہنید بروزن تفعیل، دیکھیے "تارید"؛ "گھراتا"۔

تئیں آج کل "تئیں" کا چلن دوبارہ ہو رہا ہے۔ پچھلے لوگوں نے اسے متروک قرار دیا تھا، لیکن کسی لفظ کو متروک قرار دینا کسی کے اختیار میں نہیں۔ بولنے والے خود فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا لفظیں بولیں گے اور کیا نہیں۔ "تئیں" کا دوبارہ چلن میں آجانا اس کا ثبوت ہے۔

تیار بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی میں یہ لفظ نہیں ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ صاحب

''آنندراج'' نے صاف لکھا ہے کہ یہ لفظ فارسی میں ہے اور وہاں اس کے معنی ہیں، ''جلد رفتار، جہندہ، مواج''۔ یہ لفظ ''منتخب اللغات'' میں مذکور ہے، یعنی صاحب ''منتخب'' نے اسے عربی قرار دیا ہے۔ عربی میں اس کا مادہ ت ار ہے، اور ''تیار'' کے معنی ہیں ''سمندر کی تیز لہر، دھارا''۔ فارسی والوں نے غالباً یہیں سے ''جلد رفتار، جہندہ و سیل آب'' وغیرہ معنی بنائے۔ بہر حال، اب سوال یہ اٹھا کہ اس کے معنی ''مہیا''، ''کسی کام کے لئے مستعد، کسی کام پر آمادہ'' اردو میں کہاں سے آئے؟ فارسی میں تو اس معنی میں ''مہیا'' ہی آتا ہے، بیدل ؎

درون بیضہ طاؤسان رعنا　　　　بہ آہنگ پر افشانی مہیا

لہٰذا خان آرزو نے خیال ظاہر کیا کہ یہ لفظ دراصل ''طیار'' ہے، اور ''مہیا'' کے معنی میں یہ میر شکاروں کی اصطلاح ہے، کہ جب کوئی شکاری پرندہ گریز سے نکل کر شکار پر جھپٹنے یا اس پر حملہ کرنے کے لئے مستعد اور آمادۂ پرواز ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ ''جانور اب طیار ہے۔'' لیکن اردو والوں نے اس املا کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی رائے یہی رہی کہ یہ لفظ ''تیار'' ہے۔ شیکسپیر (Shakespear) مطبوعہ ۱۸۳۰ میں ''تیار'' کا اندراج کر کے لکھا ہے کہ یہ عربی ''طیار'' سے ہے۔ ڈنکن فاربس (Duncan Forbes) نے اپنے لغت میں ''تیار'' درج کر کے اسے ''طیار'' کی تصحیف لکھا ہے۔ اوحد الدین بلگرامی نے ''نفائس اللغات'' (تاریخ تالیف ۱۸۳۷ء) میں ''طیار'' درج کر کے لکھا ہے کہ یہ لغت عربی ہے، بمعنی ''پرندہ'' اور یہ لفظ ''اردوئے ہندی'' اور فارسی میں بمعنی ''مہیا، آمادہ'' استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد خان آرزو کی رائے منقول ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مہیا''، مستعد، آمادہ'' کے معنی میں لفظ ''تیار'' کو فارسی ''تیار'' بمعنی ''تیز رفتار، جہندہ، مواج'' کے قیاس پر بنایا ہوا مانیں تو، اور اگر اسے عربی ''طیار'' کی تصحیف مانیں تو، یہ بات بہر حال صاف ہے کہ اگر اسے کچھ لوگوں نے ''طیار'' لکھا ہے تو یہ لفظ انیسویں صدی کے شروع سے ہی ''تیار'' بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ اوحد الدین بلگرامی نے خان آرزو وغیرہ کی رائے جو لکھی ہے، وہ شاید اس زمانے میں علمائے لسان کی رائے رہی ہو۔ لیکن شیکسپیر اسے صاف صاف ''تیار'' لکھ رہا ہے۔ آج کے عمل کی روشنی میں یہی درست ہے۔ اسے ''طیار'' لکھنا غلط ہے۔ رہا یہ سوال کہ ''مہیا، آمادہ، مستعد'' کے معنی اس لفظ میں کہاں سے آئے؟ تو درست

جواب اغلباً یہی ہے کہ عربی معنی ''جلد رفتار، جہندہ'' پر اس کے یہ معنی بنالئے گئے۔ دیکھئے، ''طیار''۔

تیتری مع یائے معروف، ''تتلی'' کے معنی میں یہ لفظ اب عموماً پنجاب کی اردو میں سنا جاتا ہے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں تھا۔ اکبرالہ آبادی کی رباعی میں ہے ؂

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

تیلیاں واو مجہول، سیاہی مائل گہرا سرخ رنگ۔ یقین کا شعر ہے ؂

جلتے بلتوں سے نہ مل ان تیلیاں کپڑوں کے ساتھ

جی دھڑکتا ہے مبادا لگ اٹھے دامن کو آگ

''شرتی'' رنگ اس کا ٹھیک الٹا ہوتا ہے، یعنی سرخی مائل سیاہ۔ دیکھئے، ''شرتی''۔

تیندوا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ٹرمپ دیکھئے ''ترپ ہر''۔

ٹکٹ ہمارے یہاں لفظ Ticket کو علیٰ حالہٖ قبول کر لیا گیا ہے۔ ''ٹکٹ'' بمعنی ''ڈاک ٹکٹ'' کے لئے اردو میں لفظ ''ٹکڑا'' بولا جاتا تھا لیکن عام نہ ہوا اور بالآخر Postage stamp کے لئے ''ڈاک ٹکٹ'' اور پھر صرف ''ٹکٹ'' رائج ہو گیا۔ اور اب یہی درست ہے۔

ٹکڑا ''ٹکٹ'' بمعنی ''ڈاک ٹکٹ'' کے لئے اردو میں لفظ ''ٹکڑا'' بولا جاتا تھا لیکن عام نہ ہوا اور بالآخر Postage stamp کے لئے ''ڈاک ٹکٹ'' اور پھر صرف ''ٹکٹ'' رائج ہو گیا۔

ٹھپ ہو جانا ''رک جانا، بند ہو جانا'' کے معنی میں یہ فقرہ اردو میں صرف طنزیہ/مزاحیہ وغیرہ سیاق و سباق میں بولتے ہیں۔ ہندی کی نقل میں کچھ اردو کے لوگ اب اسے عام استعمال میں بھی برتنے لگے ہیں۔ ''رک جانا/ بند ہو جانا/ تھم جانا'' وغیرہ کے ہوتے ہوئے اس بھاری فقرے کی کوئی ضرورت نہیں۔

نامناسب اور فصیح: بجلی نہ ہونے کی جگہ کارخانے ٹھپ ہو کر رہ گئے۔

مناسب اور فصیح:۔۔۔ کارخانے ختم کر رہ گئے/ بند ہو کر رہ گئے/ کارخانوں میں کام رک گیا۔

نامناسب اور قبیح: سڑک زیر مرمت تھی، آمد و رفت ٹھپ ہوگئی۔

مناسب اور فصیح:۔۔۔ آمد و رفت رک گئی/ بند ہوگئی۔

ثفل دان دیکھیے: ''ثفل دان''۔

ثفل دان وہ برتن جو دسترخوان پر اس غرض سے رکھا جاتا ہے کہ اس میں چھوٹی ہڈیاں، یا منھ سے نکالی ہوئی کوئی چھوٹی چیز، مثلاً گول مرچ وغیرہ، رکھی جائے۔ اس لفظ کا تلفظ اور املا بحث طلب ہیں۔ پرانے لغات میں یہ نہیں ملتا، سب سے پہلے ''فرہنگ آصفیہ'' میں ملتا ہے۔ جناب عبدالرشید کے مطابق اس کا اندراج خان آرزو نے ''نوادر الالفاظ'' میں کیا ہے۔ لیکن عبدالرشید نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ خان آرزو نے ''پیک دان'' کو لغت بنا کر اس کے معنی لکھے ہیں کہ فارسی میں اسے ''ثفل دان'' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اندراج اور یہ معنی ہمارے مفید مطلب نہیں۔ صاحب ''آصفیہ'' نے اسے سین مہملہ اور فاے معجمہ سے ''سفل دان'' لکھا ہے، اسے عربی بتایا ہے، اور تلفظ حسب ذیل درج کئے ہیں: (۱) اول مضموم، دوم مکسور؛ (۲) اول مضموم، دوم ساکن؛ (۳) اول مکسور، دوم ساکن۔ ''نور اللغات'' میں اسے ثاے مثلثہ اور فاے معجمہ سے ''ثفل دان'' لکھا ہے، اور تلفظ میں اول دوم مضموم لکھے ہیں۔ لیکن صاحب ''نور'' نے ایک اور لغت انھیں معنی میں سین مہملہ اور فاے معجمہ کے املا، اور اول دوم مضموم کے تلفظ کے ساتھ ''سفل دان'' لکھا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں سین مہملہ اور فاے معجمہ سے ''سفل دان'' لکھا ہے، اور تلفظ (۱) اول مضموم، دوم ساکن؛ (۲) اول دوم مضموم؛ اور (۳) اول مضموم دوم مکسور بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ''اردو لغت'' میں جو اسناد درج کئے گئے ہیں ان میں اس لفظ کو سین مہملہ اور فاے معجمہ سے لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ کہنا ممکن نہیں کہ اصل متون میں سہو کتابت ہے، یا لکھا کچھ اور ہے لیکن ارباب ''لغت'' نے سہو کتابت فرض کر کے ہر جگہ قیاسی اصلاح کر کے ''سفل دان'' لکھ دیا ہے۔ یہ سب الجھاوے اس لئے پیدا ہوئے کہ صاحب ''آصفیہ'' نے اس لفظ کو عربی ''سفل'' [اول مضموم، دوم ساکن] سے قیاس کیا۔ لیکن عربی میں اس لفظ کے معنی ہیں، ''کسی چیز کا سب

سے نچلا حصہ۔'' صاحب'' آصفیہ'' نے ''سفل'' اور عربی کے ایک اور لفظ ''ثفل'' [اول مضموم، دوم ساکن] کو ایک ہی سمجھا۔ دراصل یہ الگ الگ لفظ ہیں، اور ''ثفل'' کے معنی ہیں ''تلچھٹ، فضلہ، بچی کھچی چیز۔'' صاحب ''نور'' نے عربی لفظ ''ثفل'' کو ٹھیک سمجھا، اور اس پر قیاس کر کے اردو لفظ کو ''ثفل دان'' لکھ دیا۔ صاحبان ''لغت'' نے صاحب'' آصفیہ'' کا اتباع کیا اور یہ غور نہ کیا کہ عربی ''سفل'' اور ''ثفل'' دو الگ الگ لفظ ہیں۔

دہلی میں یہ لفظ اول اور دوم مفتوح ہی کے ساتھ رائج ہے۔ میر باقر علی داستان گو کے ذکر میں محمد فیروز دہلوی نے میر باقر علی کے حوالے سے اس کی مختصر تفصیل درج کی ہے، لیکن املا سین مہملہ سے ''سقل دان'' لکھا ہے۔ شان الحق حقی نے ''فرہنگ تلفظ'' میں ''ثفل دان'' اول مضموم اور دوم ساکن درج کیا ہے، یعنی وہ ''نور'' کے ہم خیال ہیں۔ یہ تلفظ کہیں سنا نہیں گیا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ عربی لفظ ''ثقل'' (اول مکسور، دوم ساکن، بمعنی ''ثقالت، بھاری پن، بوجھل پن'') اور ''ثقیل'' (بمعنی ''بھاری، دیر ہضم'') سے بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ اردو میں مستعمل ہیں، اور ''ثقل'' کا عام تلفظ اول مکسور اور دوم مفتوح سے ہے، یا پھر اول مفتوح اور دوم ساکن سے۔ شیخ تصدق حسین کی داستان ''آفتاب شجاعت'' کے مطبوعہ نسخے میں یہ لفظ ''ثقل دان'' لکھا ملتا ہے۔ میں اسی املا کو مرجح سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اس کا درست تلفظ اول اور دوم مفتوح سے ہے:

> چنگیر دان، عطر دان، ثقل دان، اگال دان وغیرہ ظروف طلائی و نقرئی قرینے سے لگے ہوئے ہیں۔ (''آفتاب شجاعت''، جلد پنجم، حصہ دوم، ص ۲۱)۔

جناب عبدالرشید کی یہ بات بالکل درست ہے کہ فارسی میں ''ثفل دان'' بمعنی ''پیک دان'' ہے۔

ثلاثۂ غسالہ ''ثلاثہ'' اور ''غسالہ'' میں اول مفتوح ہے اور ''غسالہ'' میں س مشدد۔ شراب کے تین پیالے جو صبح کو خالی پیٹ بطور قبض کشا پئے جاتے ہیں۔ حافظ ؎

> ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

بعض لوگوں کو اس شعر میں ''ثلاثۂ غسالہ'' کے معنی سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اسی سلسلے کی اور اصطلاحوں کے لئے دیکھئے، ''خمسۂ ہاضمہ''، اور ''سبعۂ نائمہ''۔

ثور اول مفتوح، بمعنی ''بیل، سانڈ''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

جاب ''کام، نوکری''، اور کبھی کبھی ''مصروفیت'' کے معنی میں یہ لفظ انگریزی ہے۔ اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے ایک بھونڈے انگریزی لفظ کو ترجیح بلا وجہ اور بے ضرورت ہے۔ لیکن آج کل پاکستان میں، اور مغربی ملکوں میں بسے ہوئے اردو والوں کے یہاں یہ لفظ ''کام'' کے معنی میں بولا جانے لگا ہے۔ اور بعض لوگ تو اسے لکھنے بھی لگے ہیں۔ یہ برائی ابھی پھیلی نہیں ہے، اسے سختی سے مسترد کرنا چاہیے:

غلط اور قبیح: وہ جاب پر گئے ہیں۔

صحیح: وہ کام پر گئے ہیں/ دفتر گئے ہیں/ نوکری پر گئے ہیں/ آفس گئے ہیں۔

غلط اور قبیح: میرے بیٹے کو وہیں جاب بھی مل گیا ہے۔

صحیح: میرے بیٹے کو وہیں کام بھی مل گیا ہے/ نوکری بھی مل گئی ہے: ملازمت بھی مل گئی ہے۔

جا رہے/ جا رہی ان دنوں افعال ناقص اور صیغۂ ماضی کی بعض صورتوں کو اس طرح مسخ کر کے استعمال کیا جا رہا ہے کہ اردو کی بدنصیبی پر رنج ہوتا ہے کہ اسے ایسے وقت بھی دیکھنے تھے۔ حسب ذیل جملہ دونوں عیوب فعل ناقص اور صیغۂ ماضی کے غلط استعمال کے باعث حد درجہ قبیح و غلیظ ہے:

براتیوں کو لے جا رہی جیپ بس سے ٹکرائی۔

یہاں اور کچھ نہیں تو ''جاتی ہوئی'' اور ''ٹکرا گئی'' لکھنا چاہیے تھا۔ افسوس ہے کہ اردو جیسی سڈول اور کمل زبان کے ذمہ دار حضرات ایک چھوٹے سے جملے میں ایسی غلطیاں کریں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، ''مارے گئے''؛ ''ماضی کی بعض شکلیں''؛ ''ہوئے''؛ ''جا رہے''۔

جان کاری/ جانکاری ''اطلاع، معلومات، واقفیت'' کے معنی میں یہ لفظ کم پڑھے لکھے ہندی والوں کی اختراع ہے۔ اس سے معنی یا معنویت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اور یہ بھونڈا اور بدصورت الگ ہے۔ ''معلومات''؛ ''اطلاع'' کے معنی میں یہ لفظ پچپن ستاون برس پہلے ہندوستانی عیسائیوں کی زبان پر تھے۔ پھر اسے ہندی نے اپنا لیا، اور اب یہ غیر ضروری اور فضول لفظ اردو میں

بھی سنا جانے لگا ہے۔ اسے ترک ہونا چاہئے۔ اس کا ایک صرف اور بھی ہے، اور وہ بھی ہندی والوں کی اختراع ہے، کہ اسے "جانتے ہوئے" کے معنی میں بولا جائے:

غلط اور قبیح: میں اپنی جانکاری میں تو ایسا نہ ہونے دوں گا۔

صحیح: میں اپنے جانتے ہوئے تو۔۔۔

غلط اور قبیح: یہ بات میری جانکاری میں نہیں ہے۔

صحیح: یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔

جانوروں کے نام، اردو میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اردو میں جانوروں کے بیشتر نام مذکر بولے جاتے ہیں۔ مونث نام اگر ہیں بھی تو عموماً اسی وقت استعمال ہوتے ہیں جب وضاحت کرنی ہو کہ جانور کی مادہ مراد ہے:

اس جنگل میں شیر بہت ہیں [یعنی شیر من حیث النوع]۔

اس جنگل میں تین شیر اور پانچ شیرنیاں ہیں [یعنی نر اور مادہ کی الگ الگ تعداد]۔

ریچھ خطرناک بھی ہو سکتا ہے [یعنی کوئی ریچھ]۔

ریچھنی اپنے بچوں کو چاٹ چاٹ کر صاف کرتی ہے [یعنی مادہ ریچھ]۔

کتا وفادار جانور ہے [یعنی کتا من حیث النوع]۔

کتے کے مقابلے میں کتیا زیادہ تیز ہوتی ہے [یعنی من حیث الجنس]۔

جانے مانے "مشہور و معروف" کے مفہوم میں یہ فقرہ ہندی والوں کی غیر ضروری ایجاد ہے۔ اردو میں اسے نہ برتنا چاہئے۔

جاوے واؤ مفتوح۔ دیکھئے "رینگنا"۔

جاویں واؤ مفتوح۔ دیکھئے "رینگنا"۔

جاہلیت "جاہلیت" ایک اصطلاح ہے۔ اس سے عرب میں قبل ظہور اسلام و رسول اسلام کا زمانہ مراد ہے۔ "جہالت" (عربی میں اول مفتوح، اردو میں عام طور پر اول مکسور بولتے ہیں) کے معنی ہیں: "ناواقفیت"، "لہٰذا" جاہل ہونے کی کیفیت"۔ اردو میں ایک معنی اور تھے: "ضدی پن، اڑیل پن"۔ اب یہ معنی بہت شاذ ہیں۔

جائزہ عام طور پر اس لفظ کو "معائنہ"، "جانچ"، اور "پڑتال" کے معنی میں بولتے ہیں، خاص کر جب معائنہ، جانچ، یا پڑتال عمومی طور کی ہو۔ مثلاً "میں نے جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ مسودے میں خامیاں ہیں"، یا "سرسری جائزہ لیا گیا تو پتہ لگا کہ کئی کاغذات گم ہیں۔" لیکن دکن میں اسے "عہدہ یا ذمہ داری، یا ذمہ داری کو حاصل کرنے کی شہادت کے کاغذات" کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ مثلاً "انھوں نے کلکٹری کا جائزہ لیا"، یا "جائزہ سنبھالتے ہی ان کی توجہ سماجی اصلاحات کی طرف ہوئی۔" ان معنی میں یہ لفظ پہلے زمانے میں شمال میں بھی بولتے تھے۔ "ابن الوقت" میں ہے: "صاحب کلکٹر کو جائزہ دلوا کر نوبل صاحب کو تیسرے دن ولایت چلتا کیا۔" آج کے زمانے میں یہ لفظ ان معنی میں دکن کا مقامی محاورہ کہا جائے گا۔ یہ لفظ عربی میں "انعام" اور "صلہ" کے معنی میں مستعمل ہے۔ جدید اردو میں نہیں، لیکن پرانی اردو میں تھا۔ میر، دیوان دوم ؎

کیا لطف تھا سخن کا جب وے بھی صحبتیں تھیں
ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں

جاے فارسی میں "جا" کی جگہ "جاے" عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی میں کسی بھی لفظ کے آگے یاے تحتانی کا اضافہ حسب ضرورت کرسکتے ہیں۔ اردو میں "جاے" پہلے رائج تھا، اب شاذ ہو گیا ہے۔ لیکن یہ لفظ اتنا خوش آہنگ ہے کہ پھر مروج کیا جاسکے تو خوب ہوگا۔ میر، دیوان سوم ؎

جس جاے سراپا پہ نظر جاتی ہے اس کے
آتی ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

اور ذوق کا یہ شعر "لوٹنے" اور "جاے" کے سبب سے مشہور ہو گیا ؎

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پاے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاے ہے

واضح رہے کہ "لوٹنے" میں واو مجہول ہے۔ دیکھیے: "بلاے"؛ "دریاے"؛ "یاے زائدہ"۔

جتیانا اول مضموم معروف۔ دیکھیے: "گھبرانا"۔

جد و جہد عربی میں یہ لفظ حرف اول کے فتحہ یا ضمہ (جَد/جُد) سے اور حرف چہارم کے فتحہ یا ضمہ (جہَد/جہُد) سے بولا جاتا ہے۔ اردو میں بھی اول مکسور (جِد) اور چہارم مکسور (جہِد) بھی کبھی سنا گیا ہے، لیکن بولنے والوں کی اکثریت اب اول مفتوح (جَد) اور چہارم مکسور (جہِد) بولتی ہے۔ (پلیٹس نے اسے عامیانہ تلفظ بتایا ہے)۔ رواج عام کے مدنظر اردو کے لئے یہی تلفظ

درست ہے۔ بعض لوگ اول مضموم بولتے ہیں جو اردو کے لئے سراسر غلط ہے۔ بعض لوگ چہارم کو مضموم بولتے ہیں۔ یہ عربی میں تو ہے لیکن نامانوس ہے۔ اردو میں تو اس کا گذر ہی نہیں۔ اگر کوئی بولتا ہے تو وہ اردو کا گویا مذاق اڑاتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ ''جہد'' میں ہائے ہوز ساکن ہے، عام بول چال میں بھی یوں ہی ہے۔ اسے ہائے ہوز متحرک کے ساتھ نہ بولنا چاہئے۔

جراحت عربی میں اول مکسور ہے، لیکن اردو میں اول مفتوح بولتے ہیں اور اردو کے لئے یہی درست ہے۔

جرہ اول مضموم، دوم مفتوح مشدد، ایک شکاری چڑیا۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

جریدہ آج کل ''جریدہ'' اور ''رسالہ'' اس اعتبار سے ہم معنی ہیں کہ دونوں سے ہم ایسا اخبار یا کتاب مراد لیتے ہیں جس میں مختلف اصناف پر مبنی تحریریں ہوں اور جو کسی مقررہ وقفے سے نکلتا ہو۔ ''جریدہ'' اب ذرا کم سنائی دیتا ہے۔ ''رسالہ'' کے اور بھی معنی ہیں، مثلاً (۱) فوجیوں کا دستہ (۲) کوئی مختصر کتاب جو ایک ہی موضوع پر ہو۔ ''جریدہ'' کے اصل معنی ''تنہا'' ہیں۔ چونکہ رسالہ یا اخبار کا بھی ایک ایک شمارہ مقررہ وقت پر نکلتا ہے اس لئے ''رسالہ، اخبار'' کے معنی بھی پیدا ہو گئے۔ ''جریدہ'' بمعنی ''تنہا'' اب بہت کم سننے میں آتا ہے۔ ''صفحہ'' کے معنی میں، اور ''فوجی دستہ'' کے معنی میں بھی ''جریدہ'' پہلے بولا جاتا تھا۔ اب ''جریدۂ عالم'' کی ترکیب (غالباً حافظ کے ایک شعر کی وجہ سے) ہی مستعمل نظر آتی ہے۔ اکیلے ''جریدہ'' بمعنی ''صفحہ'' شاذ ہے، اور بمعنی ''فوجی دستہ'' بالکل مستعمل نہیں۔

جڑا ہوا اردو میں اس کو ''ملحق'' ، یا ''متعلق'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''ان کا مکان میرے مکان سے جڑا ہوا ہے۔'' یا ''اس مسئلے سے جڑا ہوا ایک معاملہ اور ہے۔'' ہندی والے اسے ''منسلک'' کے معنی میں بولنے لگے ہیں۔ مثلاً ''وہ ان دنوں ساہتیہ سے جڑے ہوئے ہیں۔'' یا، ''میں ان دنوں سماج کلیان سے جڑا ہوا ہوں۔'' ہندی کی دیکھا دیکھی ہم لوگ بھی اس کو برتنے لگے ہیں، حالانکہ ''منسلک''، کے ہوتے ہوئے ''جڑا ہوا'' کہنے کی ضرورت نہیں۔

''جس'' اور ''جو'' بطور حرف اشارہ انگریزی میں Which, اور That اور Who, Whose, Whom وغیرہ کا استعمال طویل جملے کے مختلف ٹکڑوں کو آسانی اور

خوبصورتی سے جوڑنے میں مدد کرتا ہے۔ اردو میں "جس" اور "جو" معنوی اعتبار سے That اور Which وغیرہ کا ہی حکم رکھتے ہیں، لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ اردو کا آہنگ اور نحوی نظام چھوٹے چھوٹے جملوں کے مذاق کا ہے، کئی کئی ٹکڑوں والے جملے جنھیں "جو/جس" سے جوڑ باندھ کر رکھا گیا ہو، اردو کا مزاج نہیں۔ انگریزی میں حسب ذیل طرح کا جملہ ممکن ہے، اور بے عیب کہا جائے گا۔

The boy who stood at the gate which divided the property which was owned by John with the land whose owner was George who was at present in India, a country about which the boy who stood at the gate knew very little because the school to which the boy went was only a Grammar School and not one that was a Public School, who was only twelve years old, who had lost his father who was employed on a ship which was owned by the boy's uncle who had set up a shipping company that ran ten ships, of which one was made entirely of teak, which is a wood which is not found in England and where it costs ten pounds to the yard which is equal to about eight hundred rupees Indian, was obliged to go to his uncle who owned the ship.

اگر چہ مندرجہ بالا عبارت بے لطف ہے (بشرطیکہ پیروڈی نہ ہو)، لیکن ہم اسے بخوبی پہچان اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ انگریزی کی عبارت ہے۔ اب اردو میں اس کا لفظی ترجمہ ملاحظہ ہو:

"وہ لڑکا، جو اس پھاٹک پر کھڑا تھا، جو اس آراضی کو، جس کا مالک جان تھا، اس آراضی سے الگ کرتا تھا جس کا مالک جارج تھا اور جو اس وقت ہندوستان میں تھا، ایسا ملک، جس کے بارے میں وہ لڑکا جو پھاٹک پر کھڑا تھا، بہت کم جانتا تھا، کیوں کہ وہ جہاں پڑھتا تھا وہ صرف ایک گرامر اسکول تھا، کوئی پبلک اسکول نہ تھا، صرف بارہ سال کا تھا اور جو اپنے باپ سے محروم ہو چکا تھا جو ایک جہاز پر ملازم تھا جس کا مالک اس لڑکے کا چچا تھا جس نے دس سال ہوئے ایک کمپنی قائم کی تھی جس کے دس جہاز چلتے تھے جن میں ایک پورا پورا ساگون کا بنا ہوا تھا جو ایسی لکڑی ہے جو انگلستان میں نہیں ملتی اور جس کی قیمت وہاں دس پونڈ فی گز ہے جو کوئی آٹھ سو ہندوستانی روپے

کے برابر ہے، اس بات پر مجبور تھا کہ اپنے چچا کے پاس جائے جو جہاز کا مالک تھا۔"

یہ عبارت کس قدر بوجھل اور اکھڑی اکھڑی ہوئی ہے، کہنے کی ضرورت نہیں۔ حرف اشارہ کا ایسا اور اتنا استعمال اردو کے مزاج کے خلاف ہے۔ لیکن بسا اوقات، اور خاص کر اخبار نویسوں اور سرکاری رپورٹ لکھنے والوں کو، ایسی عبارت لکھنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے جہاں "جو" اور "جس" کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سے ممکن احتراز کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر عمل کرنا چاہئے:

(۱) جملوں کو حتی الامکان مختصر رکھیں۔ "جو/جس" وغیرہ لگانے کے بجائے جملہ چھوٹا رکھیں اور اگلا جملہ "اس/وہ" وغیرہ سے شروع کریں۔

(۲) فعل مجہول سے حتی الامکان گریز کریں۔ فعل معروف کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔ دیکھئے، "فعل مجہول"۔

(۳) اگر کسی مجبوری کے باعث فاعل اور فعل کے درمیان فاصلہ بڑھ جائے تو فعل کے پہلے "اس" یا کوئی مناسب لفظ لگائیں۔ مثلاً:

نامناسب: زید، جس کے بچے گھر پر نہیں تھے، نے کہا کہ میں ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔

مناسب: زید، جس کے بچے گھر پر نہیں تھے، اس نے کہا۔۔۔

انسب تو یہ ہے کہ جملہ یوں بنایا جائے:

انسب: زید کے بچے گھر پر نہیں تھے۔ اس نے کہا۔۔۔

لیکن اگر "جس" کا استعمال کسی بنا پر ناگزیر ہو تو "جس۔۔۔۔۔نے۔۔۔" کی جگہ "جس۔۔۔اس نے۔۔۔" لکھیں۔

جگنو یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

جمع، انگریزی الفاظ کی انگریزی الفاظ، خواہ دخیل ہوں یا غیر دخیل، جب جمع کی صورت میں لائے جائیں گے تو جمع اردو ہی کے قاعدے کی ہوگی، انگریزی قاعدے کی نہیں۔ علامہ کیفی نے عمدہ بات کہی ہے کہ اول تو یہی کیا کم زیادتی ہے کہ انگریزی کا لفظ اردو میں لایا

جائے، چہ جائے کہ اس کی جمع بھی انگریزی طور پر بنائی جائے۔ دیکھئے: ''انگریزی الفاظ اردو میں''۔

جمع، عربی الفاظ کی بے جان اسما کی جمعیں عربی میں تو مونث ہیں، لیکن اردو والوں نے کسی وجہ سے ان میں سے اکثر کو مذکر مان لیا۔ اس پر لطف یہ کہ ایسے الفاظ کے ساتھ جو عربی اسمائے صفت و اشارہ لائے گئے وہ عربی قاعدے کے پابند رہے اور مونث ہی رہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ''حالات'' مذکر ہے، لیکن ہم ''حالات حاضرہ'' اور ''حالات سابقہ'' اور ''موجودہ حالات'' کہتے ہیں۔ ''حاضرہ'' اور ''سابقہ'' اور ''موجودہ'' تینوں مونث ہیں۔

(۲) ''اشعار'' مذکر ہے، لیکن ہم ''محولہ بالا اشعار'' اور ''اشعار منقولہ ذیل'' وغیرہ کہتے ہیں۔ ''محولہ'' اور ''منقولہ'' دونوں مونث ہیں۔

(۳) ''اخبار'' مذکر ہے، لیکن ہم ''اخبار جدیدہ'' کہتے ہیں، یعنی ''تازہ خبریں''۔ ''جدیدہ'' مونث ہے۔ اور اگر ''اخبار'' بمعنی Newspaper ہو، جو مذکر ہے، تو بھی ہم ''اخبارات جدیدہ'' لکھتے ہیں۔

(۴) ''اسما'' اور ''نقوش'' دونوں مذکر ہیں، لیکن ہم ''اسمائے حسنیٰ'' اور ''نقوش جدیدہ'' کہتے ہیں ''حسنیٰ'' اور ''جدیدہ'' دونوں مونث ہیں۔

(۵) ''ورق'' مذکر ہے ج: ''اوراق'' بھی مذکر ہے۔ لیکن ہم ''اوراق سابقہ'' کہتے ہیں۔ ''سابقہ'' مونث ہے۔

بعض بعض اسما کے ساتھ بعض صفات اب کبھی کبھی مونث بھی بولی جانے لگی ہیں: اخبار ماضی، اخبار صحیح، اشعار سابق، اوراق منتشر، وغیرہ۔ لیکن اچھا یہی ہے کہ ابھی مونث صفت ہی استعمال کی جائے۔ یعنی اخبار ماضیہ، اخبار صحیحہ، اشعار سابقہ اور منتشرہ وغیرہ کہا جائے۔

یہ ضرور ہے کہ آہستہ آہستہ بعض عربی جمعوں کی جنس مونث بولی جانے لگی ہے اور بعض جمعیں دونوں طرح رائج ہیں یعنی مونث بھی اور مذکر بھی۔ موجودہ صورت حال کی روشنی میں اگر عربی بے جان اسما کی جمعیں اردو میں مذکر بولی جائیں تو اصولاً غلط نہ ٹھہریں گی۔ بعض استعمالات

کو آپ خلاف محاورہ کہہ سکتے ہیں، بعض کو آپ خلاف محاورہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ بعض کو آپ صرف مذکر ہی بول سکیں گے۔ مثلاً یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

مذکر: ادوار، اکابر، حالات، حدود، خزائن، دلائل، رموز، شدائد، شکوک، علائم، عنادل، فضائل، کیفیات، مسائل، مستثنیات، مصائب، مناقب، نتائج، نقوش وغیرہ۔

مذکر/مونث دونوں صحیح: آیات، ادعیہ، اقوام، تدابیر، تصاویر، تعلیمات، تفصیلات، طبائع، قیود، معلومات، منازل وغیرہ۔

مونث: ادویہ، تراکیب، ترغیبات، تکالیف، خیرات، شکایات، وغیرہ۔

جمع، نون پر ختم ہونے والے الفاظ کی نون پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمع کا معاملہ عموماً قیاسی ہے، یعنی اس کے قاعدے بنے ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سوال کا فیصلہ سماعی نوعیت کا ہے کہ کسی لفظ کے آخر میں نون غنہ فرض کیا جائے کہ نون معلن۔

(۱) وہ لفظ جو نون پر ختم ہوتے ہیں ان میں نون کے پہلے الف/ واو/ ی نہ ہو، بلکہ کوئی اور حرف ہو تو اس لفظ کی جمع بنانے کے لیے آخری نون پر واو نون غنہ بڑھایا جائے گا۔ کبھی کبھی نون غنہ کے پہلے ہائے دوچشمی بھی لگائی جاتی ہے: ان/ انھوں: گہن/ گہنوں: چمن/ چمنوں: چرن/ چرنوں۔

(۲) جن لفظوں میں آخری نون کے پہلے الف ہے، ان کی جمع بنانے کے لیے بھی نون پر واو نون غنہ کا اضافہ کیا جائے گا: کان/ کانوں: امتحان/ امتحانوں: جان/ جانوں۔

(۳) جن لفظوں میں آخری نون کے پہلے ''واو'' ہے، وہاں بھی جمع بنانے کے لیے نون پر واو نون غنہ کا اضافہ کیا جائے گا: قانون/ قانونوں: خاتون/ خاتونوں: مرہون/ مرہونوں۔

(۴) جن لفظوں میں آخری نون کے پہلے ''ی'' ہے، وہاں بھی جمع بنانے کے لیے نون پر واو نون غنہ کا اضافہ کیا جائے گا: حسین/ حسینوں: تین/ تینوں: نین [یائے مجہول] / نینوں۔

(۵) جو لفظ الف نون/ ی نون پر ختم ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ ان میں سماعی طور پر نون کو غنہ قرار دیتے ہیں کہ معلن۔ اگر معلن قرار دیتے ہیں تو جمع بناتے وقت

نون قائم رہے گا: جواں / جوانوں: آسماں / آسمانوں: پیکاں / پیکانوں / درماں / درمانوں: عنبریں / عنبرینوں: تمکیں / تمکینوں: جہاں / جہانوں۔ اور اگر سماعی طور پر آخری نون کو غنہ قرار دیتے ہیں تو نون غنہ کی جگہ ہمزہ لگا کر پھر نون غنہ بڑھائیں گے: خزاں / خزاؤں: کہکشاں / کہکشاؤں: رواں [بمعنی ''جان، روح''] / رواؤں: نیساں / نیساؤں: ماں / ماؤں۔

(۶) ملحوظ رہے کہ ''ماں'' کی جمع ''ماؤ'' غلط ہے۔ ''ماؤ'' ندائیہ ہے۔ اس طرح کے الفاظ میں ندائیہ اس طرح بنتا ہے کہ جمع کے آخری نون غنہ کو ساقط کر دیتے ہیں: آدمی، جمع آدمیوں، ندائیہ، آدمیو: ماں، جمع ماؤں، ندائیہ، ماؤ: بہن، جمع بہنوں، ندائیہ، بہنو: شہر، جمع شہروں، ندائیہ، شہرو۔

(۷) بہت سے لفظ ایسے ہیں جن میں آخری حرف الف اور اس کے فوراً پہلے کا حرف نون ہے۔ یہاں جمع بنانے میں الف حذف کر کے واؤ نون غنہ کا اضافہ ہوگا: کھانا / کھانوں: گانا / گانوں: کانا / کانوں: گنا / گنوں۔ یہاں بہت سے سماعی مستثنیات ہیں: نانا / ناناؤں: انا / اناؤں: دانا [بمعنی ''عقل مند''] / داناؤں: وغیرہ۔ ایسے زیادہ تر الفاظ یا تو غیر زبانوں سے آئے ہیں یا وہ رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۸) بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا آخری حرف ہائے ہوز اور آخری سے پہلا حرف نون ہے۔ ایسی صورت میں ہائے ہوز حذف ہوگا اور پھر واؤ نون غنہ کا اضافہ ہوگا: نمونہ / نمونوں: آئینہ / آئینوں: نگینہ / نگینوں: دانہ / دانوں: خزانہ / خزانوں۔ لیکن مونث الفاظ میں آخری حرف (ہائے ہوز) کو الف فرض کر لیتے ہیں، فیض ع

کتنی مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم

انھوں نے فرض کیا ہے کہ ''حسینہ'' میں ہائے ہوز الف کی طرح ہے، یا پھر ''انا'' پر قیاس کیا ہے کہ اگر ''انا'' کی جمع ''اناؤں'' ہے تو ''حسینہ'' کی بھی جمع ''حسینوں'' نہ ہوگی۔
مزید دیکھیے: ''جمع، ہائے ہوز پر ختم ہونے والے الفاظ کی''؛ ''ہائے مختفی''۔

جمع، ہائے ہوز پر ختم ہونے والے الفاظ کی

یہاں عام اصول یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ ہائے ہوز، جو لفظ کے آخر میں ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ اگر وہ ہائے مختفی کی نوعیت رکھتا

ہے تو اس لفظ کی جمع بناتے وقت ہائے مختفی حذف ہو جائے گی:

پردہ/ پردوں: جذبہ/ جذبوں: سایہ/ سایوں: علاقہ/ علاقوں: مردہ/ مردوں

مشکل وہاں ہوتی ہے جہاں آخری ہائے ہوز کی نوعیت کے بارے میں کلام ہو سکتا ہے کہ وہ ہائے مختفی ہے یا ہائے اصلی۔ مثلاً نیر مسعود نے لکھا ہے، افسانہ ''جانشین'':

چچا کے پاس اس طرح کی مریضائیں بہت لائی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں، کیوں کہ ''مریضہ'' کا آخری حرف ہائے مختفی کی نوعیت کا ہے اور جمع بناتے وقت اس کا حذف لازم ہے۔ اگر ''مریضہ/ مریضائیں'' کو درست مانا جائے تو ''آئینہ'' کی جمع ''آئیناؤں''، اور ''تکیہ'' کی جمع ''تکیاؤں'' بھی درست ماننی ہوگی۔ بے تکلف، غیر رسمی گفتگو کی بات اور ہے، لیکن محتاط تحریر و تقریر میں حسینہ/ حسینوں، مریضہ/ مریضوں ہی مرجح ہے۔ لیکن یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اس طرح کے بہت سے مونث الفاظ کی جمع یوں بناتے ہیں گویا ان کا آخری حرف ہائے ہوز نہیں بلکہ الف ہو۔ مثلاً:

خادمہ/ خادماؤں: خالہ/ خالاؤں: داشتہ/ داشتاؤں: شاعرہ/ شاعراؤں: فاحشہ/ فاحشاؤں: قحبہ/ قحباؤں: مالکہ/ مالکاؤں: ملازمہ/ ملازماؤں

''معشوقہ'' کی جمع ''معشوقوں'' اور ''معشوقاؤں'' دونوں دیکھی گئی ہے۔ لیکن میں ''معشوقوں'' کو ترجیح دوں گا۔ یہی کیفیت ''محبوبہ/ محبوبوں'' کی ہے، ''محبوبوں'' کو ''محبوباؤں'' پر فوقیت ہے۔ دہلی میں ''شیعہ/ شیعاؤں'' بولتے ہیں۔ یہ صرف دہلی کا علاقائی صرف مانا جائے گا۔

جمعیت بمعنی ''گروہ، بھیڑ''۔ ملحوظ رہے کہ یہ لفظ بروزن مفعول (جم + عی + یت) ہے۔
اقبال ؎

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

بعض لوگ ''جمعیت'' بروزن فعولن کہتے ہیں۔ یہ غالباً ''جمیعاً'' (بمعنی ''پورا پورا'') کی غلط فہمی سے بنایا گیا ہے۔ بول چال میں شاید ''جمیعت'' بروزن فعولن چل جائے لیکن تحریر میں اس سے احتراز واجب ہے۔

جملہ اچھالنا بمعنی ''فقرہ چست کرنا'' اردو میں نہیں ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اس سے احتراز

بہتر ہے۔

جملہ پھینکنا بمعنی ''فقرہ چست کرنا'' اردو میں نہیں ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اس سے احتراز بہتر ہے۔

جملہ چست کرنا بمعنی ''فقرہ چست کرنا'' درست ہے۔

جملہ سر کرنا بمعنی ''فقرہ چست کرنا'' اردو میں نہیں ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اس سے احتراز بہتر ہے۔

جملہ کسنا بمعنی ''فقرہ چست کرنا'' درست ہے۔

جمیعت بروزن فعولن۔ یہ لفظ درست نہیں ہے۔ دیکھئے ''جمعیت''۔

جنابہ صاحب ''آصفیہ'' نے اسے ''صاحبہ'' کا مرادف لکھا ہے جو عجیب بات ہے۔ یہ لفظ ''جناب'' کی تانیث نہیں ہے، بلکہ تعظیم ظاہر کرنے کے معنی میں یہ لفظ ہے ہی نہیں۔ بعض پرانے لوگوں نے اسے رکیک اور بازاری لفظ کہا ہے۔ اس سے مکمل احتراز کرنا چاہئے۔

جنت الحمقا فارسی عربی میں نہیں ہے، اردو میں Fools' Paradise کا ترجمہ کر لیا گیا ہے۔ ''حمقا'' یہاں سیدھے الف ہی سے لکھا جائے گا، الف مقصورہ سے نہیں۔ ''حمقا'' میں اول مضموم اور دوم ساکن ہے۔

جنت الماویٰ اگرچہ ''ماویٰ'' اب اردو میں سیدھے الف سے ''ماوا'' لکھا جاتا ہے، لیکن ''جنت الماویٰ'' ابھی الف مقصورہ ہی سے درست ہے۔

جنس، غیر زبانوں کے الفاظ کی غیر زبان کے الفاظ کی جنس عام طور پر یوں طے کرتے ہیں کہ اپنی زبان میں اس لفظ کے متبادل لفظ کی جو جنس ہوتی ہے اسے ہی غیر زبان کے لفظ پر جاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

آنکھ، مونث؛ چشم، مونث

باؤ، مونث؛ ہوا، مونث

پریت، پیت، مونث؛ محبت، مونث

پریم، موہ، مذکر؛ عشق، مذکر

پوتھی، مونث: کتاب، مونث

پتہ، مذکر: برگ، مذکر

پھول، مذکر: گل، مذکر

دھیان، مذکر: خیال، مذکر

ٹونا، مذکر: جادو، سحر، مذکر

ڈر، مذکر: خوف، مذکر

گھر، مذکر: مکان، مذکر

گیان، مذکر: علم، مذکر

لاج، مونث: شرم، مونث

انگریزی الفاظ کی بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً:

گاڑی، مونث: ٹرین، مونث

وقت، مذکر: ٹائم، مذکر

وغیرہ۔ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے، لیکن عمومی اصول کے طور پر یہ صحیح ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری زبان میں انگریزی کے زیادہ تر لفظ اتنے پرانے نہیں ہوئے ہیں کہ ان سب کی جنس پر سب کا اتفاق ہو جائے۔ لیکن آہستہ آہستہ اتفاق ہو بھی رہا ہے۔ مثلاً Car اور Motor کو پہلے مذکر مونث دونوں بولتے تھے۔ لیکن اب Car بالاتفاق مونث ہے۔ اور Motor اگر 'کار' کے معنی میں ہے تو مونث ہے، اور کسی چیز کو چلانے والی مشینی چیز کے معنی میں ہے، تو مذکر ہے۔ لیکن کئی الفاظ کے بارے میں ابھی اتفاق نہیں ہے۔ ناول، کلاس، سگریٹ، ایسے ہی الفاظ ہیں۔ ان تینوں کو لوگ الگ الگ طرح بولتے ہیں۔ بہر حال، تجربے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اکثر لوگ انھیں حسب ذیل طور سے بولتے ہیں:

ناول: مذکر۔ (مونث بھی سننے میں آتا ہے، خاص کر جنوب اور بہار میں، لیکن بہت کم۔)

کلاس: مذکر، مونث۔ (یعنی اسے دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی شخص اسے مذکر بولے گا اور پھر کسی اور موقعے پر اسے مونث بول دے گا۔ اگر بہت چھان بین کی جائے تو

گلاس کو مذکر کہنے والے شاید کچھ اکثریت میں ہوں گے۔)

سگریٹ: مونث، مذکر۔ (لیکن اکثریت مونث بولنے والوں کی ہے۔)

جنمنا

بمعنی ''پیدا ہونا، جنم لینا، متولد ہونا''، یہ لفظ ہندی والوں کی ایجاد ہے۔ جیسا کہ ہم ''ہوئے، ہورہے'' وغیرہ کی بحث میں دیکھیں گے، ہندی میں فعل مجہول کی طرف غیر ضروری رجحان اور ایک غلط صرف کے رواج پا جانے کی وجہ سے حسب ذیل طرح کے جملے بنائے جانے لگے ہیں:

(۱) مرزا پور میں جنمے گوبند بابو کا انتقال بنارس میں ہوا۔

(۲) یہ سمیا نئے یگ کی کوکھ سے جنمی ہے۔

(۳) وہ اگر نہ جنمتا تو یہ دکھ کہاں سے بھوگتا۔

ان تمام جملوں میں ''جنمنا'' کے نقلی مصدر نے عبارت کو مجروح اور غلط کر دیا ہے۔ پہلے جملے پر غور کریں تو اولین بات یہ نظر آتی ہے کہ ہندی میں فعل مجہول کے رجحان نے ''جنمنا'' کو جنم دیا ہے۔ حسب ذیل جملہ دیکھیے:

(۱) گوبند بابو جو مرزا پور میں جنمے تھے، بنارس میں مرے۔

یہ جملہ ہندی والوں کے یہاں خلاف فیشن ہے، کیوں کہ وہ فعل مجہول کا استعمال بیش از بیش کرتے ہیں۔ وہ اسے یوں لکھیں گے:

(۲) مرزا پور میں جنمے گوبند بابو کا دیہانت بنارس میں ہوا۔

اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جائے گا:

(۳) گوبند بابو جو مرزا پور میں پیدا ہوئے تھے، بنارس میں فوت ہوئے/ جاں بحق تسلیم ہوئے/ جہان فانی سے رخصت ہوئے، وغیرہ۔

یا پھر ہمارا جملہ حسب ذیل ہوگا:

(۴) گوبند بابو مرزا پور میں پیدا ہوئے/ متولد ہوئے۔۔۔

یا ہمارا جملہ حسب ذیل ہوگا:

(۵) مرزا پور میں متولد گوبند بابو۔۔۔

دوسرے ہندی جملے جنھیں اوپر پیش کیا گیا ہے، وہ اردو میں اس طرح لکھے جائیں گے:

(۶) یہ مسئلہ نئے زمانے نے پیدا کیا ہے۔

(۷) وہ اگر پیدا نہ ہوتا تو یہ دکھ کہاں بھوگتا / اسے یہ دکھ کہاں برداشت کرنے پڑتے۔

ملحوظ رہے کہ جملہ نمبر دو کی ہندی شکل میں لفظ ''کوکھ'' استعمال کیا گیا ہے جو اردو کے اعتبار سے قطعی غیر ضروری ہے۔ اردو میں ''کوکھ'' کا لفظ الگ سے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ مقررہ فقروں یا روزمروں میں اس کا استعمال زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، اور بعض اوقات تو اس کے بغیر ہی کام چل جاتا ہے:

نامناسب اور قبیح: جدید شاعری صارفیت کی کوکھ سے جنمی ہے۔

مناسب: جدید شاعری نے صارفیت سے جنم لیا ہے / یہ صارفیت ہی ہے جس نے جدید شاعری کو پیدا کیا ہے۔

نامناسب اور قبیح: تاریخ کی کوکھ سے کئی انقلابات پیدا ہوئے ہیں۔

مناسب: تاریخ نے کئی انقلابات کو جنم دیا ہے / تاریخ نے کئی انقلابات پیدا کئے ہیں۔

نامناسب اور قبیح: ایڈس کی بیماری جنسی بے راہ روی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔

مناسب: ایڈس کی بیماری جنسی بے راہ روی کے باعث پیدا ہوئی ہے۔

''کوکھ ٹھنڈی رہنا / ہونا؛ کوکھ جلی؛ کوکھ کا پیدا'' وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر سب ٹھیک ہیں۔ مشکل صرف وہاں ہوتی ہے جہاں لفظ ''کوکھ'' [جس میں ایک خاص تہذیبی اور معاشرتی کیفیت ہے] غیر ضروری طور پر برتا جائے، جیسا کہ آج کل دیکھنے میں رہا ہے۔ غلط موقعے پر استعمال کئے جائیں تو لفظ اپنی معنویت اور قوت کھو دیتے ہیں۔

جوڑے، الفاظ کے دیکھئے: ''الفاظ کے جوڑے''۔

جوڑے، گنتیوں کے دیکھئے: ''گنتیوں کے جوڑے''۔

جوہر انگریزی لفظوں Atom اور Atomic کے لئے ''جوہر'' اور ''جوہری'' بنائے گئے جو بہت مناسب لفظ ہیں۔ کم از کم تحریر کی حد تک انھیں ضرور استعمال میں رہنا چاہئے۔

جوہری دیکھئے: ''جوہر''۔

جہالت عربی میں اول مفتوح ہے، لیکن اردو میں عموماً اول مکسور کے ساتھ بولتے ہیں، اور یہی اب مرجح ہے۔ شان الحق حقی نے اول مفتوح لکھا ہے۔ اسے دہلی کا مقامی تلفظ کہنا چاہیے۔ دیکھیے، ''جاہلیت''۔

جھرنا دیکھیے، ''آبشار''۔

جی ''جی'' اور ''دل'' مترادف الفاظ ہونے کے باوجود کچھ فرق بھی رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان میں سچے اور پکے مترادفات کا وجود نہیں ہوتا۔ ہر لفظ اپنے خواص رکھتا ہے۔ پھر تاریخ اور رواج کا معاملہ الگ ہے۔ مثلاً لفظ ''جی'' کو پہلے ''جان'' کے بھی معنی میں استعمال کرتے تھے، اب یہ معنی رائج نہیں۔ ''جی'' بمعنی ''طبیعت، مزاج'' (آپ کا جی کیسا ہے؟ ان کا جی اچھا نہیں) بھی اب بہت کم بولتے ہیں۔ ''جی میں ٹھاننا'' اور ''دل میں ٹھاننا'' دونوں ٹھیک ہیں، لیکن ''جی ٹوٹ گیا'' ٹھیک نہیں، ''دل ٹوٹ گیا'' ٹھیک ہے۔ ہمت ہار جانے کے معنی ''دل چھوٹ گیا'' پہلے بولتے تھے، اب نہیں بولتے۔ لیکن ''جی چھوٹ گیا'' بالکل رائج ہے۔ ''میں نے اپنے دل میں کہا'' بالکل ٹھیک ہے، لیکن ''میں نے اپنے جی میں کہا'' ٹھیک نہیں۔ ''یہ بات میں نے اپنے دل سے نکالی ہے'' کے ایک معنی ہیں: ''یہ بات میری طبع زاد ہے''۔ یہ معنی ''یہ بات میں نے اپنے جی سے نکالی ہے'' میں اب رائج نہیں۔ ''یہ بات میرے جی کو پسند ہے'' اب نہیں بولتے، پہلے رائج تھا۔ اب اس کی جگہ ''دل کو پسند'' بولتے ہیں۔

''دل'' اور ''جی'' میں فرق کے موضوع پر ایک پورا رسالہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک سامنے کی بات یہ ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ جو محاورہ یا روز مرہ لفظ ''دل'' سے بنا ہو، اس میں ''دل'' کی جگہ ''جی'' رکھ دیں اور معنی یا محاورہ پھر بھی وہی رہیں۔ مثلاً ''دل ہارنا'' کے معنی ہیں: کسی پر عاشق ہونا، لیکن ''جی ہارنا'' کے معنی ہیں: ہمت کا جواب دے جانا۔ دوسری بات یہ کہ ''دل کی بیماری'' بمعنی ''عارضۂ قلب'' ٹھیک ہے، لیکن یہاں ''جی کی بیماری'' نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا ایک اصول یہ ہے کہ جہاں ''دل'' کو عضو بدن کے معنی میں استعمال کیا جائے وہاں ''جی'' نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر یہ دو اصول مدنظر رہیں تو مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

جیب اول مفتوح، بمعنی ''گریبان''، یہ مذکر ہے۔ یائے مجہول کے ساتھ ''جیب'' بمعنی

Pocket، یہ مونث ہے۔ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔ ''جیب'' مع اول مفتوح کی جنس کے بارے میں شک رہا ہے۔ عام لغات میں ایسی سند نہیں ملتی جس سے اس کی جنس ثابت ہو سکے۔ غالب کا شعر ہے ؎

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ہمارے جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

اس شعر کو ''جیب'' بمعنی گریبان کی تذکیر کے سند ماننے میں بعض کو تامل ہے، کہ غالب نے شاید ''ہماری جیب'' لکھا ہو، کیونکہ پرانے زمانے کی تحریر میں یائے معروف اور مجہول کا فرق نہیں کرتے تھے۔ بعض مطبوعہ نسخوں میں ''ہماری جیب'' ملتا بھی ہے۔ بہر حال، جیب مع اول مفتوح بمعنی ''گریبان'' کی تذکیر کے لیے میر کی سند ہے، دیوان اول ؎

ہے دامن گلچین چمن جیب ہمارا دنیا میں رہے دیدۂ خونبار ہمیشہ

حسب ذیل شعر میر کے دیوان دوم کا ہے ؎

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

جید اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد، بمعنی ''خوب؛ کھرا؛ طاقتور''۔ دیکھیے: ''طیب''۔

چا بمعنی ''چائے'' اب اس لفظ کا املا اور تلفظ کم و بیش ہر جگہ ''چائے'' بروزن ''رائے'' ہے۔ لیکن اردو بولنے والے اینگلو انڈین اور عیسائی حضرات عموماً ''چا'' بروزن ''آ'' کہتے تھے۔ جان شیکسپیئر (Shakespear) کے لغت (۱۸۳۴) میں ''چا'' اور ''چادان'' درج ہیں، دوسرے کسی املا کا پتہ نہیں۔ ممکن ہے اس زمانے میں سب لوگ ''چا'' ہی بولتے ہوں۔ لیکن ''چاہ'' بھی اس لفظ کا پرانا املا اور تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

چونک کر مستی سی پیتا ہے میرا خون گرم
شب کو ہو ہے سوتے سے جاگ کر قہوے کی چاہ

بظاہر یہاں لفظ ''چاہ'' اور ''قہوہ'' میں ضلع کا ربط ہے۔ آبرو کا زمانۂ حیات ۱۶۸۳/۸۵ تا ۱۷۳۳ قرار دیا گیا ہے۔ اگر آبرو کے شعر میں ''چاہ'' اور ''قہوہ'' میں ضلعے کا تعلق واقعی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اواخر سترہویں صدی اور اوائل اٹھارویں صدی میں اس لفظ کا تلفظ ''چاہ'' تھا، یا

''چاؤ'' بھی تھا۔ بعض نسخۂ جدید کتابوں میں ''چاہ'' بھی دیکھا گیا ہے، لیکن سنا نہیں گیا۔ اس املا کو درست قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ آج کل بعض کم پڑھے لکھے حلقوں میں ''چا'' اور ''چاہ'' بھی کبھی سننے میں آجاتے ہیں۔ معیاری اردو انھیں چھوڑ چکی ہے۔

''نفائس اللغات'' (مرتبہ ۱۸۳۷ء) میں اوحد الدین کرمانی نے صرف ''چائے'' درج کیا ہے اور کہا ہے کہ عربی اس کی ''صائے'' ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں، کم سے کم اودھ کے علاقے میں، شاید ''چائے'' ہی رائج تھا، یا شاید ''چائے'' بھی رائج تھا۔ آج کل ہر جگہ ''چائے'' ہی مروج ہے۔ جدید عربی میں ''شاے'' ہے، بلا ہمزہ۔

''معربات رشیدی'' میں درج ہے کہ عربی لفظ ''صائے'' فارسی لفظ ''چائے'' کا معرب ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ''چائے'' لفظ قدیمی ہے اور اس کا یہی املا درست ہے۔ وحید قریشی کا بیان ہے کہ چینی میں ''چا'' اور ''چائے'' دونوں لفظ ہیں۔ پینے کے لئے تیار چائے کو وہ لوگ ''چا'' کہتے ہیں اور چائے کی پتی کو ''چائے''۔ ایک دلچسپ حاشیے کے طور پر یہ بات درج کرتا ہوں کہ مغرب میں اکثر لوگ (خاص کر اردو بولنے والے اور ان کے غیر ملکی متعلقین) کی زبانوں پر ''چائے'' بمعنی ''چینی، پانی، دودھ اور چائے کی پتی ملا کر پتیلی میں تیار کی ہوئی چائے'' ہے، اور Tea بمعنی وہ چائے ہے جو کیتلی میں لائی جاتی ہے اور جس کے ساتھ دودھ اور شکر الگ الگ برتنوں میں ہوتے ہیں۔ ایک اور حاشیے کے طور پر یہ بات بھی ہے کہ انگریزی میں اٹھارویں صدی تک Tea کا تلفظ ''ٹے / چے'' تھا، کیونکہ T سے شروع ہونے والے بعض الفاظ اور سالموں میں T کی آواز ''چ'' جیسی، بلکہ بسا اوقات بالکل ''چ'' ہی سنائی دیتی ہے۔ Nature کا تلفظ پہلے Natyer تھا، بعد میں Naychar ''نیچر'' ہو گیا۔ Tea کی البتہ قلب ماہیت ہو گئی۔

چاچا ''باپ کے بھائی'' کے معنی میں اس لفظ کو ہندی سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ منیر لکھنوی نے اپنے رسالے ''غلط العوام اور متروک الکلام'' میں ''چاچا / چاچی'' کو ''ٹکسال باہر'' قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''چاچی'' تو یقیناً اردو میں شاذ ہی بولا جاتا ہے، لیکن ''چاچا'' دہلی میں ثقہ لوگوں کی زبان پر بھی ہے۔ اسے ٹکسال باہر نہیں، دہلی کا مقامی روزمرہ کہنا چاہئے۔ ''چاچی'' بمعنی ''شہر چاچ کی بنی ہوئی چیز، خاص کر کمان'' البتہ اردو میں ہے۔

چادر اردو میں سوم مفتوح کے ساتھ بروزن "مادر" ہے۔ فارسی میں یہ لفظ سوم مضموم کے ساتھ بروزن "چابک" ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایرانی جب اسے رومن حروف میں لکھتے ہیں تو Chador لکھتے ہیں، کہ ان کے نظام میں ضمہ کو ظاہر کرنے کے لئے رومن حرف O استعمال ہوتا ہے۔

غالب، جیسا کہ معلوم ہے، "برہان قاطع" پر بہت گرجے برسے ہیں۔ ایک جگہ "برہان" میں کسی لفظ کا تلفظ ظاہر کرنے کے لئے لکھا ہے کہ یہ بروزن "مادر" ہے۔ غالب نے جھنجھلا کر عمدہ فقرہ لکھا کہ "مادر" کو لے آنا اور "چادر" کو چھوڑ دینا کہاں کی شرافت ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اظہار تلفظ کے لئے "مادر" کے بجائے "چادر" بہتر تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب کو معلوم نہ تھا کہ "چادر" کا ایرانی تلفظ بروزن "چابک" یعنی سوم مضموم کے ساتھ ہے۔ صاحب "برہان" کو ایسے لفظ کی ضرورت تھی جس میں سوم مفتوح ہو۔ ایسی صورت میں وہ "چادر" کا لفظ کس طرح لکھتے۔ غالب کا فقرہ گرم لیکن اعتراض سست تھا۔

چارج شیٹ "فرد جرم"، "فہرست الزامات"، "قرارداد جرم" وغیرہ فقروں کے ہوتے ہوئے "چارج شیٹ" لکھنا زبان پر اور خود پر ظلم کرنا ہے۔ یہ غیر ضروری انگریزی لفظ واجب الترک ہے۔

چالان چالان اردو کا لفظ ہے۔ یہ "چلنا/ چلانا" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی وہ کاغذ ہیں جس پر کسی سامان یا سامانوں کی فہرست درج کر کے وہ سامان کسی کے پاس بھیجا جائے (یعنی سامان کو چلایا جائے)۔ اس سے پھر یہ معنی بنائے گئے کہ وہ کاغذ جس میں کسی چیز، مثلاً کسی رقم کی کیفیت درج ہو۔ لہٰذا سرکاری خزانے میں جمع ہونے والی رقم جس کاغذ پر درج کی جاتی تھی اسے بھی "چالان" کہا جاتا ہے۔ اول الذکر معنی سے یہ معنی نکلے کہ وہ کاغذ جس پر ملزموں کی فہرست درج کر کے عدالت میں جمع کی جائے (یعنی وہ عدالت میں لے جائے جائیں) اسے بھی "چالان" کہا جائے۔ یہ لفظ ہندوستانی انگریزی میں مستعمل ہے، معیاری انگریزی میں نہیں ہے۔

چاندنا بعض لوگ اس لفظ کو "چاندنی" کی تصغیر سمجھتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ "چاندنا"

بمعنی ''چاندنی، روشنی'' بہت پرانا لفظ ہے۔ یہ ''چاندنی'' کی تصغیر نہیں ہے، اپنی جگہ مستقل لفظ ہے۔

چاہ دیکھئے، ''چا''۔

چاہنا اس مصدر کا ایک خاص استعمال اردو میں ہے، کہ مستقبل قریب میں واقع ہونے والی کسی بات کو اس بات کے مصدر کے ساتھ ''چاہنا'' کی تصریفی شکل لگا کر ادا کرتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مصدر کی جو شکل استعمال ہوگی وہ ماضی مطلق مذکر کی ہوگی:

دو بجا چاہتے ہیں [بجنے ہی والے ہیں]۔
یہ دیوار اب گرا چاہتی ہے [گرنے ہی والی ہے]۔
طوفان اب آیا چاہتا ہے [آنے ہی والا ہے]۔
روشنی غائب ہوا چاہتی ہے [غائب ہونے ہی والی ہے]۔
پرندوں کی قطاریں اڑا چاہتی ہیں [اڑنے ہی والی ہیں]۔
عورتیں پوجا کر کے اٹھا چاہتی ہیں [اٹھنے ہی والی ہیں]۔
تارے آسمان پر نکلا چاہتے ہیں [نکلنے ہی والے ہیں]۔
اسی پر قیاس کر کے مستقبل اور ماضی بھی بناتے ہیں:
عورتیں پوجا کر کے اٹھا چاہتی تھیں/ اٹھا چاہتی ہوں گی۔
دہلی میں اب صبح ہوا چاہتی تھی/ ہوا چاہتی ہوگی۔

یہ استعمال اردو کا مخصوص صرف ہے۔ دیگر زبانوں میں اس کا پتہ نہیں۔ چونکہ اس کے کوئی قاعدے نہیں ہیں کہ کس مصدر کے ساتھ یہ اچھا لگتا ہے اور کس کے ساتھ نہیں، اس لئے ہندی والے اسے مشکل ہی سے نبھا پاتے ہیں۔

چاہوں گا/ چاہیں گے انگریزی کا روزمرہ ہے ...I would like to یا I should like to... اس کا اردو میں کوئی بدل نہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اردو میں انگریزی کے مقابلے میں بہت زیادہ نفیس اور پر تکلف جملے ایسے موقعوں کے لئے ہیں۔ لیکن ہندوستان پاکستان دونوں کی اردو میں ان انگریزی فقروں کا ترجمہ رائج ہونے لگا ہے۔ یہ بدعت

بھی شاید ہندی نے شروع کی تھی:

غلط اور نامناسب اور قبیح: میں فاضل مقرر سے چاہوں گا کہ وہ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔

صحیح: میں فاضل مقرر سے درخواست کرتا ہوں کہ۔۔۔

غلط اور قبیح: میں چاہوں گا کہ آپ اپنی نئی تخلیقات ارشاد کریں۔

صحیح: میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔

غلط اور قبیح: میں یہ بات آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔۔۔

صحیح: میں یہ بات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔

چاء دیکھیے: ''چا''۔

چائے دیکھیے: ''چا''۔

چپتیانا اول دوم مفتوح۔ بمعنی ''چپت لگانا''، دیکھیے: ''گبرانا''۔

چراغ فارسی میں اول مفتوح اور اول مکسور دونوں درست ہیں۔ اردو میں عموماً اول مکسور سنا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی اول مفتوح کے ساتھ بولے تو کوئی حرج نہیں۔

چرچا اردو میں ''چرچا'' مذکر ہے، اور ''تذکرہ، خاص کر کثرت سے تذکرہ'' کے معنی میں آتا ہے، مومن کا دلچسپ شعر ہے ؎

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے　　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

ہندی میں یہ لفظ مونث ہے، اور ''بات چیت، ذکر'' کے معنی میں آتا ہے۔ بعض لوگ اسے اردو میں بھی یوں ہی استعمال کرتے ہیں، لیکن اردو کے لئے یہ محض غلط اور قبیح ہے:

غلط اور قبیح: آپ کے دہلی آنے بارے میں آج میں نے ان سے چرچا کی تھی۔

غلط اور قبیح: انھوں نے آپس میں چرچا کر کے طے کیا کہ۔۔۔

ملحوظ رہے کہ اردو لفظ ''چرچا'' کی جمع ''چرچے'' مستعمل ہے۔ ہندی میں ''چرچا'' بمعنی ''بات چیت، ذکر'' کی جمع سننے میں نہیں آئی۔

چڑیا دہلی (شاہ جہاں آباد) اور پورب کے علاقوں میں یہ لفظ بضم اول (بروزن ''پڑیا'') بھی بولا جاتا ہے، اگرچہ عام طور پر اول مکسور سے ہی سنا گیا ہے۔ اول مضموم کی حد تک اسے شاہجہاں

آباد اور علاقۂ مشرق کا علاقائی تلفظ کہنا چاہیے۔ انگیا کے ایک حصے کے معنی میں یہ صرف اول مکسور ہے۔

چشم زخم یہاں قلب اضافت مع فک اضافت ہے، یعنی ''آنکھ کا زخم، یعنی نظر لگنا'' کو ''زخم چشم'' مع اضافت کے بجائے پہلے ''زخم چشم'' بے اضافت کیا۔ پھر اسے پلٹ کر ''چشم زخم'' بے اضافت کر دیا۔ اسے مع اضافت بولنا غلط ہے۔

چشم زدن بعض لوگ اسے مع اضافت بولتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔

چکنا اول مضموم، بمعنی ''ختم ہونا''۔ اس لفظ کو عام طور پر پوربی اردو، بلکہ بھوجپوری سے مختص سمجھا جاتا ہے، لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ہر جگہ عام تھا۔ اکبر الٰہ آبادی ؎

گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں — اب ابتری سے یہ قوم رکتی ہی نہیں
ہوتی نہیں ان میں کچھ بھی غیرت پیدا — اور بات اکبر کی ہے کہ چکتی ہی نہیں

چکے اب ہندی/انگریزی کے زیر اثر اردو والے ایک نئے بھونڈے پن کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اردو میں فعل مجہول کا استعمال بہت کم ہوتا ہے، اور اس کی صورتیں عموماً مقرر ہیں۔ انگریزی میں فعل مجہول بہت ہے اور اس کی دیکھا دیکھی ہندی والے اسے اختیار کر رہے ہیں۔ اردو والے بھی ہندی کی چال چلنے کے فیشن میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں، لہٰذا اب اردو میں اس طرح کے جملے بھی لکھے جاتے ہیں:

کئی بار سزا پا چکے مجرم بھی وہاں آتے ہیں۔
پانچ کتابیں لکھ چکے جناب زید نے کہا۔
دہرا چکے سبق کو نہ دہراؤ۔
سات میچ کھیل چکے کھلاڑی نے کہا۔

یہ سب استعمالات غلط اور قبیح ہیں۔ صحیح صورتیں یہ ہیں:

کئی بار سزا یافتہ۔۔۔
پانچ کتابوں کے مصنف۔۔۔
دہرائے ہوئے سبق۔۔۔

سات پیچ کھیلے ہوئے۔۔۔

دوسرے الفاظ میں، ماضی فعل مجہول کی جگہ کوئی اسم استعمال کرنا چاہئے، یا فعل صفت استعمال کرنا چاہئے۔ اور تمام صورتیں اردو کے لئے ناواجب ہیں۔

چلتے اول مفتوح، بمعنی "وجہ سے، باعث"، مثلاً "بھائیوں کی ضد کے چلتے جائداد کا ستیاناس ہو گیا"۔ یہ روزمرہ علاقۂ پورب اور دہلی میں عام ہے۔

چمگادڑ اول مکسور، پنجم مفتوح، لیکن پنجم مضموم بھی سنا گیا ہے۔ اس لفظ کو مذکر اور مونث دونوں طرح بولتے ہیں۔ دیکھئے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"؛ "گادر"۔

چناوی اردو میں "الیکشن" اور "انتخاب" دونوں رائج ہیں، اگرچہ اول الذکر اب زیادہ عام ہو رہا ہے۔ بعض لوگ "چناؤ" بھی بولتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ لیکن بعض اخباروں میں "چناوی"، یعنی "چناؤ، یا الیکشن سے متعلق" بھی دیکھا گیا ہے۔ اس انتہائی قبیح اور بے مصرف لفظ کو مسترد کرنا چاہئے۔

چھپکلی اول مکسور، دوم کو مکسور اور مفتوح دونوں طرح بولتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

چھکلا دیکھئے چھکل۔ اول مکسور، دہلی، علاقۂ پورب میں، اور اودھ کے خطے میں بھی، کم پڑھے لوگ اور خاص کر پھل ترکاریوں کے کاروباری لوگ "چھلکا" کو الٹ کر "چھکلا" بولتے ہیں۔ بلکہ دہلی میں تو یہ روزمرہ عام ہے۔ چھوٹے چھلکے، یا چھوٹے موٹے خاروخس کو دہلی میں "چھکل" (سوم مشدد مفتوح) بولتے ہیں۔ دیکھئے، "تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں"۔

چھینٹا کشی "چھینٹے کسنا" کے معنی میں یہ بھونڈا محاورہ ہندی والوں کی اختراع ہے جسے بعض اردو والے بھی قبول کر رہے ہیں اور "چھینٹے کسنا" سے بے خبر ہیں۔ "چھینٹا کشی" ترک ہونا چاہئے۔

قبیح اور نامناسب: انھوں نے مجھ پر چھینٹا کشی کی ہے۔
فصیح اور مناسب: انھوں نے مجھ پر چھینٹے کسے ہیں۔

چیتا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں

کے''۔

چیل یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

چینوٹا/ چیونٹا عام طور پر زبانوں پر بروزن فع لن ہے، لیکن دہلی میں بروزن فاعلن بولتے ہیں۔ اسے دہلی کا علاقائی تلفظ کہنا چاہئے۔ ''چینٹا'' بروزن فع لن بھی رائج ہے۔ پورب میں ''چونٹا'' بروزن فع لن بھی سنا جاتا ہے۔ اسے پورب کا مقامی تلفظ کہنا چاہئے۔ املا کے اعتبار سے ''چیونٹا'' آج کل زیادہ رائج ہے۔

چینوٹی/ چیونٹی دہلی میں بروزن فاعلن بولتے ہیں، لیکن یہ تلفظ دہلی کا علاقائی تلفظ ہے۔ عام بول چال میں یائے ملفوظ کے ساتھ بروزن فع لن ہے۔ ''چینٹی'' بروزن فع لن بھی بولتے ہیں۔ پورب میں ''چونٹی'' بروزن فع لن بولتے ہیں۔ میر نے بھی باندھا ہے ؎

ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں کچھ ایسا   کچھ چونٹیوں کو لے کر پاؤں تلے مل ڈالا

لیکن اب یہ تلفظ پورب کا علاقائی تلفظ ہی کہا جائے گا۔ اس لفظ کا ایک املا ''چیونٹی'' بھی ہے، بروزن فع لن۔ املا کے اعتبار سے ''چیونٹی'' ان دنوں زیادہ رائج ہے۔

حاتم اس لفظ کا تلفظ سوم مفتوح کے ساتھ بروزن ''جانم'' بھی درست ہے اور بروزن ''ہاشم'' بھی۔ اغلب ہے کہ مشہور شاعر شاہ حاتم اپنا نام بروزن ''جانم'' بولتے رہے ہوں۔ لیکن اب بروزن ''ہاشم'' تلفظ دوسرے تلفظ پر غالب آ رہا ہے۔

حاصل مصدر دیکھیے: ''رہائش''۔

حامل دیکھیے: ''حاملہ''۔

حاملہ عربی میں بعض لفظ ایسے ہیں جو اپنے آپ میں مونث سمجھے جاتے ہیں، یعنی ان میں کوئی علامت تانیث نہیں ہوتی۔ ایسے مونث کو عربی میں ''مونث معنوی'' کہتے ہیں، یعنی وہ لفظ جس میں کوئی علامت تانیث نہ ہو لیکن اہل زبان جسے مونث مانتے ہوں۔ اردو میں ایسے مونث اور مذکر کو ''مونث حقیقی'' اور ''مذکر حقیقی'' کہتے ہیں۔ ''حامل'' عربی میں مونث معنوی ہے۔ عربی میں ''حامل'' بمعنی ''جس کے پیٹ میں بچہ ہو، جسے حمل ٹھہر گیا ہو'' اس لئے مونث ہے کہ مرد کے پیٹ

میں بچہ ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اسے حمل ٹھہر سکتا ہے۔ لہٰذا ''حامل'' کو مونث بننے کے لئے تائیث [جیسے جمیل/جمیلہ، زاہد/زاہدہ، وغیرہ] کی ضرورت نہیں۔ لیکن اردو میں ''حامل'' کے معنی ہیں: ''کسی چیز کا رکھنے والا'' مثلاً ''آپ کی بات بڑی اہمیت کی حامل ہے۔'' ''وہ جس کے پیٹ میں بچہ ہو، جسے حمل ٹھہر گیا ہو'' کے معنی میں اردو والے ''حاملہ'' بولتے ہیں۔ لیکن میر نے اس معنی میں ''حامل'' ہی لکھا ہے۔

غنیمت جان فرصت آج کے دن   سحر کیا جانے کیا ہو شب ہے حامل

میر نے ایک کہاوت کے اتباع میں ''شب ہے حامل'' کہا ہے۔ اسے اردو کا روزمرہ نہ سمجھنا چاہئے۔ ہاں کہاوت کے طور پر لکھنا ہو، ''شب/رات حامل ہے دیکھیں صبح کو کیا پیدا ہو'' یا ''شب حامل است تا سحر چہ زاید'' تو ٹھیک ہے۔

حجامت عربی میں یہ لفظ بکسر اول ہے۔ لیکن اردو میں بفتح اول رائج ہے اور اردو کے لئے یہی درست ہے۔

حرافہ اول مفتوح، دوم مشدد۔ فارسی والوں نے عربی ''حرف'' سے ایک لفظ بنایا ''حراف'' (مع رائے مشدد) اور اس کے معنی قائم کئے: ''طلیق اللسان، شگفتہ گفتگو کرنے والا''۔ یہ لفظ اردو میں آ گیا، لیکن معنی بدل گئے۔ یہاں اس لفظ سے ''چالاک، مکار، باتوں میں بہت تیز'' وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں جو شواہد دیئے ہیں ان سے اس لفظ اور معنی کا وجود زمانۂ دکن سے ثابت ہے۔ بیسویں صدی آتے آتے ''حراف'' کا استعمال بہت کم ہو گیا اور اس کی جگہ ''حرافہ'' نے لے لی۔ ''حرافہ'' کا اندراج ''آنندراج''، ''بہار''، ''غیاث''، ''منتخب'' میں نہیں ہے اور نہ ہی جن فارسی لغات میں ''حراف'' درج ہے ان میں اس کے وہ معنی دیئے ہوئے ہیں جو اردو میں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ''حراف'' تو عورت مرد دونوں کے لئے بولتے تھے لیکن ''حرافہ'' صرف جنس اناث کے لئے مخصوص ہے۔ لہٰذا اردو میں مستعمل معنی کی حد تک ''حراف/حرافہ'' خالص اردو ہیں۔

حرج عربی میں بفتحتین ہے۔ اردو میں اول مفتوح اور دوم ساکن بولا جاتا ہے، لہٰذا اردو میں بروزن ''فرض'' ہی مرجح ہے۔ یہ لفظ اور ''ہرج'' تقریباً ہم معنی ہیں۔ ''ہرج'' کا عام اردو

تلفظ بفتحتین ہے، لیکن عربی میں یہ بروزن ''فرض'' یعنی اول مفتوح اور دوم ساکن کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اردو میں ''ہرج'' بفتحتین یعنی بروزن ''مرض'' ہی مرجح ہے، لیکن کوئی بروزن ''فرض'' بولے تو غلط نہ ہوگا۔ ''ہرجانہ'' بمعنی ''تاوان'' اہل اردو نے فارسی طرز پر بنالیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ عربی میں نہیں ہے۔ فارسی میں بھی نہیں ہے۔ ''ہرجانہ'' میں البتہ اول مفتوح اور دوم ساکن ہے۔

حروف ابجد عربی کے ہر حرف تہجی کی عددی قیمت مقرر ہے۔ اس قیمت کو اس حرف کے اعداد، یا عدد کہتے ہیں۔ عربی کے حروف کو ان کے اعداد کے اعتبار سے اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ پہلے اکائیاں، پھر دہائیاں، پھر سیکڑے، اور پھر ہزار۔ اس نظام یا اس ترتیب، اور ان قیمتوں کو قاعدۂ ابجد یا قاعدۂ جمل [اول مضموم، دوم مفتوح، بروزن ''دہل''] کہا جاتا ہے۔ اسی لئے حروف تہجی کو ''حروف ابجد'' اور ''حروف جمل'' بھی کہتے ہیں۔ ان حروف کو تین یا چار کے گروہ میں مجتمع کر کے کچھ فرضی لفظ بنا لئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ، اور ان کی ترتیب، اور ان کی قیمتیں، حسب ذیل ہیں:

الف = ۱، بے = ۲، جیم = ۳، دال = ۴، یعنی
ابجد (اول سوم مفتوح)

ہے = ۵، واؤ = ٦، زے = ۷، یعنی
ہوز (اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد)

حے = ۸، طوے = ۹، ی = ۱۰، یعنی
حطی (اول مضموم، دوم مشدد مکسور)

کاف = ۲۰، لام = ۳۰، میم = ۴۰، نون = ۵۰، یعنی
کلمن (اول سوم مفتوح، دوم مکسور)

سین = ٦۰، عین = ۷۰، فے = ۸۰، صاد = ۹۰، یعنی
سعفص (اول سوم مفتوح)

قاف = ۱۰۰، رے = ۲۰۰، شین = ۳۰۰، تے = ۴۰۰، یعنی

قرشت (اول سوم مفتوح)

ثے = ۵۰۰، خے = ۶۰۰، ذال = ۷۰۰، یعنی

ثخذ (اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد)

ضاد = ۸۰۰، ظوے = ۹۰۰، غین = ۱۰۰۰، یعنی

ضظغ (اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد)

اردو کے حسب ذیل حروف عربی میں نہیں ہیں۔ ان کے لئے عربی کے قریب ترین حرف کی قیمت مقرر کر لی گئی ہے:

پے = ۲، ٹے = ۴۰۰، چے = ۳، ڈال = ۴، ڑے = ۲۰۰، ژے = ۷، گاف = ۲۰

دوچشمی ھ کے لئے بھی چھوٹی ہ کے اعداد (۵) مقرر ہیں۔ ہمزہ چونکہ عربی میں کسی حرف کا نام نہیں ہے، اس لئے قاعدۂ ابجد میں اس کا کوئی عدد مقرر نہیں۔ اردو میں البتہ ہمزہ کے لئے بعض لوگوں نے کچھ قیمت (مثلاً ایک، یا دس) مقرر کی ہے، لیکن کچھ لوگ اس رائے کے ہیں کہ اردو میں بھی ہمزہ کا کوئی عدد نہیں ہے۔

قاعدۂ ابجد کے بارے میں حسب ذیل باتیں دلچسپ ہیں۔ یہ اطلاعات کہیں یک جا نہیں ملتیں۔ اس لئے یہاں درج کی جا رہی ہیں:

(۱) جس ترتیب سے حروف کو نظام ابجد میں مجتمع کیا گیا ہے، یہ عبرانی حروف تہجی کی ترتیب ہے۔ لہٰذا ان کی قیمتیں بھی عبرانی سے آئی ہوں گی۔

(۲) ابجد کی جو ترتیب میں نے اوپر درج کی ہے وہ اردو اور فارسی میں ہر جگہ ہے۔ لیکن عربی میں یہ ہر جگہ نہیں ہے۔ شمالی افریقہ میں یہ ترتیب حسب ذیل ہے:

ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفض [یعنی صاد کی جگہ ضاد] قرصت [یعنی شین کی جگہ صاد] ثخذ، ظغش [یعنی ضاد کی جگہ ظوے، ظوے کی جگہ غین، اور غین کی جگہ شین]۔

ان کی قیمتیں بھی اسی اعتبار سے مختلف ہیں: ضاد = ۹۰، صاد = ۱۰۰، ظوے = ۸۰۰، غین = ۹۰۰، شین = ۱۰۰۰۔ ان کا تلفظ بھی کچھ مختلف ہے، جیسا کہ نیچے واضح کیا گیا ہے۔

(۳) الفاظ ابجد کا تلفظ بھی ہر جگہ ایک نہیں ہے۔ خود اردو میں یہ الفاظ بعض لوگوں کی زبان

پر کچھ فرق کے ساتھ سنائی دیتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ ''کلمن'' میں دوم مفتوح بولتے ہیں۔ ''قرشت'' میں بھی بعض لوگ دوم مفتوح بولتے ہیں۔ اور ''ثخذ، ضظغ'' کئی علاقوں میں بلا تشدید بھی بولے جاتے ہیں۔

(۴) عربی زبان (نشر کر قاعدۂ ابجد) میں ان الفاظ کا تلفظ مرقوم الذیل ہے:

اَبجَد ھَوَز حُطّی کَلَمَن سَعفَص قَرَشَت ثَخَذ ضَظَغ

(۵) شمالی افریقہ میں تلفظ حسب ذیل ہے:

اَبجَد ھَوَز حُطّی کَلَمَن سَعفَض قَرَصَت ثَخَذ ظَغَش

(۶) مختلف کتابوں میں ان لفظوں کے مختلف معنی درج ہیں۔

مویدالفضلاء:

ابجد = انکار بسیار کرد از عصیاں

ہوز = پیروی کرد خواہش خود را

حطی = نابود شد گناہ او با ستغفار و توبہ، و احسان گردید بہ او بہ عفو و رحمت

کلمن = کلام کرد بکلمہ کہ محتوی بہ طلب رحمت بود، پس توبہ قبول کرد خدا، و احسان نہاد بہ قبول ورحمت

سعفص = تنگ گردید دنیا بر آدم و تنگی آورد بہ او

قرشت = گرفتار شد بہ باعث گناہ، پس پردہ پوشید بہ سبب کرامت و اکرام

ثخذ = بگرفت از جانب خداے تعالیٰ عفو و صفح و در گذر

ضظغ = باز داشت از آدم گزندگی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۲) و قیل ملکے بود نام پسر او ایں بود ابلیس لعین بہ دعا و قول لا الہ الا اللہ۔۔۔ (؟)

مدار الافاضل / فرہنگ آصفیہ:

ابجد = میرا باپ جو آدم تھا، گنہگار پایا گیا، یعنی اس سے گناہ صادر ہوا

ہوز = اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کی

حطی = اس کے گناہ اس کی توبہ و استغفار سے دھو دیے گئے

سعفص = دنیا اس کے اوپر تنگ ہو گئی بس بہا دی گئی (؟)

قرشت = اپنے گناہوں کا اقرار کیا جس سے کرامت کا شرف حاصل ہوا

ثخذ = خدا تعالیٰ نے اسے قوت دی

ضظغ = شیطان کا جھگڑا کلمۂ حق و توحید کی برکت سے مٹ گیا

رسالۂ ضوابط عظیم / فرہنگ آصفیہ:

ابجد = شروع کیا

ہوز = مل گیا

حطی = واقف ہوا

کلمن = متکلم ہوا

سعفص = اس سے سیکھا

قرشت = ترتیب دیا

ثخذ = محفوظ رکھا

ضظغ = تمام کیا

کشکول چشتی مملوکہ حکیم افہام اللہ امہوتوی مرحوم:

ابجد = ابتدا کرو

ہوز = واقف شد

حطی = در پیوست

کلمن = سخن گفت

سعفص = زود بیاموخت

ثخذ = نگاہ داشت

ضظغ = تمام شد

حروف تہجی، اردو کے دیکھیے: ''اردو کے حروف تہجی کی ترتیب''؛ ''اردو کے حروف تہجی کی تعداد''؛ ''اردو کے حروف تہجی کی جنس''؛ ''حروف ابجد''۔

حروف جمل دیکھیے: ''حروف ابجد''۔

حشری وہ گھوڑا جو بہت بدمزاج ہو، دوسرے گھوڑوں کے ساتھ اصطبل میں امن سے نہ رہتا ہو۔ دیکھیے: ''گھوڑے کے پانچ عیب''۔

حضرت اردو میں معنی کے لحاظ سے ''حضور'' اور ''حضرت'' میں کوئی فرق نہیں۔ روزمرہ اور محاورے میں استعمال کی بنا پر ان میں کہیں کہیں فرق آ گیا ہے۔ حسب ذیل پر غور کیجیے:

(۱) آج حضرت نے توحید پر تقریر کی۔

(۲) آج حضور نے۔۔۔

(۳) حضرت غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔

(۴) حضور غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔

یہاں ایک، دو، اور تین بالکل ٹھیک ہیں، لیکن نمبر چار درست مگر خلاف محاورہ ہے۔ اکثر فقروں کے الفاظ متعین ہو گئے ہیں کہ ''حضور'' کہاں بولیں گے اور ''حضرت'' کہاں بولیں گے۔ عام طور پر ''حضور تاجدار ملت'' کہا جاتا ہے، لیکن ''حضرت تاجدار ملت'' غلط نہ ہوگا۔ اسی طرح، ''حضرت مولانا'' اور ''حضور مولانا'' دونوں صحیح ہیں لیکن ''حضرت مولانا'' زیادہ رائج ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ''حضور'' میں ''حضرت'' سے زیادہ وقعت اور قوت کا شائبہ ہے۔ لیکن یہ صرف استعمال عام پر ہے، جہاں جس طرح چل جائے وہی ٹھیک ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ اردو میں ''حضرت'' کا لفظ بعض بزرگ شخصیات کے نام کے پہلے لگاتے ہیں، مثلاً ''حضرت میر تقی میر''؛ ''حضرت شہاب الدین شاہجہاں''؛ ''حضرت خواجہ نظام الدین صاحب اولیا''۔ لیکن یہ الفاظ غیر مسلم بزرگوں کے نام کے ساتھ بہت کم لگاتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح، اپنے مذہبی رہنماؤں کو ہم ''حضور'' کہہ دیتے ہیں، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جیسے ''حضور خواجہ معین الدین صاحب''؛ ''بی بی حضور صاحب''؛ ''حضور تیر تھنکر''؛ ''حضور رادھا سوامی جی'' وغیرہ۔ لیکن غیر ہندوستانی پیغمبروں کے لئے ''حضور'' نہیں کہتے۔ مثلاً ''حضور عیسیٰ علیہ السلام'' وغیرہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں، لیکن یہ خلاف محاورہ ہے۔ اگر صرف ''حضور'' کہا جائے تو عموماً اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوتے ہیں۔

حضور دیکھئے: "حضرت"۔

حضور السلطان علامہ ضمیر اختر نقوی کے بقول واجد علی شاہ کی بعض ممنوعہ بیویاں ایسی تھیں جنھیں باقی ممنوعات پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ تعداد میں اٹھارہ تھیں۔ انھیں حضور السلطان کہا جاتا تھا۔

حفاظت بمعنی "حفظ"۔ یہ لفظ عربی میں نہیں ہے۔ اغلب ہے کہ فارسی میں عربی مصدر "حفاظ" (اول مکسور) سے بنا لیا گیا ہو۔ لیکن فارسی میں بھی یہ بہت کمیاب ہے۔ "آنندراج" اور "غیاث" میں یہ درج ہی نہیں ہے۔ "وہخدا" میں درج ہے، لیکن صرف ایک سند دی گئی ہے۔ چونکہ وہ سند نظامی کی ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں یہ لفظ بہت دن سے ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں اسے عربی لکھا ہے اور اس کا مادہ ح ف ظ بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں۔ لیکن یہ لفظ اردو کی حد تک بالکل صحیح و فصیح ہے۔ بس اتنا ہے کہ اسے عربی نہ قیاس کیا جائے۔

حفظان اول مکسور، بمعنی "حفظ"۔ یہ لفظ صرف "حفظان صحت" کی ترکیب میں مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عربی نہیں ہے۔ یہ فارسی بھی نہیں ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں اس کی اولین سند علامہ شبلی کی ہے۔ اس وقت طے کرنا مشکل ہے کہ شبلی نے (اگر شبلی ہی اس کے مخترع ہیں) یہ ترکیب کہاں سے حاصل کی۔ بہر حال، اردو میں "حفظان صحت" بالکل صحیح ترکیب ہے۔ لیکن چونکہ لفظ "حفظان" کسی اور لفظ کے ساتھ، یا تنہا، نہیں دیکھا یا سنا گیا، لہٰذا اسے صرف اس ترکیب تک محدود رکھنا بہتر ہے۔

حق بننا "حق" کے ساتھ "بننا" نہیں آتا، "ہونا" مستعمل ہے۔ لیکن آج کل بعض لوگ "حق بننا" بولنے لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عموماً تو صرف "حق" سے کام چل جاتا ہے، نہ "بننا" کی ضرورت ہے نہ "ہونا" کی۔

نامناسب: کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ آپ کو ایک وقت کھانا کھلا سکوں؟

مناسب: ۔۔۔حق نہیں ہے کہ۔۔۔۔

فصیح و انسب: ۔۔۔حق نہیں کہ۔۔۔۔

نامناسب: میں ان کے باپ کا دوست ہوں، میرا حق بنتا ہے کہ ان کو نصیحت کروں۔

مناسب: ۔۔۔ میرا حق ہے کہ۔۔۔

فصیح وانسب: ۔۔۔ مجھے انھیں نصیحت کرنے کا حق ہے۔

حلیہ اردو میں اول مضموم کے ساتھ بمعنی ''چہرہ مہرہ'' اور اول مکسور کے ساتھ بمعنی ''زیور'' رائج ہے۔ عربی میں اول الذکر معنی [چہرہ مہرہ] کے لئے اول مکسور آتا ہے، اور ''زیور'' کے معنی میں اول مضموم و مکسور دونوں صحیح ہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں دونوں معنی کے لئے دونوں تلفظ بتائے گئے ہیں۔ ''نور اللغات'' میں صرف عربی تلفظ درج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ افراط و تفریط ہے۔ بعض لوگ عربی تلفظ پر اصرار کرتے ہیں لیکن یہ اردو کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہاں جو رائج ہے وہی صحیح ہے۔

حماقت عربی میں اول مفتوح ہے، اور اردو میں عموماً یہی رائج ہے۔ لیکن لکھنؤ میں بعض لوگ اول مکسور بولتے ہیں۔ اسے لکھنؤ کا مقامی تلفظ کہنا چاہئے۔ جناب شاہ حسین نہری کہتے ہیں کہ دکن میں بھی بہ کسرۂ اول بولتے ہیں۔ اس اطلاع کی روشنی میں یہ تلفظ دکن کے لئے بھی مقامی ٹھہرے گا۔

حمقا اول مضموم، دوم مفتوح، ''احمق'' کی جمع۔ عربی میں الف مقصورہ سے ہے، لیکن اردو مع الف ہی صحیح ہے۔ ''جنت الحمقا'' بھی درست ہے۔

حوالے سے ''لحاظ سے'' یا ''واسطے سے'' یا ''غرض سے'' کے معنی میں یہ فقرہ درست نہیں:

غلط: میں اور میرا بھائی اس انجمن کے ممبر تھے۔ اسی حوالے سے دعوت نامے ہمیں بھی ملے۔

صحیح: ۔۔۔ اسی لحاظ سے۔۔۔

غلط: موسم کے حوالے سے دیکھیں تو۔۔۔

صحیح: موسم کے لحاظ سے۔۔۔

پاکستان میں اس فقرے کو اور بھی آزادی سے بولنے لگے ہیں:

کیا آپ وہاں کسی انٹرویو کے حوالے سے گئے تھے؟

میں آپ کی خدمت میں فلاں صاحب کے حوالے سے حاضر ہوا ہوں۔

ایمان داری کے حوالے سے دیکھیں تو۔۔۔

تاریخ کے حوالے سے بات ہو تو۔۔۔

ان سب استعمالات میں ''حوالے سے'' کی جگہ ''لحاظ سے''/''واسطے سے''/''غرض سے'' مفہوم کو بہتر طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

حیثیت عربی میں اس کا تلفظ بروزن مفعولن (ح + ی + یت) ہے۔ لیکن اردو میں بروزن فاعلن رائج ہو گیا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ اگر کوئی اس لفظ کو بروزن مفعولن لکھے تو اسے غلط نہ کہا جائے گا، لیکن بروزن مفعولن پر اصرار کرنا، اور بروزن فاعلن کو غلط کہنا، دھاندلی اور بے عقلی ہے۔

خاصا ''زیادہ'' کے معنی میں، لیکن زور دینے کے موقعے پر بولتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو تنہا صرف، اور دوسرا ''اچھا'' کے سابقے کے ساتھ۔ مثلاً:

خاصا روپیہ لگا دیا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

خاصا شکووں کا دفتر سا کھول دیا۔

اچھا خاصا کام بگاڑ دیا۔

اچھے خاصے دوست کو گنوا دیا۔

اسی طرح ''خاصی''/''خاصے'' بھی ''زیادہ'' کے معنی میں، لیکن زور دینے کے موقعے پر بولتے ہیں اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مثلاً:

خاصی کوشش کے بعد ان کا گھر ملا۔

خاصی قیمتی چیز تھی۔

اچھی خاصی صورت بگاڑ ڈالی۔

خاصے انتظار کے بعد پتہ چلا۔

دونوں کو الٹ بھی سکتے ہیں، یعنی ''اچھا/اچھی/اچھے'' کو ''خاصا/خاصی/خاصے'' کے بعد بھی لا سکتے ہیں۔ مثلاً ''اچھا خاصا'' کو ''خاصا اچھا'' بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس طرح بعض اوقات معنی

بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کا خیال ضروری ہے کہ کس مطلب کو ادا کرنا منظور ہے:

''اچھی خاصی دوری''، یعنی بہت دوری، قابل ذکر دوری۔ مثلاً ''مدرسہ میرے گھر سے اچھی خاصی دوری پر تھا۔''

''اچھی خاصی کوشش''، یعنی ایسا عمل جسے پوری طرح ''کوشش'' کا نام دے سکتے ہیں۔ مثلاً:

''ریل کا ٹکٹ یوں ہی نہیں مل جاتا، اچھی خاصی کوشش کرنی پڑتی ہے۔''

''خاصی اچھی دوری''، یعنی قابل ذکر دوری۔ مثلاً ''شیر ابھی ہم سے خاصی اچھی دوری پر تھا۔''

''خاصی اچھی کوشش''، یعنی قابل ذکر کوشش۔ مثلاً ''ان کی کوشش خاصی اچھی تھی لیکن پوری طرح کارگر نہ ہوئی۔''

''خاصا/ خاصی/ خاصے'' کو زور کلام کے لئے کامیابی سے استعمال کرنے کے لئے زبان کے مزاج سے واقفیت ضروری ہے۔ بعض حالات میں ''اچھا/ اچھی/ اچھے'' کے ساتھ ''خاصا/ خاصی/ خاصے'' کچھ زیادہ متعین معنی دیتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) مصرع حفیظ جالندھری: اور کسے جینا کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں۔ یعنی ٹھیک سے، تندرستی کے ساتھ۔

(۲) آنگن کو اچھی خاصی سڑک بنا ڈالا۔ یعنی پوری طرح۔

(۳) کسی نے کہا آپ بیمار تھے۔ آپ تو اچھے خاصے ہیں۔ یعنی تندرست ہیں۔

(۴) منے میاں تو اچھے خاصے حکیم ہیں۔ یعنی کم و بیش بالکل۔

خاصہ/ خاصی/ خاصے دیکھئے، ''خاصا''۔ بعض لوگ ''خاصا'' کو ''خاصہ'' لکھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔

خاک اس لفظ کو اردو میں فارسی ''ہیچ'' کے معنی میں بولتے ہیں۔ غالب نے قتیل کا مذاق اڑایا ہے کہ انھوں نے ''ہیچ نہ بود'' کی جگہ ''خاک نہ بود'' لکھ دیا ہے۔ قتیل ذی علم آدمی تھے، اور تحقیق لغات میں غالب کچھ بہت مستند نہ تھے۔ میں نے گمان کیا کہ قتیل نے ''خاک نہ بود'' بمعنی

"ہیچ نہ بود" لکھا تو تو کوئی بنیاد تو ہوگی۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود مجھے فارسی میں "خاک نہ بود" بمعنی "ہیچ نہ بود" نہیں ملا۔ معلوم ہوا تحقیق لغات میں غالب کچے رہے ہوں، لیکن محاورے میں پکے تھے۔ اردو میں "خاک نہیں" بمعنی "کچھ نہیں" فصیح اور بلیغ ہے۔ خود غالب کی غزل جس کی ردیف "میں خاک نہیں" ہے، اس بیان کا ثبوت ہے۔

خالو اردو میں خالہ کے شوہر کو کہتے ہیں، لیکن عربی فارسی میں ماں/ خالہ کے بھائی، یعنی ماموں کو خالو کہتے ہیں۔ میر نے خان آرزو کو اسی معنی میں "خالو" کہا ہے۔ وہ میر کی سوتیلی ماں کے بھائی تھے۔ عربی میں ماموں کے لئے "خال"، "خالو" مستعمل ہے۔ "خالو" یہی لفظ مع واو شفقت ہے۔

خال وخد "خال وخد/ خد وخال" بمعنی "ناک نقشہ" فارسی میں نہیں ملتا، لیکن اردو میں بہت سے جدید شعرا نے استعمال کیا ہے۔ یہ اردو کا فقرہ ہے، فارسی میں نہ ہو، نہ سہی۔ اردو میں اسے درست مانا جائے گا۔ خال وخط، خال وخد، خط وخال، خد وخال، اردو میں سب درست ہیں۔

خال وخط دیکھئے: "خال وخد"۔

خانۂ ماتم دیکھئے "ماتم خانہ"۔

ختنہ دہلی میں یہ لفظ عموماً جمع مذکر کی صورت میں بولا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں واحد مونث بھی تھا۔

چار پانچ روز ہوئے کہ سید مسعود کی ختنہ ہوگئی۔

(سرسید: "مکاتیب"، مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، جلد اول، ص ۲۲۱)

اب عموماً واحد مذکر سنا جاتا ہے۔ دیکھئے: "مسلمانی"۔

خجالت عربی میں بفتحتین ہے۔ اردو فارسی میں دوم ساکن کے ساتھ بولا جاتا ہے، غالب کا شعر ہے ؎

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیافتند جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ

بفتحتین تو اردو میں غلط ہے، لیکن حرف اول کی حرکت عام طور پر فتحہ اور کہیں کہیں کسرہ سنی گئی ہے۔ اس وقت حرف اول کی دونوں حرکات کو اردو میں درست کہا جائے گا۔

خچر وہ جانور جس کی ماں یا باپ میں سے ایک گھوڑے کی نسل کا ہو اور ایک گدھے کی نسل کا، عموماً ماں مادہ خر ہوتی ہے۔ خچر ہمیشہ نر لیکن قوت تولید سے عاری ہوتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر مذکر بولا جاتا ہے، لیکن مونث بھی رائج ہے۔ کسی پرانے لغت میں مونث درج نہیں، لیکن مخمس شہر آشوب میں سودا کا شعر ہے ؎

ہوا پہ چیتی ہے بیلوں کی اور بہس پہ برات جو خچریں ہیں انھوں نے پیا ہے آب حیات

''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ۱۸۹۲ کی ایک تصنیف سے فقرہ درج ہے:

خچریں راستے میں مر گئیں۔

لطف یہ ہے کہ اس کا مونث ''خچری'' بھی موجود ہے۔ یہ لفظ بھی کسی پرانے لغت میں نہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں البتہ ہے۔ داستان امیر حمزہ میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

خچری ''خچر'' کا مونث، دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''؛ ''خچر''۔

خداخانہ یہ لفظ فارسی میں نہیں ہے، لیکن ''خانۂ خدا'' وہاں مستعمل ہے، چندر بھان برہمن ؎

ببیں کرامت بت خانۂ مرا اے شیخ کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

میر محمد علی رائج، استاد سیالکوٹی مل وارستہ ؎

مبر بہ کلبۂ درویش بے ادب نعلین خدائے خانہ ببیں خانۂ خدا شدہ است

اردو کے پرانے لغات میں، بلکہ ''نور اللغات'' میں بھی ''خداخانہ'' نہیں ملتا۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اس کا اندراج نوح ناروی اور جمیل مظہری کے حوالے سے ہے ؎

نوح ناروی ؎

کہا تھا اے دل نافہم و ناداں تجھ سے یہ کس نے خداخانے کی حرمت کو صنم خانے میں رکھ دینا

جمیل مظہری ؎

اک خداخانہ کہ کوشش پہ بھی جھکتا نہیں سر اک صنم خانہ کہ دل خود ہی جھکا جاتا ہے

دیکھیے ''ماتم خانہ''۔

خر یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں

کے"۔ اس لفظ کے ایک معنی "بڑا" بھی ہیں، جیسے: خرگاہ (بڑی جگہ، بڑا خیمہ، بڑی خیمہ گاہ)؛ خرگوش (بڑے کانوں والا)، خربط (بڑی بط)۔

خراج دیکھیے: "خرج"۔

خراش اصغر علی خاں نسیم کا شعر ہے ؂

یہاں تک اوج جنوں میں مجھے کمال ہوا خراش ناخن دیوانگی ہلال ہوا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نسیم نے "خراش" کو ضرورت شعری کی بنا پر مذکر باندھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "خراش" پرانے زمانے میں مذکر تھا، میر ؂

غصے میں ناخنوں نے مرے کی ہے کیا تلاش تلوار کا سا گھاؤ ہے جبہے کا ہر خراش

نسیم کا زمانہ آتے آتے "خراش" مونث ہو چکا تھا، چنانچہ "توبۃ النصوح" میں ہے:

فیل پائی دھڑام سے تخت پر سے گر پڑی۔ کہیں ذرا سی خراش آگئی۔

لہٰذا ہم یا یہ فرض کریں کہ نسیم نے پرانے لوگوں کے اتباع میں "خراش" کو مذکر لکھا ہے، یا یہ فرض کریں کہ انھوں نے "ہلال" کی مناسبت سے "ہوا" لکھا ہے۔ یہ طریقہ پہلے زمانے میں رائج تھا۔ دیکھیے: "اضافت کی علامت (کا، کی، کے) میں تعقید"؛ "فاعل اور فعل کا توافق"۔ دونوں صورتوں میں نسیم پر کچھ اعتراض نہیں وارد ہوتا؛ "ضرورت شعری" کی بات ہی کیا ہے۔

خرج دیکھیے: "خرچ"۔

خرچ بالا دستی فارسی میں اس کے معنی ہیں: "وہ خرچ جو مقررہ تخمینے یا حساب سے زائد ہو۔" صاحب "بہار عجم" کا کہنا ہے کہ ہندوستانی فارسی والوں نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "خرچ بالائی" کی ترکیب اختراع کی ہے۔ مزید بحث کے لئے دیکھیے: "بالا خرچی"؛ "خرچ بالائی"۔

خرچ بالائی دیکھیے: "خرچ بالائی"۔

خرچ اول مفتوح، دوم ساکن۔ یہ لفظ نہ فارسی ہے نہ ترکی، خالص اردو ہے۔ اس لفظ کے معنی معروف ہیں: "صرف، یعنی کسی کام یا شے پر زر، روپیہ پیسہ، کا استعمال کرنا، انگریزی میں "Expense/Expenditure"۔ فارسی میں ایک لفظ "خرج" البتہ ہے لیکن اردو "خرچ"

کے معنی میں ''خرج'' فارسی میں نہیں استعمال ہوا ہے۔ فارسی میں لفظ ''خرج'' کے معنی ''زر، روپیہ پیسہ'' وغیرہ ہیں۔ اردو میں بھی ''خرج'' کے ایک معنی ''زر، روپیہ پیسہ'' ہیں، مثلاً ''سفر خرج'' (بے اضافت، یعنی وہ رقم جو سفر میں اور سفر کے خرچ کے لئے ہو، خرج سفر)، اور انشا ؎

حوصلہ ہے فراخ رندوں کا خرج کی پر بہت ہی تنگی ہے

غالب نے مندرجۂ ذیل شعر میں ''خرج'' بمعنی ''خرچ'' استعمال کیا ہے، اور یہ فارسی کے اعتبار سے غلط ہے۔ عربی کے لحاظ سے درست ہو سکتا ہے، کہ عربی میں ''خرج / اخراج'' بمعنی ''نکلنا، ادا ہونا، نکالنا'' ہے ؎

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فارسی میں ''خرج'' بمعنی ''برآمدن'' اور اس کا متضاد ''دخل'' بمعنی ''درآمدن'' مستعمل ہیں۔ استعاراتی طور پر ''دخل و خرج'' کو ''آمدنی اور صرفہ'' کے معنی میں بیشک استعمال کیا گیا ہوگا، اگرچہ اس کی کوئی مثال مجھے نہیں ملی۔ بہر حال، ممکن ہے اردو والوں نے فارسی اور عربی میں ''خرج'' کے مختلف معنوں پر مبنی کر کے ''خرچ'' بنا لیا ہو۔ لیکن اردو کی مزید طباعی دیکھئے کہ فارسی لفظ کی طرح اس کے آخر میں ہائے ہوز لگا کر ''خرچہ'' بنایا۔ معنی کے اعتبار سے ''خرچ'' اور ''خرچہ'' بالکل ایک ہیں۔ ''خرچہ'' میں ہائے ہوز مزید علیہ ہے اور کوئی معنی نہیں دیتی، جیسے ''موج / موجہ''۔ دیکھئے: ''آوازہ''۔ ملحوظ رہے کہ ''خرچا'' بجائے ''خرچہ'' صحیح املا نہیں۔ دیکھئے، ''خرچ پانی''؛ ''ہائے مختفی''۔

ہم نے ''خرچ'' سے مصدر ''خرچنا'' بھی بنا لیا۔ یہ پہلے بہت عام تھا لیکن اب ذرا کم سننے میں آتا ہے۔ شیخ مبارک آبرو ؎

مفلس تو شید بازی کر کے نہ ہووے داتا سودا بنے گا اس کا جن نے کہ نقد خرچا

پھر، اردو والوں نے عربی کے طرز پر صیغۂ مبالغہ میں ''خراج'' بنایا، یعنی ''بہت خرچ کرنے والا''، جیسے ''فیض / فیاض''۔ پھر، اردو کے قاعدے سے ''خرچیلا'' بنایا، جیسے ''بھڑک / بھڑکیلا، رنگ / رنگیلا، چھب / چھبیلا'' وغیرہ۔ کسی بگڑے دل نے ''خرچی'' بمعنی ''طوائف کی اجرت''، وضع کر دیا اور پھر اس سے کئی محاورے وجود میں آ گئے۔

ملحوظ رہے کہ "خرچیلا" کے دونوں معنی درست ہیں: (۱) بہت خرچ کرنے والا، اور (۲) وہ کام جس میں بہت روپیہ خرچ ہو، یا ہونے کا امکان ہو۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ "خرچ" کا لفظ فارسی میں بالکل معدوم نہیں۔ ہندوستانی فارسی گویوں نے اسے ضرور لکھا ہوگا، کیوں کہ "بہار عجم"، اور اس کے حوالے سے "غیاث اللغات"، اور "فرہنگ آنند راج" میں درج ہے کہ یہ لفظ "عوام کالانعام" (عوام، جو مویشیوں کی طرح بے علم ہیں) میں رائج ہے۔ اردو میں بہر حال اسے عربی فارسی الفاظ کی طرح مع عطف و اضافت استعمال کیا گیا ہے، میر ؎

عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح کے خرج لا حاصل کو دولت چاہیے

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ میر نے "خرج" جیم عربی سے لکھا ہوگا۔ فورٹ ولیم ایڈیشن اس وقت سامنے نہیں، لیکن نول کشوری کلیات میر، مطبوعہ ۱۸۶۸، اور ظل عباس عباسی کا ایڈیشن (۱۹۶۷) جو فورٹ ولیم پر مبنی ہے، دونوں میں جیم فارسی سے "خرچ" ہی لکھا ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیں کہ میر نے جیم عربی سے "خرج" لکھا ہوگا، تو اس سے بھی کچھ بات بنتی نہیں، کہ مستند فارسی میں "خرج" مع جیم عربی کا وجود بمعنی "خرچ" مع جیم فارسی بہر حال مشکوک ہے۔ "نور اللغات" میں "خرج" ہے، لیکن اس سے بنے ہوئے کئی دوسرے الفاظ کا وہاں پتہ نہیں، اور نہ "خرچ" مع اضافت یا عطف کی کوئی مثال وہاں ملتی ہے۔ دیکھیے، "خرچ بالائی"۔

خرچا دیکھیے، "خرچ"؛ "خرچہ پانی"۔

خرچ بالائی امان علی سحر نے "خرچ بالائی" بمعنی "وہ رقم یا روپیہ پیسہ جو وجہ مقرری یا تنخواہ کے علاوہ کہیں سے ملے" استعمال کیا ہے۔ اس میں وہ برا مفہوم نہیں جو "بالائی آمدنی" میں ہے ؎

خرچ بالائی ملے جاتا ہے دست غیب سے گنج باد آورد ہے اپنے اڑانے کے لئے

میر کے حسب ذیل شعر میں یہ فقرہ عجب دلکش انداز میں اور انوکھے معنی میں استعمال ہوا ہے ؎

یاد میں اس قامت کی میں لوہو رو رو سوکھ گیا آخر یہ خمیازہ کھینچا اس خرچ بالائی کا

یہاں "بالائی" سے مراد ہے "بالا، یعنی قد، سے متعلق"، اور "خرچ بالائی" کے معنی ہیں "وہ خرچ جو [یار کے] قد کی خاطر کیا جائے۔" یعنی میں نے معشوق کے قد کی یاد میں اپنا خون

بے تحاشا خرچ کیا (میں لو ہو رو یا) اور نتیجے میں سوکھ کر رہ گیا [جس طرح درخت پانی کے بغیر سوکھ جاتا ہے]۔ لہٰذا ''خرچ بالائی'' کو ''فضول خرچی'' کے معنی میں لے سکتے ہیں۔

اس ترکیب کے معنی میں اکثر لغت نگاروں کو، حتیٰ کہ صاحب ''بہار عجم'' کو بھی، سہو ہوا ہے۔ انھوں نے ''خرچ بالائی'' کے تحت لکھا ہے کہ ہندوستانی فارسی میں اسے ''خرچ بالا دستی'' یا ''بالا خرچی'' بمعنی ''وہ خرچ جو معمولہ، مقررہ خرچ سے زیادہ ہو، یعنی وہ خرچ جس کے لئے حساب میں کوئی انتظام نہ ہو'' کے معنی میں بولتے ہیں۔ سند میں میرزا مظہر جان جاناں شہید کا شعر درج ہے ؎

گشت نقد اشک ماصرف ہوائے خوش قداں کرد مفلس عاقبت ایں خرچ بالائی مرا

دیوان میرزا مظہر جان جاناں شہید، مطبوعہ مطبع مصطفائی کانپور، ۱۸۵۵ء میں یہ شعر یوں ملتا ہے ؎

صرف عشق خوش قداں گردید نقد اشک من کرد مفلس عاقبت ایں خرچ بالائی مرا

ظاہر ہے کہ میرزا صاحب نے یہاں ''خرچ بالائی'' کو بالکل انھیں معنی میں لکھا ہے جن معنی میں ہم نے میر کے شعر میں اوپر دیکھا، اور اس میں بھی بہت کم شک ہے کہ میر نے اپنا شعر میرزا صاحب کا شعر سامنے رکھ کر کہا ہوگا۔ ''دیوان مظہر'' میں حاشیے پر اس شعر کے بارے میں یہ عبارت ملتی ہے: ''خرچ بالائی در محاورۂ اہل ہند بمعنی اسراف است۔'' اب یہ بات بھی بالکل صاف ہو گئی کہ امان علی سحر نے ''خرچ بالائی'' کسی اور مفہوم میں استعمال کیا ہے اور میرزا مظہر شہید اور میر نے اسے کسی اور معنی میں بطریق ایہام برتا ہے۔ دیکھئے، ''خرچ''۔

خرچنا دیکھئے، ''خرچ''۔

خرچہ دیکھئے، ''خرچ''؛ ''خرچہ پانی''۔

خرچہ پانی روزمرہ کا معمولی خرچ، یا روزمرہ کے معمولی خرچ کے لئے رقم کے معنی میں یہ فقرہ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' کے پہلے کسی لغت میں نہیں ملتا۔ ''لغت'' میں اسے ''خرچا پانی'' لکھا ہے اور سند جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' سے درج کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ''خرچا'' مع الف ہو ہی نہیں سکتا۔ ''خرچہ'' مع ہائے ہوز اردو میں موجود ہے، اسی پر ''پانی'' بڑھا لیا گیا ہے۔ ''خرچہ'' کا تلفظ مع الف ہے ہی نہیں، اسے ہمیشہ جیم فارسی کے فتح کے ساتھ بولتے ہیں۔ یعنی ''خرچہ'' بروزن ''پرچہ'' بولا جاتا ہے، بروزن ''چرچا'' نہیں۔ جوش صاحب نے اگر

''خرچا'' مع الف لکھا ہوگا تو اس عام غلط فہمی کے تحت کہ ''خرچ'' دیسی لفظ ہے، اس پر فارسی ہاے مختفی نہیں لگ سکتی۔ لیکن اس خیال میں کئی سقم ہیں۔ اول تو یہ کہ فارسی لفظوں کے آخر میں وارد ہونے والی ہر ہاے ہوز ہاے مختفی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ اگر فارسی میں ہاے مختفی ہے تو اردو میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا وجود اردو میں محال ہو (جیسے اردو میں ابتدا بسکون محال ہے)۔ اور تیسری بات یہ کہ ہر زبان کی طرح اردو کو بھی حق ہے کہ اپنے الفاظ کا املا متعین کرے۔ اردو میں ''خرچہ'' ہاے ہوز سے ہے اور ''خرچہ پانی'' بھی ہاے ہوز سے ہے۔ دیکھئے، ''خرچ''؛ ''ہاے مختفی''۔

خرچی دیکھئے، ''خرچ''۔

خرچیلا دیکھئے، ''خرچ''۔

خرگاہ دیکھئے، ''خر''۔

خرگوش دیکھئے، ''خر''۔

خرمن جدید ایرانی لہجے میں اول مفتوح ہے، پہلے زمانے میں مکسور بھی تھا۔ اردو میں ہمیشہ اول مکسور سنا گیا ہے اور اردو کے لئے یہی صحیح ہے۔

خطاب ان دنوں ٹی وی، ریڈیو، اور ہندی کے باعث کھیل کی انگریزی اصطلاح Title کا اردو ترجمہ ''خطاب'' کیا جا رہا ہے۔ ''خطاب'' کے معنی ہیں ''وہ نام جو حاکم یا عوام کسی شخص کو عطا کریں۔'' مثلاً ''خاقانی ہند'' ذوق کا خطاب کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا خطاب ''سر'' تھا۔ کھیل میں Title کی اصطلاح کے لئے اردو میں ''تمغا'' مستعمل ہے، اور وہی مناسب بھی ہے۔

غلط: آندرے اگاسی نے یو۔ ایس۔ اوپن کا سنگلس خطاب جیت لیا۔
صحیح: آندرے اگاسی نے یو۔ ایس۔ اوپن کا سنگلس تمغا جیت لیا / حاصل کر لیا۔
غلط: مکہ بازی میں ہیوی ویٹ خطاب جیتنے والا پہلا مسلمان محمد علی کلے ہے۔
صحیح: مکہ بازی میں ہیوی ویٹ تمغا جیتنے والا پہلا مسلمان محمد علی کلے ہے۔

خلاصہ کرنا ''خلاصہ'' ہمارے یہاں ''تلخیص'' یا ''مختصر بیان'' کے معنی میں ہے۔

صحیح: گذشتہ سبق کا خلاصہ کیجئے۔

صحیح: اس پوری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ۔۔۔

اس کے علاوہ ''کھل کر اجابت ہونا'' کے معنی میں بھی ایک محاورہ ''پاخانہ خلاصہ ہونا'' پورب کی عوامی اردو میں ہے۔ گذشتہ چند برس سے ''خلاصہ کرنا'' کو ہندی والے ''بات کی تفصیل بیان کرنا''، ''کسی معاملے کو صاف صاف بیان کرنا''، ''مبہم پہلوؤں کو کھول کر بیان کرنا'' کے معنی میں بولنے لگے ہیں اور افسوس کہ اردو میں بھی بعض لوگ اس بدصورت اور گراں فقرے کو برتنے لگے ہیں۔ اسے یک قلم ترک ہونا چاہئے:

غلط اور قبیح: ہر بات کا خلاصہ کرنا بہت ضروری ہے۔

صحیح و فصیح: ہر بات کو صاف صاف بیان کرنا/ ہر بات کا استقصا کرنا/ ہر بات کو مفصل بیان کرنا/ ہر بات کے مبہم پہلوؤں کو کھول کر بیان کرنا۔۔۔ وغیرہ۔

خلافت ''مخالفت'' کے معنی میں یہ لفظ ہندی والوں کی زبان سے سنا گیا ہے۔ اردو میں یہ معنی نہیں ہیں۔ اگر کوئی بولتا ہے تو اردو کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔

خلعت عربی میں اول مکسور ہے، اور پہلے زمانے میں اردو میں بھی اول مکسور سے اس لفظ کا تلفظ عام تھا۔ لیکن اب بولنے والوں کی اکثریت اول مفتوح بولتی ہے، اور اردو کی حد تک وہی صحیح ہے۔

خلقت بمعنی ''بنی آدم، مخلوق، ہجوم، عوام''، یہ لفظ دہلی میں اول مفتوح سے بولا جاتا ہے۔ ''آصفیہ'' اور شان الحق حقی نے اور کوئی تلفظ درج ہی نہیں کیا ہے۔ پلیٹس نے صرف اول مکسور لکھا ہے، جو اس لفظ کا رائج تلفظ ہے (دہلی کے باہر)۔ ''نور'' نے ''مخلوق'' کے معنی میں بفتح اول لکھا ہے، اور ''دنیا، آفرینش، بنی آدم'' کے معنی میں اول مکسور لکھا ہے۔ یہ باریک فرق کتابی زیادہ ہے، حقیقی کم۔ دہلی کے باہر ہر جگہ یہ لفظ اول مکسور سے سنا گیا ہے۔ اول مفتوح کے تلفظ کو دہلی کا علاقائی تلفظ کہنا چاہئے۔

خلوت عربی میں اول مفتوح ہے، لیکن اردو میں کبھی کبھی اول مکسور بھی سنا گیا ہے اور اردو کے لئے فی الحال دونوں کو صحیح ماننا چاہئے۔

خمسۂ ہاضمہ شراب کے پانچ پیالے جو صبح کو کھانے کے بعد ہاضم کے طور پر پیے جاتے ہیں۔
دیکھئے ''ثلاثۂ غسالہ'' ؛ ''سبعۂ نائمہ''

خنازیر اول مفتوح، یائے معروف، ''خنزیر'' کی جمع اور گلے کی ایک بیماری کا نام جسے ''کنٹھ مالا'' بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے ''خنزیر''۔

خنزیر اس لفظ کے دو معنی ہیں۔ (۱) ''خوک، سور'' (۲) ''کنٹھ مالا'' ایک بیماری ہے (انگریزی میں Scrofula) جس میں گردن میں پھوڑے نکلتے ہیں۔ اس کے ہر پھوڑے کو ''خنزیر''، اور بیماری کو ''خنازیر'' کہا جاتا ہے۔ اول مکسور، یائے معروف کے ساتھ لفظ ''خنزیر'' ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

خودرفتہ بعض لوگ ''خودرفتہ'' کو غلط قرار دیتے ہیں۔ شوق نیموی نے لکھا ہے کہ فارسی میں ''خودرفتہ'' دیکھا نہیں گیا، اور ''ازخودرفتہ'' میں اردو پن کم ہے، اس لئے میں نہ یہ لکھتا ہوں، نہ وہ لکھتا ہوں، ان کی جگہ میں ''آشفتہ'' لکھتا ہوں۔ سبحان اللہ، گویا فارسی کی اندھی تقلید میں اردو زبان کو دو اچھے بھلے فقروں سے محروم رکھا جائے۔ ''خودرفتہ'' کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور جہاں ضرورت ہو، یا اچھا معلوم ہو، وہاں ''ازخودرفتہ'' بھی لکھئے۔ مومن نے ''خودرفتہ'' باندھا ہے ؎

وصل کا عالم نظر میں آ گیا پھر نشہ خودرفتگی کا چھا گیا

خودرو جو درخت یا پودے آپ سے آپ اگیں یعنی جن کا بیج کسی نے ڈالا نہ ہو، انھیں ''خودرو'' کہتے ہیں۔ اس لفظ کا صحیح تلفظ واؤ معروف سے بروزن ''گلرو'' ہے۔ بعض لوگ واؤ مجہول سے بروزن ''خوشگو'' بولتے ہیں۔ یہ تلفظ بھی درست ہے۔ بعض لوگ رائے مہملہ کو مفتوح ادا کر کے ''رو'' کو بروزن ''سو'' بولتے ہیں۔ یہ تلفظ درست نہیں ہے اور ابھی پوری طرح رائج نہیں ہوا ہے، لہٰذا ''آپ سے آپ اگنے والا پیڑ/پودا'' کے معنی اس لفظ کو بروزن ''گلرو/خوشگو'' ہی بولنا چاہئے۔ ہاں ''آپ سے آپ چلنے والا'' کے معنی میں ''خودرو'' بروزن ''کچھ سو'' بالکل ٹھیک ہے۔

خودکشی بعض لوگ، خاص کر عورتیں، اسے چہارم مفتوح کے ساتھ بروزن ''بے کشی'' بولتی ہیں۔ یہ تلفظ درست نہیں۔ ''خودکشی'' میں چہارم مضموم ہے، بروزن ''دل خوشی''۔

خوش نشیں فیض کا شعر ہے ؎

خوش نشیں ہیں کہ چشم دل کی مراد دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

یہ لفظ ''نور اللغات'' اور ''آصفیہ'' میں نہیں ہے، پلیٹس میں ہے۔ پھر وہاں اور ''جامع اللغات'' کے حوالے سے ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں درج ہوا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں کوئی سند درج نہیں کی گئی، معنی حسب ذیل لکھے ہیں: ''مزے سے بیٹھا ہوا، کافی جگہ والا، نو وارد'' (ان آخری معنی کی تصدیق میں نہ کر سکا)۔ ''آنند راج'' میں معنی یوں لکھے ہیں: ''ایسا شخص جو وہیں بیٹھ جائے جہاں اس کا دل چاہے، ایسا شخص جو شہر یا دیہات میں اپنی روزی خود کماتا ہو اور اپنی مرضی کی زندگی جیتا ہو، خوش باش۔'' میرزا رضی دانش کا شعر ہے ؂

سیر گاہ خوش نشیناں حیا آئینہ است رو بہ خود کن خار خار گل پر آزارت کند

اثر لکھنوی نے ''فرہنگ اثر'' میں اپنے جائزۂ ''نور اللغات'' میں یہ لفظ درج نہیں کیا۔ ان لغات سے اس کی غیر حاضری کا سبب شاید یہ ہے کہ فیض سے پہلے کسی نے اسے اردو میں استعمال نہیں کیا۔ واضح رہے کہ اس لفظ میں ''نشیں'' بہ اخفائے نون ہے۔ دیکھئے ''دل نشیں''۔

خیریت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس لفظ کو بروزن مفعولن بولنا چاہئے۔ لیکن اردو میں بروزن فاعلن رائج ہے اور اردو کے لئے یہی درست ہے۔ اگر کوئی شخص بروزن مفعولن بولنے پہ مصر ہو تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔

دار بطور لاحقہ بہت سے اسما کے آخر میں ''دار'' لاحقہ فاعلی معنی دیتا ہے۔ ''نمبردار''، ''دلدار'' وغیرہ میں ''دار'' اسم فاعل ہے، اس کا مصدر ''داشتن'' ہے، بمعنی ''رکھنا''۔ لہٰذا یہاں ''دار'' کے معنی ہیں: ''رکھنے والا۔'' لہٰذا ''نمبردار'' وہ شخص ہوا جو کسی جگہ (عام طور پر گاؤں میں) کوئی ''نمبر'' (بمعنی درجہ، عہدہ'') رکھتا ہو۔ ان معنی میں ''لمبردار'' بھی صحیح ہے۔ ''دلدار'' کے معنی ہوئے ''وہ شخص جو دل [اپنے پاس] رکھتا ہو، یعنی معشوق، یا مہربان دوست''۔ اسی پر اور لفظوں کو قیاس کر لیجئے۔

دانش مند ''دانش مند'' بہت پرانا لفظ ہے، بمعنی ''عقل مند''۔ شیخ سعدی کا شعر ہے (گلستان) ؂

چار پائے بر و کتابے چند نہ محقق بود نہ دانش مند

''دانشور'' کے بھی یہی معنی تھے، لیکن یہ لفظ بہت پرانا نہیں ہے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' میں ''دانشور'' درج نہیں، ''نور اللغات'' میں ''دانشور'' بمعنی ''دانشمند'' ملتا ہے۔ زمانۂ حال میں انگریزی لفظ Intellectual کے معنی میں ''دانش ور'' بولتے ہیں۔

دانشور دیکھیے، ''دانش مند''۔

دائی ''دایہ'' کے معنی میں یہ لفظ فارسی ہے۔ بعض لوگ اسے پوربی ''گنوارو'' لفظ سمجھتے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں۔

دائی پلائی جو دائی بچے کو اپنا دودھ پلائے وہ دائی پلائی کہلاتی ہے۔

دائی جنائی وہ دائی جو بچہ پیدا کرانے کی خدمت انجام دے اسے دائی جنائی کہتے ہیں۔

دائی کھلائی وہ دائی جو بچے کی دیکھ بھال کرے، اسے کھلائے بہلائے وہ دائی کھلائی (گھمانے پھرانے، کھلانے والی) کہلاتی ہے۔

دخل و خرج دیکھیے، ''خرچ''۔

دخیل الفاظ دیکھیے، ''غیر زبانوں کے الفاظ''۔

دوا اول مفتوح، ''دایہ، دائی کھلائی'' کے معنی میں یہ لفظ دراصل فارسی لفظ ''دادا'' کا مخفف ہے۔ فارسی میں مخفف بن کر ''دوہ'' تھا، اردو میں ''دوا'' ہو گیا۔ دیبی پرشاد سحر بدایونی (''رسالۂ معیار الاملا'') نے قیاساً لکھا ہے لیکن صحیح لکھا ہے کہ ''دایہ'' کے معنی میں ''دوا'' مخفف ہے ''دادا'' بمعنی ''دایہ'' کا۔

دراصل یہ فقرہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی نئی بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے، یا کسی بات کی تردید کرنی ہوتی ہے۔ کسی مانی ہوئی بات، یا سامنے کی بات کے ساتھ اس فقرے کا استعمال لاحاصل ہے:

غلط: دراصل احتشام بہت بڑے نقاد تھے۔

صحیح: احتشام حسین بہت بڑے نقاد تھے۔

غلط: دراصل شاہجہاں کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔

صحیح: شاہجہاں کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔

غلط: دراصل انھیں یہ بات نہ کہنی چاہیے تھی۔

صحیح: انھیں یہ بات نہ کہنی چاہیے تھی۔

درشتگی دیکھیے، ''تاراشتگی''۔ کچھ لوگ یہ لفظ لکھنے لگے ہیں۔ لیکن ابھی یہ رائج نہیں ہوا ہے۔ ''درشتی'' کے ہوتے ہوئے ''درشتگی'' غیر ضروری ہے۔

درماہہ ''ماہانہ تنخواہ'' کے معنی میں یہ لفظ انیسویں صدی کی دہلی تک مروج تھا۔ مصحفی ؎

استاد کا کرتے ہیں امیر اب تو مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

بہار میں یہ لفظ انھیں معنی میں اب بھی بولا جاتا ہے، اور اب اس کو وہاں کے علاقائی محاورے میں شمار کرنا چاہیے۔

دریاؤ ''دریا'' کے معنی میں یہ لفظ اب صرف پوربی اردو میں سننے میں آتا ہے، اور وہ بھی شاذ۔ اب یہ لفظ صرف ''سئیسی علم دریاؤ ہے'' (یعنی گھوڑے کی دیکھ بھال اور اسے سدھانا سکھانا بہت بڑا علم ہے) میں عام استعمال کے لئے باقی ہے۔ (لفظ ''علم'' اس کہاوت میں بروزن ''شکم'' بولا جاتا ہے) فارسی میں چونکہ ''دریا'' کو ''دریاب'' بھی کہتے ہیں، لہٰذا اغلب ہے کہ ''دریاؤ'' اسی کی ہندوستانی شکل ہے۔ دیکھیے، ''دریائے''۔

دریائی گھوڑا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

دریائی مچھلیوں کے نام دریائی مچھلیوں کے نام عموماً مذکر ہیں، مثلاً ''روہو''، ''مہاشیر'' وغیرہ۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''؛ ''جانوروں کے نام''۔

دریائے بمعنی ''دریا''۔ یہ لفظ فارسی میں نہیں دیکھا گیا۔ ''دریاب'' اور ''دریا'' اسی معنی میں وہاں ضرور مستعمل ہیں۔ اقبال نے غالباً ''جا/جائے، خدا/خدائے'' کے قیاس پر یہ نہایت خوبصورت تصرف کیا۔ ''محراب گل افغان کے افکار'' میں ہے ؎

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریائے جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

ایک بات یہ بھی ہے کہ اس نظم میں اقبال نے جو بحر استعمال کی ہے اس میں آخر مصرع میں ایک

فاصل حرف ساکن ضروری ہے۔ لہذا ممکن ہے اقبال نے اس ضرورت کی بنا پر ''دریائے'' لکھ دیا ہو۔ ہے یہ بہر حال بہت خوبصورت۔ دیکھیے، ''جائے''؛ ''دریاؤ''۔

دریتیم دیکھیے، ''یتیم''۔

دکھلایئے ''ہم دکھائیں'' یا ''میں دکھاؤں'' کے معنی میں یہ دلی کا روزمرہ ہے۔ سودا ؎

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

مزید دیکھیے، ''ڈھونڈیئے''؛ ''سنایئے''؛ ''کیجیے''؛ ''منگوایئے''۔

دکھنا ''دکھائی دینا'' کے معنی میں ''دسنا'' پرانی اردو میں موجود تھا، شاہ مبارک آبرو ؎

گردش انکھیاں میں وہ برچھی تگ قاتل مجھے یوں دسے تروار کوئی جیسے دھری ہو سان کی

دسّی ہے نجوموں کی سفیدی میں سیاہی جاتے ہی مکاں لیوے گا یہ شیر الٰہی

(نظیر اکبر آبادی، نظم ''خیبر کی لڑائی'')

افسوس کہ ''دسنا'' ترک ہو گیا، لیکن اب اس کی جگہ ''دکھنا'' کو فروغ دینا عقلمندی نہیں، کہ یہ لفظ بھونڈا ہے۔ علاوہ بریں اسے ہندوستانی عیسائیوں (یا Brown Sahibs) نے رائج کیا تھا۔ اردو میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ شیکسپیر، ''آصفیہ'' اور ''نور اللغات'' میں یہ لفظ درج نہیں ہے۔ پلیٹس نے ''دکھنا'' لکھا ہے، لیکن اسے ''مقامی بولی'' (Dialect) بتایا ہے، کس جگہ کی مقامی بولی، یہ صراحت نہیں۔ فیلن (Fallon) نے بھی ''دکھنا'' درج کیا ہے لیکن اسے ''مخصوص بہ مسلمانان'' لکھا ہے، جو حیرت انگیز نہیں تو دلچسپ ضرور ہے، کہ میں نے کسی مسلمان کو ''دکھنا/دکھاتا'' یا ان کی تصریفی شکلیں بولتے نہیں سنا۔ ممکن ہے بعض علاقوں میں یہ لفظ وسط انیسویں صدی کے بعد رائج ہوا ہو، لیکن صاحبان ''آصفیہ'' و ''نور'' اسے جدید اردو نہیں مانتے، اور نہ ہی میں مانتا ہوں۔ پروفیسر گیان چند کا خیال تھا کہ ''دسنا'' شمالی ہند کی اردو میں نہیں تھا۔ لیکن مندرجہ بالا مثالیں اس کا وجود شمالی ہند میں ثابت کرتی ہیں۔ جناب عبد الرشید نے مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ شمالی ہند کی پرانی اردو میں ''دکھنا'' بھی تھا۔ وہ کہتے ہیں، ''ممکن ہے پرانے ادب میں یہ فعل رائج رہا ہو اور بعد میں اس کا استعمال کم ہوتا چلا گیا۔''

دل اول مفتوح، یہ لفظ ''جماعت، پارٹی''، خاص کر ''سیاسی جماعت یا پارٹی یا گروہ'' کے معنی

میں ہندی میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں موخر الذکر معنی بالکل نہیں ہیں، لہٰذا اردو میں ایسا صرف بالکل غلط ہے جس میں ''دل'' کے معنی ''جماعت، پارٹی، یا سیاسی پارٹی یا گروہ'' کے نکلیں۔ ان معنی میں اردو میں ''پارٹی'' اور ''جماعت'' ہی مستعمل ہیں۔ حسب ضرورت عربی لفظ ''حزب'' بھی بول دیتے ہیں۔

ایک جماعت یا پارٹی چھوڑ کر دوسری جماعت یا پارٹی میں شامل ہونے کو ہندی میں ''دل بدلی''، اور جو شخص یہ عمل کرتا ہے اسے ''دل بدلو'' (واؤ معروف) کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ یہ قبیح اور بھونڈے الفاظ اردو میں بھی اپنائے جا رہے ہیں۔ ایک جماعت یا پارٹی یا گروہ کو چھوڑ کر دوسری جماعت یا پارٹی یا گروہ میں جانے والے کو ''خروجی'' یا ''مخارج'' کہہ سکتے ہیں اور پارٹی چھوڑ کر دوسری جماعت یا پارٹی یا گروہ میں جانے کے عمل کو ''مخارجت'' کہہ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ ''خروج'' بمعنی ''بغاوت'' تاریخ اسلام میں مستعمل ہے، اور اپنے رہنما کو چھوڑ کر اپنی راہ اختیار کرنے والے کو بعض حالات میں ''خارجی'' کہا گیا ہے۔ لہٰذا ''خروج'' اور ''مخارجت'' کے پیچھے مناسب تاریخی پس منظر بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''دل بدلو'' اور ''دل بدلی'' میں جماعت یا پارٹی یا گروہ کو مطلقاً چھوڑ جانے کا مفہوم نہیں ہے، صرف یہ مفہوم ہے کہ ایک جماعت یا پارٹی یا گروہ چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا جائے۔ ''خروجی'' اور ''مخارجت'' میں یہ مفہوم بھی ہے، لہٰذا یہ الفاظ ''دل بدلو'' اور ''دل بدلی'' سے زیادہ جامع ہیں۔ ظفر احمد صدیقی کو ان عربی الفاظ پر اعتراض ہے کہ بہت ثقیل ہیں، لیکن مجھے باوجود غور و فکر کوئی اور مصطلحات سوجھے نہیں۔ اگر ان سے سبک تر مل سکیں تو بہت خوب، لیکن ''دل بدلی'' اور ''دل بدلو'' کو ضرور چھٹی ملنی چاہئے۔

دل بدلو دیکھئے، ''دل''۔

دل بدلی دیکھئے، ''دل''۔

دل اول مکسور، بمعنی Heart۔ ''دل'' اور ''جی'' کے فرق کے لئے دیکھیں، ''جی''۔

دل پھینک اردو زبان کی شانوں میں ایک شان یہ بھی ہے کہ فارسی لفظ یا دیسی لفظ کے ساتھ کسی دیسی مصدر کا امر لگا کر نیا لفظ بنا لیتے ہیں۔ ''دل پھینک'' ایسا ہی لفظ ہے، بمعنی ایسا شخص جو بہت جلد، اور مختلف لوگوں پر، عاشق ہو جاتا ہو یا لوگوں پر بآسانی اور بکثرت مائل ہو جاتا ہو۔

اسی طرح، دل جلا: گردن توڑ: گرہ کاٹ: مردمار: وغیرہ الفاظ بھی ہیں۔

دل نشیں "نشیں" کا لاحقہ رکھنے والے تقریباً تمام الفاظ اردو میں بہ اعلان نون بولے جاتے ہیں، مثلاً:

تخت نشین، جانشین، خانہ نشین، فیل نشین، کرسی نشین، گدی نشین، مسند نشین، موڑ نشین

"دل نشیں" اور "خوش نشیں" مستثنیات میں ہیں، کہ ان میں اخفاے نون ہے۔

دن/ دنوں دیکھیے، "برس/ برسوں"۔

دنگا ہمارے یہاں یہ لفظ عام طور پر معمولی جھگڑے فساد، یا شرارت، کے لئے بولا جاتا ہے۔ تنہا اسے بہت کم بولتے ہیں، ورنہ یہ "دنگا فساد" کی شکل میں مستعمل ہے۔ تنہا بولا جائے تو ہلکے مزاح کے رنگ میں بولتے ہیں۔

صاحب، دیکھو تم پھر دنگا کرتے ہو (غالب بنام مرزا تفتہ، مورخہ غالباً ۱۸۵۴)۔

ظفر اقبال ؎

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا بن جائے گا بات کا بتنگا

عام لڑائی یا نقض امن کے معنی میں اردو میں "بلوہ"، "فساد" دو لفظ مستعمل ہیں۔ روز کی بول چال میں اکٹھا بھی بول دیے جاتے ہیں، "بلوہ فساد"۔ "بلوہ کرنے والے/ والوں کو "بلوائی" اور فساد کرنے والے/ والوں کو "فسادی" کہتے ہیں۔ ہندی والوں کو شاید کسی بنا پر "بلوائی/ فسادی" پسند نہیں، اس لئے انھوں نے "دنگائی" بنالیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ بدصورت لفظ اردو میں نہیں ہے۔ بعض لوگ اسے اردو میں لانا چاہتے ہیں لیکن یہ سراسر زیادتی ہے کہ دو نہایت اچھے لفظوں کو چھوڑ کر ایک نہایت بھونڈا لفظ اختراع کیا جائے۔ اردو میں "دنگئی" ضرور ہے، لیکن اب یہ بہت کم سننے میں آتا ہے، اور عام طور پر "شرارتی، جھگڑالو" شخص کے لئے صیغۂ واحد میں بولا جاتا ہے، "بلوائی" یا "فسادی" کے معنی میں نہیں۔

دنگائی دیکھیے، "دنگا"۔

دنگئی دیکھیے، "دنگا"۔

دنیا عربی میں الف مقصورہ سے "دنیٰ" تھا۔ اردو فارسی میں سیدھے الف ہی سے صحیح ہے۔

دنیاوی قاعدے کے لحاظ سے یہ لفظ ''دنیوی'' ہونا چاہئے تھا، یعنی ''دینی/دنیوی''۔ لیکن اردو والوں نے ''دنیا'' میں سیدھا الف فرض کر کے یائے نسبتی لگائی، اور الف مقصورہ فرض کر کے یائے نسبتی کے پہلے واؤ لگا دیا! اسے لفظ سازی میں تخلیقی غلط مبحث ہی کہا جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ قاعدے کے مطابق جو صحیح لفظ بنایا ''دنیوی''، وہ بھی اردو میں انھیں معنی میں رائج ہے۔

دنیوی اول مضموم، سوم مفتوح، بمعنی ''دنیاوی''۔ اصل عربی لفظ ہے۔ لیکن اب اردو میں ''دنیاوی'' زیادہ رائج ہو گیا ہے۔ ''دنیوی'' بھی بولتے ہیں، مثلاً ''دینی و دنیوی''۔ لیکن اس کا چلن اب کم ہے۔ اردو میں بہر حال دونوں درست ہیں۔

دو واؤ مجہول، بمعنی Two۔ فارسی میں واؤ معروف سے بولتے ہیں۔ ہمارے مشرقی علاقوں کی زبانوں مثلاً بھوج پوری میں، اور اودھی میں بھی واؤ معروف ہی بولتے ہیں۔ ''دوئی'' بمعنی Twoness میں بھی اردو فارسی دونوں میں واؤ معروف ہے۔ بعض لوگ مصر ہیں کہ فارسی میں لفظ ''دو'' محض نیم سبب ثقیل، یعنی ف مفتوح کے برابر بولا جاتا ہے۔ یہی لوگ اس پر بھی مصر ہیں کہ ترکیبی صورت میں اردو میں بھی اسے محض نیم سبب ثقیل بولنا چاہئے۔ یہ دونوں خیالات غلط ہیں۔ اردو فارسی دونوں میں اس لفظ کا اصل تلفظ بروزن یک سبب خفیف، یعنی بروزن فع بھی ہے۔ امیر خسرو ؎

زفکر دو جہاں آزاد باشم اگر تو ہم نشین بندہ باشی

میر کا شعر ہے ؎

ہم بھی عالم فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں اتنے دل کے تنگ نہیں

میر منشی محمد پادشاہ شاد، مولف ''فرہنگ آنند راج'' نے اپنا قطعہ نقل کیا ہے جس میں ''دو'' کے دونوں تلفظ آ گئے ہیں ؎

دو بود چار شد از تیغ شاہ مرکب و مرد بلے دو چار شود چوں بہ تیغ گشت دو چار
بہ کف بر تن کاں تیغ برق سیر رسید ز تنگ توسن تازی بخاک کرد گذار

یہ بات صحیح ہے کہ ''دو'' کو جب کسی فقرے یا ترکیب میں ڈالتے ہیں تو اردو فارسی دونوں ہی میں

اس لفظ کو اکثر بروزن ف مضموم، یعنی بروزن نصف سبب ثقیل ہی ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اردو فارسی میں بہت سے کلمے ایسے بھی ہیں جن میں "دو" کو پورا ہی ادا کیا جاتا ہے، مثلاً:

دوجدو [اردو، فارسی]: دوتہی [فارسی]: دوتوک [اردو]: دودل [اردو، فارسی]: دوغلا [اردو]: دوموتہی/دوموہی/دومہی [اردو]

دوا یہ لفظ عبرانی الاصل ہے۔ عربی میں آخر میں ہمزہ ہے، اور دال پر تینوں حرکات درست ہیں۔ اردو میں ہمزہ کے بغیر اور صرف اول مفتوح سے رائج ہے۔ واؤ ملفوظ و معروف کے ساتھ یہ "دو کا پتہ، یا پانسے میں دو کا نشان" کے معنی میں مذکر ہے۔ دیکھئے، دیکھئے: "دوائی": "دوئی"۔

دوائی یہاں چھوٹی ی یائے نسبتی نہیں ہے، مزید علیہ ہے۔ اس لفظ کو بمعنی "دوا"، دلی اور پنجاب اور کہیں کہیں پورب میں بولتے ہیں۔ اسے ان دیار کا علاقائی لفظ سمجھنا چاہئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ عام اردو والے اب "دوائی" نہیں بولتے، لیکن فارسی میں یہ موجود ہے۔ مندرجہ ذیل شعر "بہار عجم" میں علی خراسانی کے نام سے، اور "آنندراج" میں امیر خسرو کے نام سے درج ہے ؎

غمزۂ شوخت جراحت می کند   ہر کرا العلت دوائی می کند

کلیات خسرو میں ایک غزل اس زمین و بحر میں ہے تو، لیکن یہ شعر نہیں، لہٰذا اغلب ہے کہ شعر علی خراسانی کا ہو۔ خان آرزو نے "چراغ ہدایت" میں لکھا ہے کہ "دوائی" متاخرین کا تصرف ہے۔ اس سے بھی گمان گذرتا ہے کہ محولہ بالا شعر علی خراسانی کا ہوگا۔ حسب ذیل شعر اشرف مازندرانی کا ہے ؎

بادہ در خم کہنہ چوں گردد دوائی می شود   دختر رز پیر چوں شد مومیائی می شود

دلچسپ بات یہ ہے کہ خود "مومیائی" میں یائے زائدہ ہے، اصل لفظ "مومیا" ہے، بمعنی "وہ مرہم جس کو لگانے سے ٹوٹی ہوئی ہڈی فوراً جڑ جاتی ہے"۔

دو چار اس کلمے کا تلفظ بروزن مفعول بھی ہے، اگرچہ عموماً بروزن فعول سنا جاتا ہے، بیخود دہلوی ؎

کیسا کٹا ہے غیر جو دوچار ہو گیا   میرا دم اس کو خنجر خونخوار ہو گیا

فارسی میں "دوچہار" بھی ہے، فرخی ؎

ہر کہ با تو بجنگ شود دو چہار　　　　با ظفر زد و او یکیست ہر ب

دیکھیے: ''دو''۔

دو چشمی تصویر　　ایسی شبیہ جس میں پورا چہرہ دکھائی دے۔ دیکھیے: ''نیم رخ تصویر''۔

دو چشمی ہ (ھ) کا غلط استعمال　　اردو میں دو چشمی ہ (ھ) صرف اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کسی اور حرف کے ساتھ ہ کی آواز کو ظاہر کرتا ہو۔ لہٰذا یہ لفظ کے شروع میں ہرگز نہ آئے گی۔ مثلاً ''ھندوستان، ھرجانہ، ھمیشہ، ھوا، ھوتا، اللہ ھو، ھاتھی'' وغیرہ۔ یہ سب بالکل غلط املے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں دو چشمی ہ (ھ) کا استعمال ضروری ہے: ''اٹھا، گھاتا، باندھنا، دھن، نگاڑھا، نتھا، بدھ، سکھ'' وغیرہ۔ جہاں پر ہائے ہوز (خواہ ملفوظ والی، یا کہنی دار) ہے، اس کی جگہ پر دو چشمی ہ (ھ) بالکل نہیں آئے گی۔ چنانچہ حسب ذیل املے سب غلط ہیں: نھیں (صحیح نہیں)؛ کھنا (صحیح، کہنا)؛ رھنا (صحیح، رہنا) وغیرہ۔ اسی طرح، جہاں دو چشمی ہ (ھ) لفظ کے بیچ میں ہو، وہاں بھی ہائے ہوز نہیں لگ سکتی۔ مثلاً حسب ذیل املے غلط ہیں: پڑہنا (صحیح، پڑھنا)؛ انہیں (صحیح، انھیں)؛ جنہیں (صحیح، جنھیں)؛ مجہے (مجھے) انہوں (صحیح، انھوں)؛ تمہیں (صحیح، تمھیں)؛ تمہارا (صحیح، تمھارا)، وغیرہ۔

دو چہار　　واؤ معروف، بمعنی ''دو چار''، فارسی میں ہے، اردو میں نہیں دکھائی دیا۔ دیکھیے: ''دو چار''۔

دودلہ　　بروزن فاعلن، فارسی میں واؤ معروف پوری بولی جاتی ہے، اردو میں واؤ مجہول ہے لیکن یہاں بھی پوری بولی جاتی ہے، سوم مکسور اور چہارم مفتوح۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''دودلہ'' فارسی میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''متردد، یا جو شخص دو اشیا کے درمیان فیصلہ نہ کر سکے'' کے معنی میں یہ لفظ ''فرہنگ جہانگیری'' اور ''سرمۂ سلیمانی'' میں درج ہے۔ یہ دونوں لغات عہد جہانگیری کی ہیں اور نہایت مستند ہیں۔ بعد کے لغات میں ''شمس اللغات'' اور ''فرہنگ آنندراج'' میں اس لفظ کا اندراج ہے۔

دوغلا　　بعض لوگ ''دوہرا/دہرا''، ''دورنگا'' وغیرہ کی جگہ ''دوغلا'' لکھنے لگے ہیں۔ اس غلط استعمال سے لفظ ''دوغلا'' کے اصل معنی بیان کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہ رہ جائے گا۔

غلط: بی۔ جے۔ پی۔ کے دوغلے معیار پر تنقید کی گئی۔
صحیح: ۔۔۔ دوہرے ۔۔۔

غلط: سیاسی جماعتیں دوغلے بیانات دینے کے لئے بدنام ہیں۔
صحیح: ۔۔۔ دوہرے/دورنگے ۔۔۔

غلط: کہنا کچھ اور کرنا کچھ، یہ دوغلا پن ٹھیک نہیں۔
صحیح: ۔۔۔ یہ دورنگا پن ۔۔۔

صحیح: دوغلی نسل کے کتے اکثر بہت ہوشیار نکلتے ہیں۔

صحیح: سفید اور سیاہ نسل کے ملاپ سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے انگریزی میں جتنے لفظ ہیں سب میں ''دوغلا'' کا مفہوم ہے۔

دومہی سانپن بعض سانپوں کو دومنھ والا فرض کرتے ہیں۔ ایسے سانپ کو (بلا تخصیص نر یا مادہ) دومہی/موہی/موہی سانپن کہتے ہیں۔ اب یہ اصطلاح بہت کم بولی جاتی ہے۔ عام طور پر ''دومہا/موہا سانپ'' (بے تخصیص نر یا مادہ) کہتے ہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

دوئی واؤ معروف غیر ملفوظ، بروزن فعل یا بروزن ''ہوئی''، بمعنی ''دو ہونا، انگریزی میں Twoness، غیریت''۔ فارسی میں یہ لفظ نہیں ہے۔ پلیٹس کا کہنا ہے کہ یہ ''دوا'' بمعنی ''دو کا پتہ، یا پانسے میں دو کا نشان'' وغیرہ کی تانیث ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''دوا'' کی تانیث کی حیثیت سے اس کے معنی ''دو ہونا، یا Twoness'' نہیں، اور ''دوا'' میں واؤ پوری ادا کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ''دوئی'' میں واؤ صرف اعراب بالحرف کا کام کرتا ہے۔ میر درد؎

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منھ دکھا سکے

دھار اس لفظ کے دو معنی ہیں اور دونوں معنی میں یہ لفظ مذکر ہے: (۱) کسی چیز، ہتھیار، یا اوزار کا وہ حصہ جس میں کاٹ ہوتی ہے، یا کاٹنے کی صفت اور قوت، جیسے تلوار کی دھار، اور (۲) کسی رقیق کی لمبی پتلی فوارہ نما بوچھار، جیسے دودھ کی دھار، روشنی کی دھار۔ ''دھارا'' اور ''دھار'' فرق یہ ہے کہ دھارا کسی سطح پر بہتا ہے اور دھار ہوا پر بہتی ہے۔ دیکھئے، ''دھارا''۔

دھارا اردو میں یہ لفظ مذکر ہے، مثلاً ''تیل کا دھارا، پانی کا دھارا'' وغیرہ۔ ہندی میں انھیں معنی میں اسے مونث برتتے ہیں اور بعض اردو والے بھی ایسا ہی کرنے لگے ہیں، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھیے، ''دھار''۔

دہانہ اول مفتوح۔ ''دہان'' پر ہائے ہوز مزید علیہ ہے، معنی ایک ہیں۔ اردو میں تھوڑا سا فرق ہے کہ سرنگ، چشمہ، غار، یا اس طرح کی تنگ چیزیں جو زمین سے اوپر آتی ہیں، ان کے منھ کو ''دہن/دہان'' نہیں بلکہ ''دہانہ'' کہتے ہیں۔ دیکھیے، ''آوازہ''؛ ''دہنہ''؛ ''ہائے ہوز کا اضافہ لفظ کے آخر میں''۔

دھر پکڑ یہ فقرہ ہمیشہ مزاحیہ، یا پھر بے تکلف گفتگو میں استعمال ہوتا ہے۔ سنجیدہ یا وزنی معاملات میں اس کا دخل نامناسب ہے، ہندی والے بولتے ہیں تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔

نامناسب: واردات کے بعد مجرموں اور مشکوک لوگوں کی دھر پکڑ شروع ہوئی۔

درست: ۔۔۔ کی گرفتاریاں تیزی سے شروع ہوئیں۔

دہشت گرد اصل لفظ ''دہشت گردی'' ہے، جس سے چھوٹی ی حذف کر کے ''دہشت گرد'' بھی بنا لیا گیا۔ انگریزی میں اسے Back Formation کہتے ہیں۔ دیکھیے، ''گرد بطور لاحقہ''۔

دھکا مکی ''ہاتھا پائی'' کے معنی میں یہ بدصورت اور بدآہنگ لفظ ہندی والوں کا تراشا ہوا ہے۔ افسوس کہ بعض لوگ اسے اردو میں بھی لکھنے لگے ہیں۔ اردو میں ''ہاتھا پائی'' غیر مزاحیہ اور مزاحیہ دونوں اسلوب میں کارآمد ہے۔ تنہا مزاحیہ اسلوب کے لئے انھیں معنی میں ''دھینگا مشتی'' اور ''لپاڈگی'' موجود ہیں۔ اتنے بہت سے عمدہ الفاظ کے ہوتے ہوئے ''دھکا مکی'' جیسا کریہہ لفظ ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔

دہنہ اول سوم مفتوح، بمعنی ''منھ''، مثلاً ''سرنگ کا دہنہ''۔ وحید قریشی نے بتایا ہے کہ انسان کے دہن کو پنجابی میں ''دہن'' اور جانور کے منھ کو ''دہانہ'' کہتے ہیں۔ دیکھیے، ''آوازہ''؛ ''دہانہ''۔

دھول چٹانا انگریزی کے لازم محاورے To bite the dust بمعنی ''شکست کھانا'' کو ہندی میں متعدی بنا کر ''دھول چٹانا'' اہل ہندی کی ایجاد ہے۔ اردو میں اس محاورے کا وجود نہیں

لیکن افسوس کہ بعض اردو اخباروں میں دیکھنے کو آتا ہے۔ اس کا ترک لازم ہے۔

دے اول مفتوح، دیکھئے: ''ریگنا''۔

دیر رات ''رات گئے'' یا ''دیر گئے'' یا ''رات کو دیر گئے'' کے ہوتے ہوئے اس فقرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے ہندی سے لے کر بعض اخبار نویسوں نے ہمارے یہاں عام کرنا چاہا ہے۔ اسے ترک ہونا چاہئے۔

دیر شام یہ فقرہ ''دیر رات'' سے بھی بدتر ہے۔ اسے late in the evening کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ''شام کو دیر گئے''، ''شام کے وقت دیر گئے'' وغیرہ کہنا چاہئے۔ یہ استدلال غلط ہے کہ انگریزی فقرے کا ترجمہ اس لئے بہتر ہے کہ اس میں دو ہی لفظ ہیں۔ ایسا تو انگریزی ہی کیا، فارسی عربی کے کئی الفاظ اور فقروں کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ان کا ترجمہ کئی لفظوں میں سمائے گا۔ تو کیا اختصار کی خاطر ہم اپنی زبان چھوڑ دیں؟

دیری یہ لفظ اردو میں نہیں ہے۔ جہاں جہاں ''دیری'' بولا جائے، وہاں ہر جگہ ''دیر'' بول سکتے ہیں:

غلط اور فضول: ان کے آنے میں ابھی دیری ہے۔

صحیح: ان کے آنے میں ابھی دیر ہے۔

غلط اور فضول: ان کی گاڑی دیری سے آئی۔

صحیح: ان کی گاڑی دیر سے آئی۔

دیمک یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

دیوان دیکھئے: ''صاحب دیوان''۔

ڈاک ٹکٹ ''ٹکٹ'' بمعنی ''ڈاک ٹکٹ'' کے لئے اردو میں لفظ ''ٹکرا'' بولا جاتا تھا لیکن عام نہ ہوا۔ در بالآخر Postage stamp کے لئے ''ڈاک ٹکٹ'' اور پھر صرف ''ٹکٹ'' رائج ہو گیا۔ اور اب یہی درست و فصیح ہے۔

ڈانٹ پڑنا ''ڈانٹ لگنا'' یا ''ڈانٹ پڑنا'' کے معنی میں یہ محاورہ پہلے انگریزی اسکولوں کے

بچے بولتے تھے، لیکن اب یہ بعض اوقات تحریری اردو میں بھی نظر آنے لگا ہے۔ یہ قطعی نامناسب اور واجب الترک ہے۔

ڈبہ، ریل کا ریل کے ڈبے یعنی Compartment کے لئے لفظ ''کمرہ'' شروع شروع میں بولا اور لکھا گیا، لیکن جلد ہی ''ڈبہ'' رائج ہوگیا۔ اور اب یہی درست ہے۔

ڈھانپنا معنی اور زور کے لحاظ سے ''ڈھانپنا'' اور ''ڈھانکنا'' میں کوئی فرق نہیں۔ ان دنوں ''ڈھانکنا'' زیادہ مستعمل ہے، لیکن بعض موقعوں پر ''ڈھانپنا'' بہتر معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

دھوپ میں سر کو ڈھانپے رہنا بہتر ہے۔

برتن کو ڈھانپ کر رکھئے۔

ملحوظ رہے کہ ''ڈھانکنا'' کی ایک شکل ''ڈھکنا'' بھی ہے، اور ''ڈھانپنا'' کی ایک شکل ''ڈھپنا'' بھی ہے، لیکن ''ڈھپنا'' اب مستعمل نہیں۔ مثلاً:

اماں جان سر ڈھک لو (''توبۃ النصوح'')۔

یہاں ''سر ڈھپ لو'' نہیں کہہ سکتے۔ یا:

ان کے عیب ڈھک گئے۔

یہاں ''ڈھپ گئے'' نہیں کہہ سکتے۔ اسی پر اور کو قیاس کرلیں۔

اماں جان سر ڈھک لو (''توبۃ النصوح'')۔

ڈھانکنا دیکھئے: ''ڈھانپنا''۔

ڈھپنا دیکھئے: ''ڈھانپنا''۔

ڈھونڈیئے ''بانگ درا'' میں اقبال کا شعر ہے ؎

نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیئے کہ یہاں ستم کش تپش نا تمام کرتے ہیں

اس پر جوش ملسیانی مرحوم نے ''اقبال کی خامیاں'' میں لکھا ہے: ''شمع کے لئے 'ڈھونڈ' کہنا چاہئے، مگر 'ڈھونڈیئے' کہا گیا ہے، گویا 'شمع' کے پہلے 'جناب' محذوف ہے۔'' حضرت جوش ملسیانی بڑے بلند پایہ استاد تھے، لیکن یہاں ان سے چوک ہوگئی۔ دراصل یہاں ''ڈھونڈیئے'' کا فاعل ''شمع'' نہیں، بلکہ خود متکلم ہے، اور یہاں ''ڈھونڈیئے'' کے معنی ہیں، ''میں ڈھونڈوں/ہم

ڈھونڈیں۔ ''مضارع کی اس شکل میں فاعل محذوف رہتا ہے کیونکہ یہاں خود فعل کے اندر فاعل کا مفہوم موجود ہے۔ مضارع کا یہ محاورہ دلی میں عام تھا، اور اب بھی سنائی دے جاتا ہے۔ دیکھیے، ''سنایئے''؛ ''کیجیے''؛ ''منگوایئے''۔

ڈیرا آج کل اس لفظ کو ''عارضی قیام گاہ'' کے معنی میں کبھی کبھی بولتے ہیں، ورنہ عام طور پر یہ ''ڈیرہ [یا ڈیرا] خیمہ'' کے روزمرہ کے طور پر مستعمل ہے، اور زیادہ تر ہلکے، مزاحیہ مطالب کے لئے صرف ہوتا ہے۔ دہلی میں انیسویں صدی کے وسط تک اسے ''گھر، مستقر، مستقل قیام گاہ'' کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے، میر سوز ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

کوے قاتل کو چلے ہیں پر بجا لائیں گے شکر
ہم سلامت پھر کے جس دم اپنے ڈیرے آئیں گے

(بہادر شاہ ظفر)

پورب، خاص کر بہار میں اس لفظ کو ''گھر، مستقر، مستقل قیام گاہ'' کے معنی میں اب بھی بولتے ہیں۔ ان معنی میں اب اسے پورب اور بہار کا مقامی روزمرہ سمجھنا چاہئے۔

ذرہ میر کا شعر ہے ؎

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

یہاں ''ذرہ'' بمعنی particle نہیں، بلکہ بمعنی ''ذرا سا'' ہے۔ یعنی ''ذرہ'' یہاں ''ذرا'' کا ایک روپ ہے۔ جنوب کی اردو میں، خاص کر اورنگ آباد اور گلبرگہ میں یہ اب بھی سنائی دیتا ہے۔

ذریعہ فعل مجہول کے شوق میں ہمارے اخبار اور بعض ''ادیب'' بھی یوں لکھنے لگے ہیں:

غلط اور مکروہ: پولیس کے ذریعہ چلائی گئی گولی۔۔۔

غلط اور مکروہ: حکومت کے ذریعہ دیے گئے بیان۔۔۔

غلط اور مکروہ: اس کے ذریعہ لکھے گئے خط۔۔۔

غلط اور مکروہ: حزب مخالف کے ذریعہ لگایا گیا الزام۔۔۔

ان اور ان کی طرح کے اور استعمالات میں کراہیت تو ہے ہی، ان کے معنی بھی درست نہیں۔ مثلاً،

پہلے فقرے میں کہنا چاہا ہے کہ ''گولی جو پولیس نے چلائی''۔لیکن کہا گیا ہے ''گولی جو کسی اور شخص نے پولیس کو ذریعہ بنا کر چلوائی۔'' یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ پولیس نے گولی خود نہیں چلائی بلکہ کسی اور نے پولیس کے کہنے پر چلائی۔ اگر صیغۂ مجہول پر اصرار ہو تو مندرجہ بالا فقروں کو یوں ہونا چاہئے:

پولیس کی گولی / پولیس کی چلائی ہوئی گولی۔۔۔

حکومت کے بیان۔۔۔

اس کے لکھے ہوئے خط۔۔۔

حزب مخالف کا الزام۔۔۔

ملحوظ رہے کہ ''گئی / گئے / گیا'' کی جگہ ''ہوئی / ہوئے'' کہتے، جو انسب ہے، تو ''کے ذریعہ'' کا فقرہ خود بخود رفع ہو جاتا۔

راج بمعنی ''ہوشیار معمار''۔ بعض لوگ اسے ہندوستانی خیال کرتے ہیں۔ وحی پرشاد سحر بدایونی مرحوم نے اس کی اصل ''راز'' بتائی ہے۔ لیکن جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے دکھایا ہے، اصل لفظ ''راج'' ہی ہے اور یہ فارسی میں بھی ہے۔

راجدھانی ''دارالحکومت / دارالخلافہ / دارالسلطنت'' کے معنی میں ''راجدھانی'' بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن مذکرہ بالا لفظوں کو چھوڑ کر صرف ''راجدھانی'' استعمال کرنا، جیسا کہ آج کل بعض اردو والوں کا وطیرہ ہے، یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ اردو میں ''راجدھانی'' کا مفہوم ادا کرنے والا اور کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ''راجدھانی'' کے ساتھ ''دارالسلطنت'' وغیرہ بھی کبھی کبھی استعمال میں لائے جاتے رہیں۔

راشی اردو میں یہ لفظ ''رشوت لینے والا'' کے معنی میں مستعمل ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ رشوت لینے والے کو عربی میں ''مرتشی'' کہتے ہیں، نہ کہ ''راشی''، لہٰذا ''راشی'' کو ترک کرنا چاہئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمارا سروکار اردو سے ہے، عربی سے نہیں۔ اردو کے لئے یہ لفظ مہند بالعربی ہے اور ''رشوت لینے والا'' کے معنی میں بالکل درست ہے۔ ''مرتشی'' اردو میں شاید ہی کوئی بولتا یا لکھتا ہو، لیکن اگر کسی نے لکھا، یا بولا، تو اس نے اردو میں عربی کی ملاوٹ کی۔ دیکھئے

''عادی''۔

رائے بمعنی Opinion۔ عربی میں یائے تحتانی بے ہمزہ ہے اور ہمزہ الف پر رسا لکھ دیتے ہیں (رأی)۔ لیکن اردو میں یہ لفظ مع ہمزہ رائج ہو گیا ہے اور عربی تراکیب میں بھی ہمزہ لکھتے ہیں (مثلاً ''صاحب الرائے'') لہٰذا اب یہی املا درست مانا جائے گا۔ خطاب کے طور پر (رائے، رائے بہادر) اور ''راجا'' کے معنی میں یہ لفظ دونوں طرح لکھا جاتا ہے اور اس وقت یہی ٹھیک ہے۔ فارسی قاعدے سے ''رائے'' بمعنی ''راجا'' کی جمع ''رایان'' ہے اور اردو میں بھی اس معنی یہی مستعمل ہے۔

رُپے اول مضموم دوم مفتوح۔ دیکھیے ''روپیہ''۔

رخسارہ یہاں ہائے ہوز زائد ہے۔ معنی کے اعتبار سے ''رخسار'' اور ''رخسارہ'' میں کوئی فرق نہیں۔ اردو میں دونوں الفاظ مذکر ہیں۔ یہ لفظ فارسی میں بھی ہے۔ دیکھیے: ''آوازہ''۔

رد کرنا اردو میں اس محاورے کے معنی ہیں: ''نامنظور کرنا، ماننے سے انکار کر دینا۔'' ہندی میں آج کل اسے ''منسوخ کر دینا'' کے معنی میں برتنے لگے ہیں۔ بعض لوگوں نے اردو میں بھی اس استعمال کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے۔ یہ غلط اور نامناسب ہے:

صحیح اور مناسب: انھوں نے مزدوروں کی مانگیں رد کر دیں۔

صحیح اور مناسب: فریق مخالف کے تمام دعوے رد کر دیے گئے۔

غلط اور قبیح: وزیر اعظم نے اپنے سارے پروگرام رد کر دیے۔

صحیح اور مناسب: وزیر اعظم نے اپنے سارے پروگرام منسوخ کر دیے۔

غلط اور قبیح: سیلاب کے باعث سب گاڑیاں رد کر دی گئیں۔

صحیح اور مناسب: سیلاب کے باعث سب گاڑیاں منسوخ کر دی گئیں۔

رسالہ دیکھیے: ''جریدہ''۔

رقم اس لفظ کے ایک معنی ''عدد'' کے بھی ہیں، یعنی کسی چیز، خاص کر سامان، کی گنتی کرتے ہیں تو کہتے ہیں، (مثلاً) ''سب ملا کر پانچ رقم ہیں۔'' یا، ''دیکھو گن لینا کے رقم ہیں۔'' اسی مفہوم میں ''عدد'' اور ''نگ'' بھی بولے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ''عدد'' کے معنی میں ''رقم'' کی

جمع ''رقوم'' بھی مستعمل تھی، اور اسے خاص کر ''جواہر'' کے ساتھ بولتے تھے، مثلاً ''سات پارچے کا خلعت مع چہ رقوم جواہر۔'' یہاں ''رقوم'' اور ''جواہر'' کے مابین اضافت نہیں ہے، ''رقوم'' کے معنی یہاں ''عدد'' ہیں۔ غالب نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۸۶۳ میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے کہ خلعت میں انھیں ''تین رقم'' جواہر ملتے تھے۔ نواب کلب علی خان کو ۱۸۶۶ کے ایک خط میں اسی سیاق و سباق میں غالب نے ''تین رقمیں جواہر'' لکھا ہے۔ دیکھئے: ''عدد''؛ ''تک''۔

رقوم جواہر اول بجزم مفتوح، بے اضافت۔ دیکھئے: ''رقم''۔

روبٹ ''مشین جو انسانوں کی طرح کام کرتی ہو، مشینی انسان'' کے معنی میں یہ لفظ انگریزی لفظ Robot بروزن so what کا اردو روپ ہے۔ اردو میں اسے عموماً ''روبٹ'' (واؤ مجہول) لکھتے اور بولتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ''روبو'' بھی لکھا ہے، شاید اس غلط فہمی میں کہ انگریزی لفظ کا آخری حرف بولنے میں نہ آتا ہوگا۔ اردو میں ''روبٹ'' زیادہ رائج ہے اور اردو کے لئے اسے ہی درست سمجھنا چاہئے۔ واضح رہے کہ Robot کوئی لفظ نہیں، بلکہ ڈرامے کا کردار ہے۔ چیک Czec زبان کے مشہور ناول اور ڈراما نگار کارل چپیک Carel Capek نے ۱۹۲۰ میں ایک ڈراما لکھا تھا، بعنوان۔ R. U. R یا Rossum's Universal Robots، اس میں روبٹ نامی کردار دکھائے گئے تھے جو مشین کی طرح کام کرتے تھے۔

روبو دیکھئے: ''روبٹ''۔

روپیہ بعض لوگ اسے ''رپیہ'' لکھتے ہیں اور اس کی جمع ''رپے'' بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں املا انتہائی بدنما اور غیر ضروری ہیں۔ بعض لوگ واحد کی صورت میں ''روپیہ'' ہی لکھتے ہیں، لیکن جمع ''روپے'' بناتے ہیں۔ اس جمع کا بھی کوئی جواز نہیں۔ ''روپیہ'' کی جمع ''روپے'' مستعمل ہے اور یہی ٹھیک ہے۔

رودینا خواجہ عبدالرؤف عشرت نے لکھا ہے کہ ''اس نے رو دیا'' غلط ہے۔ انھوں نے داغ کا شعر نقل کیا ہے ؎

محبت نے کی جب مری دستگیری مقدر نے رو رو دیا ہاتھ مل کر

اس پر خواجہ صاحب کا ارشاد ہے: ''رودینا فعل لازم ہے اور فعل لازم کے ساتھ 'نے' نہیں لاتے۔

'مقدر نے رو دیا' کتنا غیر فصیح ہے۔۔۔ 'مقدر رو دیا' کہنا چاہئے۔ یعنی 'مقدر ہاتھ مل کر رو دیا' فصیح ہے۔'' یہاں خواجہ صاحب نے غلط بحث کر دیا ہے۔ اگر ''رو دینا'' کے ساتھ ''نے'' لانا غلط ہے تو پھر فصیح یا غیر فصیح کی بات نہیں رہ جاتی۔ اور اگر ''رو دینا'' کے ساتھ ''نے'' لانا غیر فصیح ہے، تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ غلط بھی ہو۔ غیر فصیح لفظ کے لئے شرط نہیں ہے کہ وہ غلط بھی ہو۔ جہاں تک سوال ''میں نے رو دیا'' وغیرہ کے صحیح و فصیح ہونے کا ہے تو داغ کی سند پر اسے صحیح و فصیح کہنے میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہیے۔ دیکھئے: ''ہنس دینا''۔

روز/روزوں دیکھئے: ''برس/برسوں''۔

روزی روٹی یہ فقرہ خود ہی نہایت بدآہنگ اور بے تکا ہے، اس پر طرہ یہ کہ اس کے ساتھ ہم لوگ ''جڑا ہونا'' بھی بولنے لگے ہیں، اور بچاری اردو زبان کے ہی تعلق سے یہ غیر متین اور بھیک سی مانگتے ہوئے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ''اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا چاہئے۔'' ''معاش'' جیسا سبک لفظ ہوتے ہوئے ''روزی روٹی'' ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

غلط اور نامناسب اور قبیح: اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا چاہئے۔

صحیح اور مناسب: اردو کو معاش سے/روزی کمانے سے/منسلک ہونا چاہئے۔/اردو کو ذریعہ معاش بنانا چاہئے/بنانے کا انتظام کرنا چاہئے۔

رول واؤ معروف، یہ انگریزی لفظ Role اردو میں بے وجہ لکھا جا رہا ہے جب مدتوں سے لفظ ''کردار'' اس کے لئے رائج ہے۔

غلط: انھوں نے میرے حمایتی کا رول ادا کیا۔

صحیح: انھوں نے میرے حمایتی کا کردار ادا کیا۔

غلط: دلیپ کمار نے ہر طرح کے رول ادا کئے ہیں۔

صحیح: دلیپ کمار نے ہر طرح کے کردار ادا کئے ہیں۔

رہائش ''رہائش'' اور ''رہائش گاہ'' غلط تو ہیں ہی، بھونڈے بھی ہیں، اور ان سے کوئی مقصد ایسا نہیں حاصل ہوتا جو مکان، گھر، قیام گاہ، قیام، مستقر، جائے قیام، دولت کدہ، وغیرہ (ان معنی کو ادا کرنے کے لئے الفاظ ہمارے یہاں کثرت سے ہیں) سے نہ حاصل ہو سکتا ہو۔ لیکن جس

کثرت سے یہ رواج پا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے شاید کچھ مدت کے بعد اسے صحیح ماننا پڑ جائے گا۔ کسی ثقہ بزرگ، مثلاً مسعود حسن رضوی ادیب، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، کو ''رہائش'' بولتے نہیں سنا گیا، لکھنا تو بڑی بات ہے۔ فارسی کا قاعدہ ہے کہ مصدر سے مضارع بناتے ہیں اور پھر مضارع کے آخری حرف یعنی دال، کو حذف کر کے اس پر 'شین' مع کسرہ بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح جو اسم حاصل ہوتا ہے اسے حاصل مصدر کہتے ہیں۔ مثلاً:

مصدر، آراستن: مضارع، آراید: حاصل مصدر ('دال' کو حذف کر کے اور اس پر 'شین' بڑھا کر) آرایش/آرائش

مصدر، خواستن: مضارع، خواہد: حاصل مصدر، خواہش

مصدر، رفتن، مضارع، رود: حاصل مصدر، روش

اردو میں حاصل مصدر بنانے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے لیکن ہم لوگوں نے بعض فارسی اردو مصدروں کے حاصل مصدر فارسی کے طرز پر خود بنا لئے ہیں۔ ان میں سے کچھ رائج بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً:

اردو مصدر، دبانا: حاصل مصدر (اردو)، دبش [عامیانہ لفظ ہے، پڑھے لکھوں میں رائج نہیں ہوا۔] یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فارسی لفظ ''دوش'' کی اردو شکل ہو۔

فارسی مصدر، زیبیدن: مضارع، زیبد: حاصل مصدر (اردو)، زیبائش [اردو میں رائج ہے۔ فارسی میں نہیں ہے۔ فارسی میں ہوتا تو زیبش ہوتا۔]

فارسی مصدر، فہمیدن: مضارع، فہمد: حاصل مصدر (اردو)، فہمائش [اردو میں رائج ہے۔ فارسی میں نہیں ہے۔ اور اردو میں بھی اس کے معنی وہ نہیں ہیں جو فہمیدن سے برآمد ہوتے۔]

اردو مصدر، گرمانا: حاصل مصدر (اردو)، گرمائش [عامیانہ لفظ ہے۔ پڑھے لکھوں میں رائج نہیں ہوا۔]

اسی طرح، کسی نے 'رہنا' سے 'رہائش' بنا لیا ہے۔ یہ لفظ بھونڈا تو ہے ہی، غلط اس لئے بھی ہے کہ اگر 'رہنا' سے حاصل مصدر بقاعدۂ فارسی بنے گا تو 'رہش' ہوگا نہ کہ 'رہائش'۔ اور ''رہش/رہائش'' میں جگہ کے معنی شامل ہیں، اس لئے ''رہائش گاہ'' تو بالکل ہی فضول ہے۔

غلط اور فصیح: آج کل آپ نے رہائش کہاں رکھی ہے؟

صحیح وفصیح: آج کل آپ کہاں قیام فرماتے ہیں/گھر کس جگہ رکھا ہے/کا دولت کدہ کس جگہ ہے/اس جگہ رہ رہے ہیں؟ وغیرہ۔

غلط اور قبیح: یہاں مدتوں میری رہائش رہی ہے۔

صحیح وفصیح: میں یہاں مدتوں رہا ہوں۔

غلط اور قبیح در قبیح: مکانات رہائش۔

صحیح وفصیح: رہنے کے مکام/قیام کی جگہیں، وغیرہ۔

جناب عبدالرشید نے لکھا ہے کہ ''رہائش'' کا اندراج ونکن فوربس، پلیٹس، ''آصفیہ''، اور ''نور'' میں ہے، تو پھر اس لفظ کو فضول کیوں قرار دیا جائے؟ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ ''صفیہ'' اور ''نور'' دونوں نے اس لفظ کو ''عوامی'' کہا ہے، یعنی کسی ثقہ بولنے والے سے انھیں اس کی سند نہیں مل سکی۔ رہے انگریز لغت نگار، تو یہاں انھیں کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پلیٹس کا قول ہے کہ ''رہائش'' کے معنی ہیں:

Stay, delay, & c.

پھر وہ درج کرتے ہیں: ''رہائش اختیار کرنا''، اور معنی لکھتے ہیں:

To take in (one's) abode, to stay, tarry, delay

ظاہر ہے کہ ان معنی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ''رہائش'' کے معنی ''قیام گاہ، قیام''، وغیرہ ہیں۔ ونکن فوربس لکھتا ہے کہ ''رہایس/رہائش'' کے معنی ہیں:

Stay; delay; halt; abode; residence

اتنے مشکوک حالات میں لفظ ''رہائش'' کو قبول کرنا غیر مناسب ہے۔

رہائش گاہ دیکھیے: ''رہائش''۔

رہوار ''راہوار'' بھی درست ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ریش قاضی شراب یا بھنگ چھاننے کا کپڑا یا روئی، یا کبھی کبھی وہ روئی یا کپڑا جس سے شراب کی صراحی کو بند کرتے ہیں۔ یہ محاورے کا معاملہ ہے، اس کا مطلب یہ نہ نکالنا چاہیے کہ اس

میں قاضی جیسے ثقہ شخص کی توہین ہے۔ ناسخ ؎

نہ پائی ریش قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان سے فروشوں کا بھی کیا ہی لا ابالی ہے

مزید دیکھئے ''مزاج''۔

رینگنا دہلی اور مغربی یو۔ پی۔ وغیرہ علاقوں میں یہ لفظ مع یائے معروف بولا جاتا ہے۔ اقبال کا مزاحیہ قطعہ ہے ؎

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوک دار سینگ

''نور اللغات'' میں یہ لفظ صرف یائے معروف سے درج ہے۔ شان الحق حقی نے بھی صرف مع یائے معروف لکھا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں یائے معروف اور مجہول دونوں مذکور ہیں۔ پلیٹس نے یائے معروف و مجہول کے علاوہ اول مفتوح کے ساتھ بھی لکھا ہے۔ یہ تلفظ کہیں سننے میں نہیں آیا۔ لیکن ممکن ہے اودھی میں ہو۔ اردو کی عام بول چال میں'' رینگ'' مع یائے مجہول ہی ہے۔ لکھنؤ کے مضافاتی علاقے میں حسب ذیل الفاظ اول مفتوح کے ساتھ بھی سنے گئے ہیں: آوے/آویں، جاوے/جاویں، دے ['' دینا'' مصدر سے]، لے ['' لینا'' مصدر سے]۔

زار '' زار'' لاحقے والے کم و بیش تمام الفاظ مذکر ہیں، مثلاً:

چمن زار، خارزار، ریگ زار، سمن زار، گلزار، مرغزار، وغیرہ۔

ان الفاظ کے اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یہ سب مستقل لغات کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی یہ اضافت مقلوبی نہیں ہیں کہ ان کو پلٹ کر ان کی '' اصلی'' صورت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ '' گلزار'' تو ٹھیک ہے، لیکن '' زار گل'' مع اضافت یا بدون اضافت، دونوں طرح مہمل ہے۔ یہی حالت اس قبیل کے بقیہ تمام الفاظ کی ہے۔

زاغ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، '' تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

زبان دلی، اور پورب کے بھی بہت سے علاقوں میں اول مضموم ہے، لیکن اور جگہوں پر اول

مفتوح سنا جاتا ہے۔ قدیم فارسی میں ''زفان'' مع اول مضموم تھا۔ بعد میں اول مفتوح، یا مضموم کے ساتھ ''زبان'' ہو گیا۔ ہندی میں عموماً اول مضموم کے ساتھ بولتے ہیں۔ شان الحق حقی نے اول مضموم پہلے درج کر کے الگ سے اول مفتوح بھی درج کیا ہے، لیکن ''زبان'' کے متعلق دو محاوروں ''زبان کو لگام دینا'' اور ''زبان کو سنبھالنا'' میں اول مفتوح ہی لکھا ہے۔ چونکہ ''زبان'' کے متعلق سو سے زیادہ محاورے اردو میں ہیں، لہٰذا گمان گذرتا ہے کہ شان الحق حقی کے نزدیک اور محاوروں میں اول مضموم ہی ہے۔ لیکن ان کی بات صاف نہیں ہے۔ ''نور اللغات'' میں دونوں تلفظ دیے ہیں۔ فارسی میں بھی دونوں تلفظ ہیں۔ اردو کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ اول مفتوح زیادہ رائج ہے، اور ''زبان'' سے متعلق محاوروں میں بھی اول مفتوح ہی بولا جاتا ہے۔

زبان رہ جانا / رہنا کسی کی بات یا وعدہ پورا ہو جائے، یا کسی کا تقاضا یا فرمائش پوری ہو جائے تو کہتے ہیں: ''میری / ان کی زبان رہ گئی۔'' لیکن اس محاورے کے ایک معنی ''زبان کا بیکار ہو جانا، گونگا ہو جانا'' بھی ہیں۔ دیکھیے: ''لال''۔

زعن یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

زمانہ یہ لفظ عربی میں نہیں ہے۔ فارسی والوں نے ''زمان'' پر ہائے ہوز بڑھا کر بنا لیا۔ اردو میں دونوں کے معنی میں ذرا سا فرق ہے، لیکن جنس ایک ہے۔ اردو میں تنہا ''زمان / زماں'' کو عام طور پر فلسفے کی اصطلاح Time کے معنی میں لاتے ہیں۔

زمرد یہ لفظ کئی طرح صحیح ہے: (۱) اول مفتوح، دوم مضموم، سوم مضموم مشدد۔ (۲) ہر سہ مضموم، سوم مشدد۔ (۳) ہر سہ مفتوح، سوم مشدد۔ (۴) اول مفتوح، دوم مضموم، سوم مفتوح مشدد۔ (۵) اول مفتوح، دوم ساکن، سوم مضموم۔ اردو میں اول اور چہارم تلفظ زیادہ تر سننے میں آتے ہیں۔

زمی ''زمین'' کا یہ تلفظ اور املا فارسی اور اردو میں مستعمل ہے، لیکن بہت کم۔ آرزو لکھنوی ؎

چھوٹے نہیں سماتا پہلو میں اب تو دل   یہ تم نے کہہ دیا تھا بتاؤ ہنسی سے کیا
نادان کی دوستی میں نہیں فیض آرزو   دانہ جو خام ہے وہ اگے گا زمی سے کیا

اس طرح کے کچھ لفظ اور بھی ہیں۔ دیکھئے، ''قالی''؛ ''فرزی''۔

زنانہ وہ مرد جس میں عورتوں کی صفات ہوں، اور ممکن ہے کہ وہ رجولیت سے بھی محروم ہو، اور جو عورتوں کی طرح بودوباش کرے، اصطلاح میں ''زنانہ'' کہلاتا ہے۔ مصحفی ؎

نہیں آدمیت کا دلی میں چرچا جدھر دیکھو ہجڑے زنانے بہت ہیں

دیکھئے، ''ہجڑا''۔

ژرافہ فارسی میں ''زراف/زرافہ'' بہ تسہیل رائے مہملہ ہے۔ اردو میں مع رائے عجمی اول مفتوح، دوم مشدد کے ساتھ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سابق مہمل تابع موضوع اور تابع مہمل کے بیان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان جوڑوں میں پہلا لفظ عموماً بامعنی ہوتا ہے۔ ایسے استثنائی جوڑوں کو، جن کا پہلا لفظ مہمل ہو، ماہرین نے کوئی نام نہیں دیا ہے۔ چونکہ ایسے جوڑوں کا استعمال اب بڑھ رہا ہے، اس لئے اچھا ہے کہ ان کی الگ نوع قائم کر کے انھیں ''سابق مہمل'' کہا جائے۔ مثلاً:

آس پاس، انوائی کھٹوائی، اردگرد، اغل بغل، اللے تللے، بھور ٹھکانا، دھینگا مشتی، سان گمان، لاؤ لشکر، ہیر پھیر، وغیرہ۔

ساٹنا ''چپکانا'' کے معنی میں یہ لفظ ''سٹنا'' کا متعدی ہے، انھیں معنی میں ''سٹانا'' بھی بولتے ہیں۔ ''ساٹنا'' علاقۂ بہار کا روزمرہ ہے، اور جگہ نہیں سنا گیا۔ پلیٹس کے سوا کسی اور لغت میں درج نہیں، یہ حیرت کی بات ہے۔

سال/سالوں دیکھئے، ''برس/برسوں''۔

سانپ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سانپن حرف چہارم کہیں مفتوح اور کہیں مکسور بولا جاتا ہے۔ یہ ''سانپ'' کی تانیث تو ہے، لیکن اگر خصوصاً کوئی مادہ سانپ مراد لینا ہو تو بھی اس لفظ کو شاذ و نادر ہی بولتے ہیں۔ بعض لغات میں اسے ''ناگن'' کا مرادف لکھا ہے، لیکن یہ بہت سرسری بول چال میں شاید ہو تو ہو، عام نہیں

ہے۔ عام طور پر "ساپھن" بالوں کی اس لمبی باریک لکیر کو کہتے ہیں جو بعض گھوڑوں کے سر پر اور بعض انسانوں کی پیٹھ پر ہوتی ہے۔ اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھیے: "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"؛ "دومہی/مونہی/موہی ساپھن"۔

سانڈا چھپکلی ذات کا ایک بڑا جانور جسے "بچھ کھوپڑا/بس کھوپڑا" بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

سانڈنی بمعنی "تیز رفتار اونٹنی جو سواری کے کام آتی ہے"۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ اس کے برخلاف، انھیں معنی میں "ناقہ" ہمیشہ مذکر ہے۔ دیکھیے: "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

سانس اس لفظ کو مونث اور مذکر دونوں طرح سنا گیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ دہلی والے اسے مذکر بولتے ہیں اور لکھنؤ والے مونث۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ زبانوں پر دونوں طرح رواں ہے

آہ جاتی تھی آسماں پہ کبھی سانس بھی اب تو ئی نہیں جاتی

(جلال)

ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی دل میں ہے آگ مرے اور لگاتی جاتی

(بہادر شاہ ظفر)

بادشاہ میں کچھ سانس باقی تھے۔

(فقرہ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی)

دم چڑھ گیا ہے سانس اکھڑتی ہے دم بدم صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اٹھیں قدم

(میر انیس)

صاحب "آصفیہ" نے دلچسپ بات لکھی ہے کہ اگرچہ شعرا نے اس لفظ کو مونث باندھا ہے لیکن بیز بانوں پر مذکر ہے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اگر تمام زبانوں پر مذکر ہوتا تو پھر شعرا اسے مونث کیوں باندھتے؟ اصل صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ "سانس" کو مذکر بولتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ مونث بولتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو مجرد "سانس" کو مونث کہیں گے، لیکن "سانس

اکھڑ گیا، سانس پھول گیا'' وغیرہ بھی بول دیں گے۔ بہر حال، چونکہ بولنے والوں کی اکثریت ''سانس'' کی تانیث کے حق میں ہے۔ لہٰذا اسے مونث کہنا بہتر ہوگا۔

سائیس بمعنی گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا، تربیت دینے والا، وغیرہ۔ اس لفظ کا مادہ وہی ہے جو ''سیاست'' کا ہے، یعنی س و ا س۔ دیکھئے ''سیسی علم وریاؤ ہے''۔

سبھی عزیز داری اول دوم مفتوح۔ وہ عزیز داری جو شادی کے ذریعہ قائم ہو، ''سبھی'' کہلاتی ہے۔ بے تکلف بول چال میں اسے ''ازار بندی رشتہ'' بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے، ''نسبی عزیز''۔

سبعۂ نائمہ شراب کے سات پیالے جو رات کو خواب آور کے طور پر پئے جاتے ہیں۔ دیکھئے ''ثلاثۂ غسالہ''؛ ''خمسۂ ہاضمہ''۔

سجدہ عربی میں اول مفتوح ہے، لیکن اردو میں کچھ لوگ اول مکسور بولتے ہیں، خاص کر عورتوں کی زبان پر اول مکسور ہی ہے۔ بہر حال، اس وقت اس لفظ کا مرجح تلفظ اول مفتوح ہی کے ساتھ ہے۔

سجدہ گاہ ''گاہ'' کے لاحقے والے تقریباً تمام لفظ مونث ہیں، مثلاً:

امید گاہ، قیام گاہ، عیش گاہ، فرود گاہ، منزل گاہ، خواب گاہ، قتل گاہ، وغیرہ۔

لیکن ''جلوہ گاہ'' مذکر ہے۔ قائم چاند پوری ؎

ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے انس گویا کبھو یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا

غالب کا شعر ہے ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

اس سلسلۂ الفاظ میں یہ بات دلچسپ ہے کہ یہ سارے الفاظ مستقل لفظ کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ اضافت مقلوبی نہیں ہیں کہ ان کو پلٹ کر لفظ کی ''اصل'' شکل حاصل ہو سکے۔ مثلاً ''امید گاہ'' تو درست ہے، لیکن ''گاہ امید'' مع اضافت ہو یا بے اضافت، دونوں طرح مہمل ہے۔ یہی عالم اس قبیل کے اور الفاظ کا ہے۔

پرانے زمانے میں یہ لفظ جب Head کے معنی میں بے عطف و اضافت بولا جاتا تو اسے

بکسر اول بولتے تھے۔ دہلی میں اب بھی بہت سے لوگ اسے بکسر اول بولتے ہیں، اور اس لفظ سے متعلق بعض محاورے بھی دلی میں اکثر یوں بولے جاتے ہیں کہ ''سر'' میں اول مکسور سنائی دیتا ہے۔ اس تلفظ کو اب دہلی کا علاقائی تلفظ کہنا چاہئے۔ آج کل عموماً ہر حالت میں لفظ ''سر'' اول مفتوح (بروزن ''تر'') بولا جاتا ہے۔ جن محاوروں/کہاوتوں میں ''سر'' بمعنی Head ہے، ان میں بھی دہلی کے مذکورہ استثنا کے سوا، آج کل ''سر'' بفتح اول بولا جاتا ہے۔ لہٰذا ''سر'' بمعنی Head آج کل بفتح اول بروزن ''تر'' ہی درست ہے۔

یہ خیال رہے کہ پرانے زمانے میں بھی Head کے معنی میں یہ لفظ کبھی کبھی اول مفتوح بولا جاتا تھا، مثلاً ''لال سر'' [ایک پرندے کا نام، جس کا سر لال ہوتا ہے]؛ ''سر بڑا سردار کا پیر بڑا گنوار کا''؛ ''سر سے/پر سہرا بندھنا''؛ ''سر سہرا ہونا''؛ ''سر سفید ہونا/ہو جانا''؛ ''سر دینا''؛ ''سر مغزنی'' وغیرہ استعمالات میں ''سر'' بفتح اول ہی ہے۔ بعض محاوروں اور روزمرہ کے مقررہ فقروں میں ''سر'' بالکسر بھی بولتے تھے (مثلاً سر کھانا؛ سر آنکھوں پر؛ آپ کے سر کی قسم، تینوں میں سر بالکسر تھا)۔ اب تمام حالتوں میں ''سر'' بالفتح بروزن ''تر'' ہی درست ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ ''سر'' (اول مکسور، رائے مہملہ مشدد) بمعنی ''راز'' اردو میں بھی ہے، لیکن اگر یہ لفظ اکیلا آئے تو رائے مہملہ پر تشدید نہیں بولتے، اضافت کی حالت میں ضرور بولتے ہیں۔

سراہنا اردو میں ''سراہنا'' مصدر ہے، بمعنی ''تعریف کرنا، تحسین کرنا''۔ ہندی میں اسے بطور اسم استعمال کرتے ہیں۔ افسوس کہ بعض اردو والے بھی ایسا کرنے لگے ہیں، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ''سراہنا'' مصدر کو مسترد کیا جائے۔

غلط اور قبیح: استاد نے طالب علموں کی کوششوں کی سراہنا کی۔

درست اور فصیح: ۔۔۔ کو سراہا۔

غلط اور قبیح: معائنے کے افسر نے ضلع کے دفتر کی سراہنا کی۔

درست اور فصیح: ۔۔۔ کو سراہا۔

لیکن اگر ''سراہنا'' بطور مصدر نہیں بھی استعمال کرنا ہے تو اردو میں اسے بطور اسم برتنے کی

بھی ضرورت نہیں۔ متعدد الفاظ موجود ہیں:

تحسین کی/ پسندیدگی سے دیکھا/ تعریف کی، وغیرہ۔

غلط اور قبیح: استاد نے طالب علموں کی کوششوں کی سراہنا کی۔

درست اور فصیح:۔۔۔ تحسین کی/ توصیف کی/ پسندیدگی سے دیکھا/ تعریف کی/ قابل تعریف ٹھہرایا، وغیرہ۔

غلط اور قبیح: معائنے کے افسر نے مقامی دفتر کی سراہنا کی۔

درست اور فصیح:۔۔۔ تحسین کی/ توصیف کی/ پسندیدگی سے دیکھا/ تعریف کی/ قابل تعریف ٹھہرایا، وغیرہ۔

سردی ''زکام'' کے معنی میں یہ لفظ دہلی اور بہار کا روزمرہ ہے۔ ان علاقوں کے باہر اس لفظ میں یہ معنی نہیں ہیں۔ اپنے اپنے علاقے میں سردی/ زکام دونوں درست ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔

سرشک اول دوم مکسور، بمعنی ''آنسو''۔ بعض لوگ اسے بفتحتین بولتے ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں۔

سرکار بمعنی ''حکومت''، یہ لفظ بالکل صحیح ہے اور فارسی اردو میں بے تکلف مستعمل ہے۔ لیکن آج کل ہندی میں بھی یہی لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اور بعض لوگ اردو میں بھی مسلسل ''سرکار'' بمعنی ''حکومت'' لکھتے ہیں۔ لہٰذا اردو میں کبھی کبھی ''حکومت'' بھی لکھنا یون چاہئے تا کہ ایسا نہ ہو کہ ''سرکار'' کو ہندی کا ''آسان'' لفظ سمجھ کر ہم لوگ اسے اپنے یہاں اس قدر رائج کر لیں کہ ''حکومت'' ہم سے چھوٹ جائے۔

سرلفظ بمعنیHead Word، دیکھئے:''لغت''۔

سرواژہ بمعنیHead Word، دیکھئے:''لغت''۔

سرہونا غالب کا مشہور شعر ہے ؎

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہوتے تک   کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

مصرع ثانی میں محاورہ ''سر ہونا'' نظم ہوا ہے اور شارحین کو اس کے معنی بیان کرنے میں پریشانی

ہوئی ہے۔ مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ ''زلف کا سر ہونا کوئی محاورہ نہیں ہے۔'' نظم طباطبائی نے ''سر ہونا'' سے ''سمجھ لینا'' مراد لے کر ''زلف'' کو اس کا فاعل قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے دراصل یہ محاورہ تاش اور گنجفہ کے عالم سے لیا ہے جہاں بازی کا ''سر ہونا'' بمعنی ''بازی کا جیت لیا جانا'' مستعمل ہے۔ ''میرا یہ ہاتھ سر ہو گیا''، بمعنی ''میں نے یہ ہاتھ جیت لیا''، وغیرہ کے علاوہ ترپ کے پتے کو ''ترپ سر'' بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ ترپ کے رنگ کا پتہ بقیہ رنگوں کے پتوں کو جیتتا یا ''سر کرتا'' ہے۔ تاش کی اصطلاح میں ''سر ہونا'' بمعنی ''فتح مند ہونا'' بھی ہے۔ ''یہ پتہ سر ہے''، یعنی ''یہ پتہ جیت گیا''۔ لہٰذا غالب کے مصرعے میں ''زلف کا سر ہونا'' بمعنی ''زلف کا ہاتھ آ جانا، زلف پر قابو پا جانا'' ہے۔

سسم پانی اول مضموم، دوم مفتوح۔ علاقۂ بہار میں ''نیم گرم پانی'' کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ''آصفیہ'' نے اول و دوم کو مضموم بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ ہندوؤں کا روزمرہ ہے۔ (میں نے بہار میں اسے پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان پر سنا ہے)۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں بھی اول دوم کو مضموم لکھا ہے، لیکن اس لفظ کو کسی قوم یا طبقے سے مخصوص نہیں لکھا۔ ہندی کے وسیع و عریض لغت ''شبد ساگر'' میں یہ لفظ نہیں ہے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اردو والوں کا بنایا ہوا لفظ ہے۔ میں نے اسے بہار کے باہر کہیں نہیں سنا، لہٰذا اس وقت اسے پوربی اردو کا مقامی روزمرہ سمجھنا چاہئے۔ دیکھئے، ''سمونا''؛ ''سمویا ہوا پانی''۔

سطحہ اس لفظ میں بھی ہائے ہوز زائدہ ہے۔ ''سطح'' کے معنی میں یہ لفظ عربی فارسی میں نہیں ہے، اردو والوں نے ''موج/موجہ'' وغیرہ کے طرز پر بنا لیا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' یہ شعر بطور سند ملتا ہے ؎

سطحہ جو نورشہ سے ہے انور زمین کا ہے مجرئی دماغ بھی عرش بریں کا

ملحوظ رہے کہ ''سطحہ'' یہاں مذکر استعمال ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں ''سطح'' کو بھی مذکر باندھ لیتے تھے۔ میر ؎

سب سطح ہے پانی کا آئینے کا سا تختہ دریا میں کہیں شاید عکس اس کے بدن کا تھا

زمانۂ حال میں لفظ ''سطحہ'' دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن اگر برتا جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ ''آوازہ''

اور ''موجہ'' کے قیاس پر اسے بھی مذکر قرار دے سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''سطحہ'' غلط املا ہے ''سطح'' کا۔ یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ عربی میں ''سطحہ'' (اول، دوم، سوم مفتوح) موجود ہے، اگرچہ معنی ذرا مختلف ہیں۔ ممکن ہے اردو والوں نے اسی کو دیکھ کر اپنا لفظ بنالیا ہو۔

سفر خرچ دیکھیے، ''خرچ''۔

سفل دان دیکھیے، ''ثفل دان''۔

سفیل دیکھیے، ''صفیل''۔

سگ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سگریٹ دیکھیے، ''جنس، غیر زبانوں کے الفاظ کی''۔

سمندر ''بحر'' کے معنی میں اس لفظ کا حرف دوم اصلاً مضموم ہے۔ لیکن یہ تلفظ صرف مشرقی یو۔ پی۔ اور بہار میں عام ہے۔ ہاں ''سمندری ہوا/ جہاز/ ڈاکو'' میں حرف دوم اکثر لوگ مضموم بولتے ہیں۔ مجرد ''سمندر'' کا تلفظ عام طور پر اول دوم مفتوح ہی سے کیا جاتا ہے۔ یعنی اس میں اور ''سمندر'' بمعنی ''آگ میں رہنے والا جانور (وغیرہ)'' میں باعتبار تلفظ کوئی فرق نہیں۔ ''بحر'' کے معنی میں اس کی اصل سنسکرت ''سمدر'' (اول مفتوح، دوم مضموم) ہے، اور آگ والے جانور کے معنی میں اس کی اصل Salamander ہے۔ بہت سے لوگ ''سمندر'' بفتحتین کو آگ کا کیڑا سمجھتے ہیں۔ لیکن لغات کی رو سے یہ چوہے کی طرح کا جانور ہے، اور بقول بعض ایک طائر ہے۔ اگر Salamander سے قیاس کریں تو یہ بامنھی کی طرح کی چھپکلی ہوتی ہے۔ یورپ میں بھی Salamander کی ایک قسم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ آگ میں رہتا ہے۔ جنس کے اعتبار سے ''سمندر'' (جانور) ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سمونا بمعنی ''ٹھنڈا گرم ملانا'' بھی ہے، مصحفی

حمام کی طرف جو گیا بہر غسل تو ‏ یاں اشک گرم نے مرے دریا سمو دیا

دیکھیے: ''سسم پانی''؛ ''سمویا ہوا پانی''۔

سمویا ہوا پانی ''نیم گرم پانی، ہلکا گرم پانی'' کے معنی میں یہ فقرہ ایک وقت میں بہت رائج تھا۔ ''سمونا'' کے ایک معنی ''ٹھنڈے میں گرم ملانا بھی ہیں''۔ ''نور اللغات'' میں ''سمویا ہوا'' ان معنی میں درج ہے، لیکن پورا فقرہ درج نہیں۔ ''آصفیہ'' میں پورے فقرے کا اندراج ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں بھی پورا فقرہ درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روزمرہ کے طور پر مستعمل تھا۔ ''لغت'' میں جو مثال لکھی ہے وہ ۱۹۰۶ کی ہے۔ داستان میں جو مثال ہے وہ بھی اسی زمانے کی ہے:

پانی اس چشمے کا نہ بہت گرم تھا نہ ٹھنڈھا [کذا] تھا۔ سمویا ہوا معلوم ہوتا تھا

(''بالا باختر'' از شیخ تصدق حسین، ص ۳۰۷، اول مطبوعہ ۱۸۹۷)۔

دیکھیے: ''سسم پانی''؛ ''سمونا''۔

سنائی ''سناونی'' بمعنی ''موت کی خبر'' کو ''سنائی'' بھی کہتے ہیں۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ''سنائی'' زیادہ رائج تھا۔ محمد حسین کلیم ؎

کلیم اس نے خبر سن کر مرے مرنے کی فرمایا جو مجھ پر جان دیتا ہے اسی کی یہ سنائی ہے

پر اپنے نوشتے سے یہ خطرہ ہے کہ وھاں سے تیری نہ سنائی کہیں اے نامہ بر آوے

(جرأت)

سنائیے اہل پنجاب میں عام رواج ہے کہ مزاج پرسی کے جواب میں کہتے ہیں (مثلاً) ''سب ٹھیک ہے۔'' پھر کہتے ہیں: ''آپ سنائیے۔'' یا ''آپ سنائیے کیا حال ہیں''، وغیرہ۔ یعنی وہاں ''فرمائیے'' کی جگہ ''سنائیے'' کہتے ہیں۔ اردو میں ایسے موقعوں پر ''سنائیے'' یا ''آپ سنائیے'' کبھی نہیں کہتے۔ اگر بہت بے تکلفی ظاہر کرنی ہو تو ''بتائیے'' کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً ''آپ بتائیے، آپ کیسے ہیں۔'' ورنہ صحیح اردو محاورہ ہے: ''آپ فرمائیے، آپ کیسے ہیں؟'' یا ''آپ کہیے، آپ کے کیا احوال ہیں''، وغیرہ۔

محمد حسین آزاد نے اپنے مرتب کردہ ''دیوان ذوق'' (۱۹۳۳ ایڈیشن، صفحہ ۱۷۴) پر لکھا ہے:

غالب آئے تو سلام وکلام ہوتے ہی بولے: استاد، آج تو جی چاہتا ہے آپ کو

کچھ سنائیے۔

یہاں ''سنائیے'' کے معنی سمجھنے میں اکثر لوگوں کو سہو ہوا ہے۔ ''سنائیے'' یہاں ''ہم سنائیں/ میں سناؤں'' کے معنی میں ہے۔ یعنی غالب کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ ''استاد، جی چاہتا ہے آپ کو آج میں کچھ سناؤں۔'' یہ دہلی کا محاورہ ہے۔ اس طرح کی مزید مثالوں کے لئے دیکھئے، ''ڈھونڈیئے''؛ ''کیجئے''؛ ''منگوائیے''۔

سنجیدگی سے لینا انگریزی روزمرہ to take seriously کی مٹی بگاڑ کر اب ہم لوگ کسی معاملے/ بات/ واقعے [وغیرہ] کو ''سنجیدگی سے لینا'' بولنے لگے ہیں۔ اردو میں یہ محاورہ معنی دینے کا نہیں، آپ ہزار کوشش کرلیں۔ یہ بھونڈا اور احمقانہ لگتا ہے۔

غلط اور قبیح: حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لے رہی ہے۔

صحیح اور مستحسن: حکومت اس معاملے کو اہم قرار دے رہی ہے/ اہمیت دے رہی ہے/ لائق توجہ قرار دے رہی ہے۔

غلط اور واجب الترک: میں آپ کی ہر بات بہت سنجیدگی سے لیتا ہوں۔

صحیح اور مستحسن: میں آپ کی ہر بات کو بہت باوزن/ اہم/ قرار واقعی سمجھتا ہوں۔

سنگ رنگ ڈھنگ یہ فقرہ جواہرات کے متعلق بولا جاتا ہے، سودا

میں گوہر سخن کو دیا سنگ رنگ ڈھنگ تھا ورنہ اس رقم میں کب اس رنگ رنگ ڈھنگ

کیا تجھ لبوں سے لعل کو نسبت کہ ان کی طرح پہنچا سکے ہے کوئی بہم سنگ رنگ ڈھنگ

یہاں ''سنگ'' سے مراد پتھر ہے، کہ وہ کتنا اچھا ہے اور اس میں چمک کتنی ہے؟ مثلاً اگر ہیرا ہے تو اس کے اندر سیاہ داغ تو نہیں ہیں، اگر یاقوت ہے تو اس میں کوئی دھندلا پن تو نہیں، اگر زمرد ہے تو اس کا رنگ دبتا ہوا تو نہیں، یا اس میں کوئی لکیر تو نہیں؟ ''رنگ'' سے مراد پتھر کی صفائی اور رنگ کی شوخی ہے۔ یعنی کیا رنگ ہموار ہے کہ نا برابر ہے، شوخ ہے کہ ہلکا ہے؟ اگر شوخ ہے تو جس طرح کا پتھر ہے اس کے رنگ میں کتنی شوخی مستحسن ہے؟ (مثلاً برمی یاقوت کا رنگ ہلکا ہو تو وہ زیادہ اچھا مانا جائے گا)۔ ''ڈھنگ'' سے مراد پتھر کی تراش اور قطع ہے، یعنی کیا اسے صفائی سے تراشا ہے، اور تراش کی طرز کیا ہے، کیا وہ اس پتھر کے لئے مناسب ہے کہ نہیں؟

سنہ اس لفظ کو بعض لوگ ''سن'' لکھنے لگے ہیں۔ اس طرح غیر ضروری طور پر (''سن'' اول مکسور بمعنی age) کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دونوں کا تلفظ ایک ہے، اور ''سنہ وسال'' جیسی ترکیبوں میں بھی اسے ''سن'' پڑھتے ہیں۔ تنہا لفظ اول مفتوح کے ساتھ پڑھا ہی جاتا ہے۔ لیکن لکھنے میں جب ''سن'' [اول مکسور] اور ''سن'' [اول مفتوح] کو الگ کرنے کا انتظام ہے تو اس پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟

سوچ اس لفظ کے کئی معنی ہیں:

(۱) فکر، تامل، تذبذب۔ ان معنی میں یہ مذکر ہے:

ان کی بات سن کر میں بڑے سوچ میں پڑ گیا۔

وہ بڑے سوچ کے بعد بولے کہ مجھے منظور ہے۔

ملحوظ رہے کہ ''گہری سوچ'' بھی درست ہے، لیکن یہ استثنائی صورت ہے۔

دشمن کے حملے کی خبر پا کر بادشاہ گہرے / گہری سوچ میں پڑ گیا۔

میں ''گہرے سوچ'' کو ترجیح دوں گا لیکن ''گہری سوچ'' کو غلط نہ کہوں گا۔

(۲) تردد، خیال۔ ان معنی میں بھی یہ مذکر ہے، لیکن اب بہت کم بولا جاتا ہے، قائم چاند پوری ؎

سب خراج مصر دے کر تھا زلیخا کو یہ سوچ مول یوسف سے پسر کا کارواں نے کیا کیا

شوق قدوائی ؎

اس پوچھنے پہ مجھ کو یہ سوچ آ پڑا ہے کس جی سے پوچھتے ہو تم حال میرے جی کا

(۳) ارادہ، خاص کر ایسا ارادہ جو ابھی پختہ نہ ہوا ہو، نیت۔ ان معنی میں یہ مونث ہے:

میں ابھی وہاں جانے کی سوچ میں تھا ہی کہ وہ خود آ گئے۔

ملحوظ رہے کہ ''سوچ'' کا یہ صرف محدود اور مخصوص ہے اور دراصل ''جانے کی سوچ ہی رہا تھا'' کی ایک شکل ہے۔ اس طرح کے فقرے عام ہیں:

میں کھانا کھانے کی سوچ ہی رہا تھا۔

وہ لوگ ہمارے یہاں آنے کی سوچ رہے تھے۔

چوران کے مکان میں نقب لگانے کی سوچ رہے تھے۔

(۴) فکر، بمعنی Thought، یا طرز فکر، یا Thinking۔ ان معنی میں یہ مونث ہے۔ جیسے:

بیدل کی سوچ گہری تھی۔

فلسفی کی سوچ (Thought) کی تھاہ نہیں۔

فقرہ: ذاتی نہ سہی، طبقہ واری تو ہے سوچ تمھاری (شان الحق حقی)۔

فقرہ: تمھاری خضری سوچ تو یہی کہے گی (شان الحق حقی)۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ ''سوچ'' کے مندرجہ بالا معنی اور جنس جدید اردو میں ہیں اور غالباً ہندی کے اثر سے ہمارے یہاں مقبول ہوئے ہیں۔ پرانے زمانے میں یہ معنی شاذ تھے، اور ان معنی میں بھی اس لفظ کی جنس مذکر تھی۔

سورگ باشی دیکھیے: ''آنجہانی''۔

سورگیہ دیکھیے: ''آنجہانی''۔

سوسمار واؤ معروف، بمعنی ''گوہ'' جو چھپکلی کے خاندان کا ایک بڑا جانور ہوتا ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سہولیت اول مفتوح، واؤ معروف، بمعنی ''آسانی، آہستگی'' اردو والوں نے ''سہل'' سے بنا لیا ہے، عربی میں نہیں ہے، وہاں ''سہولت'' البتہ ہے۔ اس وقت اردو میں ''سہولیت'' اور ''سہولت'' دونوں کم و بیش یکساں رائج ہیں۔ ''سہولیت'' کو عموماً بروزن مفاعلن بولتے ہیں۔ جو لوگ اسے بروزن مفاعیلن بولنے پر مصر ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

سہی ''سہی'' دراصل ''صحیح'' کی ہی ایک شکل ہے اور پہلے ''صحیح'' کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ میر کے دیوان دوم میں ہے ؎

حرف غلط کون کرور پہ نہ خوں کے ہوتا جو کچھ کیا ہے میں نے پہلے اسے سہی کر

شروع شروع میں کلمۂ تاکید کے طور پر ''نہ صحیح، تو صحیح، ہی صحیح'' وغیرہ، اور ''نہ سہی، تو سہی، ہی سہی'' وغیرہ، دونوں رائج تھے۔ یعنی جس طرح ہم ''سنو تو سہی، یہ بھی نہ سہی'' وغیرہ کہتے ہیں اسی طرح

پرانے لوگ ''سنو تو سہی، یہ بھی نہ سہی'' وغیرہ لکھتے تھے۔ بولنے میں بہر حال تلفظ ایک ہی تھا۔ ''دیوان یقین'' مرتبہ فرحت فاطمہ میں ایک پوری غزل ہے، مطلع ؎

دکھ تو دیتا ہے کروں میں تجھ کو حیراں تو سہی باغباں اب کے اجاڑے یوں گلستاں تو سہی

ظاہر ہے کہ یہاں شاعر نے ''تو سی'' کے بجائے ''تو سہی'' لکھا ہے داستان امیر حمزہ میں ''تو سہی'' بجائے ''تو سی'' جگہ جگہ ملتا ہے۔ اب ''سی'' بمعنی ''سہی'' رائج نہیں اور ''سہی'' بمعنی ''سی'' بھی رائج نہیں۔ لیکن مراٹھی میں ''دستخط'' کو ''سہی'' کہتے ہیں جو وہی ہمارا ''سہی / سی'' ہے، کیونکہ کوئی کاغذ اسی وقت تصدیق پاتا (صحیح مانا جاتا ہے) جب اس پر دستخط ہوں۔ اردو کے روزمرہ میں ''سہی'' اب محض کلمۂ تاکید ہے۔ ''سہی / تو سہی / نہ سہی / ہی سہی'' وغیرہ سب درست ہیں اور ''صحیح'' کے اصل معنی سے ان کا تعلق محض دور کا ہے۔

سئیس علم دریاؤ ہے یعنی گھوڑے کی دیکھ بھال اور اسے سدھانا سکھانا بہت بڑا علم ہے۔ اصل (عربی) لفظ ''سائیس'' ہے۔ اردو میں ''سئیس'' بھی مستعمل ہے، بلکہ اکثر لوگ ''سئیس'' کو ''سائیس'' پر ترجیح دیں گے۔ مصحفی ؎

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

''فرہنگ آصفیہ'' میں ہے کہ ''سئیس نہایت درست اور ٹھیک ہے۔'' (اب یہ اور بات کہ صاحب ''آصفیہ'' نے ''سئیس'' کا اندراج کیا ہی نہیں، انھوں نے ''سائیس'' کے تحت وہ عبارت لکھی ہے جو میں نے نقل کی)۔ انشا نے ''دریائے لطافت'' میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کے لوگ اس قدر جاہل ہیں کہ ''علم'' کو ''علیم'' کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''علم'' کا تلفظ ''علیم'' تو اب کہیں سننے میں نہیں آتا، لیکن ''علم'' (بہ کسر تین) ضرور سنا گیا ہے۔ اس سے زیادہ مقبول تلفظ ''علم'' ہے، خاص کر اگر زور دینا مقصود ہو۔ چنانچہ مذکورہ بالا کہاوت میں ''علم'' کا تلفظ ''علم'' ہی کیا جاتا ہے، اور یہی اس جگہ درست ہے۔ ملحوظ رہے کہ ''سائیس'' اور ''سیاست'' ایک ہی مادے سے ہیں، س۔ ا۔ س، بمعنی ''دیکھ بھال کرنا، سدھانا، انتظام امور کرنا''۔

سے اول مفتوح بمعنی ''سو بصد'' پہلے ہر جگہ مستعمل تھا۔ غالب نے مرزا تفتہ کو لکھا ہے:

مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سے سولہ سے کے باقی رہے گا۔

اب یہ لفظ صرف پورب میں سنا جاتا ہے۔ اسے وہاں کا مقامی روزمرہ سمجھنا چاہئے۔

سے آنا دیکھئے، ''سے ہونا''۔

سید اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد، بمعنی ''سردار؛ وہ جو حضرت علی اور جناب سیدہ کی اولاد میں ہو''۔ دیکھئے، ''طیب''۔

سیکڑا وحید قریشی نے لکھا ہے کہ لفظ ''سیکڑا''، ''سے'' (بمعنی سو)، اور ''کڑا'' سے مرکب ہے۔ انھوں نے ''کڑا'' کے معنی نہیں لکھے، لیکن غالباً یہ ''سخت، الہٰذا پکا'' کے معنی میں ہے، یعنی پورے پورے سو۔ دہلی اور علاقہ ہائے پورب میں اس کی جمع ''سینکڑوں'' مع نون غنہ مستعمل ہے۔ اس کا املا بھی الف سے اور ہائے ہوز دونوں سے مروج ہے (یعنی سیکڑا اور سیکڑہ)۔ دیکھئے، ''سے''۔

سیمرغ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

سینکڑوں دیکھئے، ''سیکڑا''۔

سے ہونا آج کل ''کے ہونا'' کے معنی میں ''سے ہونا'' کا رواج ہونے لگا ہے۔ مثلاً ''آپ کہاں سے ہیں؟'' یہ انگریزی محاورے کا بے معنی ترجمہ ہے:

سوال: Where are you from?

جواب: I am from India.

افسوس یہ کہ یہ بے معنی محاورہ اب تحریر میں بھی آنے لگا ہے:

غلط اور قبیح: میرے والد سورت کے اس ضلع سے تھے۔۔۔

ظاہر ہے کہ یہاں ''۔۔۔کے تھے/ کے رہنے والے تھے'' وغیرہ کا محل تھا۔ ہمارے یہاں ''کے ہونا''، ''کے رہنے والے ہونا''، وغیرہ مستعمل ہیں۔ میر ؎

وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

افسوس یہ کہ بعض لوگ ''کہاں سے آتے ہیں؟'' بھی بولنے لگے ہیں۔ یہ بھی انگریزی کا بے تکا ترجمہ ہے:

سوال: Where do you come from?

جواب: I come from India

غلط اور واجب الترک اور قبیح: آپ کہاں سے آتے ہیں؟

غلط اور واجب الترک اور قبیح: میں الہ آباد سے آتا ہوں۔

صحیح اور فصیح: آپ کہاں کے ہیں؟/کہاں کے رہنے والے ہیں؟ وغیرہ۔

صحیح اور فصیح: میں الہ آباد کا ہوں/کا رہنے والا ہوں۔

غیر زبان سے ترجمہ تب کرتے ہیں جب اپنے یہاں کوئی مناسب روزمرہ نہ ہو۔ مندرجہ بالا طرح کے تراجم تو اپنی زبان کے مزاج سے ناواقفیت کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں کرتے۔

شاداں بمعنی ''شاد''، یہاں الف نون مزید علیہ ہے اور کوئی معنی نہیں دیتا۔ دیکھئے، ''آباداں''۔

شادی مرگ اس لفظ کے دو معنی اور دو تلفظ ہیں (بہت سے لوگوں نے ایک ہی معنی بتائے ہیں)۔ ایک تلفظ تو بے اضافت بروزن مفعولات یا فاعلات ہے، اور دوسرا باضافت بروزن فاعلاتان یا مستفعلان یا مستفعلان یا مفعولن فعل۔ ملاحظہ ہو:

سودا: (بروزن فاعلات)

چمن میں دہر کے خوش ہو کے جو ہنسا وہ ہیں   برنگ گل اسے گردوں نے شادی مرگ کیا

مومن: (بروزن فاعلات)

ایسی ادا سے بوسۂ لب کا کہ شادی مرگ ہوں   جور و ستم کا میری جان لطف و کرم سے کام لو

آتش: (بروزن مستفعلان)

دم میں شادی مرگ ہو جاتا   تیرے خط کے جواب میں دیکھا

آتش: (بروزن فاعلاتان)

شادی مرگ سے پھولا میں سمانے کا نہیں   گور کہتے ہیں کے نام کفن ہے کس کا

اب معنی سنئے:

(۱) وہ شخص جو فرط مسرت سے مر جائے، فرط مسرت سے مرا ہوا، فرط مسرت سے مر جانے والا۔ اس مفہوم کی رو سے یہ ترکیب فاعلی ہے۔ ان معنی کی اسناد کے لئے سودا اور مومن کے

اشعار اوپر ملاحظہ ہوں۔ایک شعر نسیم دہلوی کا بھی دیکھئے ؎

زخم پڑ کر کھل گئے سینوں پہ اہل بزم کے   تھا جو شادی مرگ ہنس ہنس کر مرا ماتم ہوا

(۲) وہ موت جو فرط مسرت کے باعث واقع ہو۔اس مفہوم کے حساب سے یہ ترکیب مفعولی ہے۔ان معنی کی سند کے لئے اوپر نقل کردہ آتش کا دوسرا شعر دیکھیں۔یہاں ''شادی مرگ'' کے دو معنی ہیں: (۱) افراط خوشی کے باعث موت، اور (۲) موت کی خوشی۔مزید ملاحظہ ہو، بہادر شاہ ظفر ؎

ہے یہ کھٹکا دیکھ کر گل کو نہ شادی مرگ ہو   جب قفس سے چھوٹ کر گلشن کو بلبل جائے گی

اس شعر میں ''شادی مرگ ہو'' کے دونوں معنی ہیں: (۱) بلبل کو شادی مرگ ہو جائے یعنی وہ فرط خوشی سے مر جائے، ایسا شخص بن جائے جو فرط خوشی سے مر جاتا ہے اور (۲) بلبل شادی مرگ ہو جائے، یعنی فرط خوشی سے بلبل کو موت آ جائے، یعنی اسے وہ موت آ جائے جو افراط خوشی کے باعث آتی ہے۔

آتش کے پہلے شعر میں بھی دو معنی ہیں: (۱) انسان ایک دم میں شادی مرگ ہو جائے یعنی ایسا شخص بن جائے جو فرط خوشی سے مر جاتا ہے، اور (۲) انسان کو ایک دم میں شادی مرگ ہو جائے، یعنی اسے وہ موت آ جائے جو افراط خوشی کے باعث آتی ہے۔

یہ خیال رہے کہ اس لفظ کی حد تک تلفظ کی کوئی قید معنی پر نہیں ہے۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک معنی ''شادی مرگ'' بے اضافت سے مخصوص ہوں اور ایک معنی ''شادی مرگ'' باضافت سے۔یہ بھی خیال رہے کہ فارسی میں ''شادی مرگ'' کے ایک ہی معنی ہیں: ''وہ جو فرط مسرت سے مر جائے۔'' میر طاہر وحید ؎

مگو از زخم شمشیرت زجاں بے برگ گردیدم   مرا نیغت نہ کشت از شوق شادی مرگ گردیدم

صائب کے حسب ذیل شعر میں ''شادی مرگ'' کو باضافت بھی پڑھ سکتے ہیں ؎

من کہ از تلخی دشنام شدم شادی مرگ   چہ توقع کنم از لعل شکر خاے کے

لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''شادی مرگ'' باضافت، اور اس کے مفعولی معنی دونوں اردو والوں کی ایجاد ہیں۔

شاہ زادہ/شہزادہ اردو میں یہ صرف نرینہ اولاد شاہ کے لئے ہے، بادشاہ کی بیٹی کو ہم لوگ ''شہزادی/شاہزادی'' کہتے ہیں۔ فارسی میں ایسا نہیں۔ دیکھئے: ''صاحب زادہ''۔

شاہکار مذکر۔ دیکھئے: ''اختراع فائقہ''۔

شاہین یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

شباہت اول مفتوح، اردو میں فقرہ ''شکل و شباہت'' مستعمل ہے اور دونوں الفاظ کم وبیش ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ مصحفی ؎

آنے سے خط کے رنگ ہی کچھ اور ہو گیا وہ شکل اس کی اور وہ شباہت کہاں رہی

فارسی والوں نے یہ لفظ عربی کے طرز پر بنایا اور ''مشابہت، مانندگی'' اس کے معنی قرار دیئے۔ اردو میں بھی یہ معنی مراد لئے گئے لیکن شاذ۔ کسی بنا پر (شاید ''شبیہ'' سے اشتقاق کے دھوکے میں) اردو میں ''شکل، صورت'' کے معنی اس لفظ میں پیدا ہو گئے اور اب یہی معنی متداول ہیں۔ اردو کی حد تک یہ لفظ اور یہ معنی بالکل صحیح ہیں۔ البتہ یہ نہ گمان کرنا چاہئے کہ یہ لفظ عربی ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' سے یہی غلطی ہو گئی ہے۔

شب حامل است تا سحر چہ زاید اس کہاوت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے۔ دنیا اور انسانوں کے حالات ہمیشہ تغیر پذیر ہیں، لہٰذا ہر وقت منتظر رہنا چاہئے کہ دیکھیں اب پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ دیکھئے: ''حاملہ''۔

شب کور وہ گھوڑا جسے رات کو نہ دکھائی دے۔ دیکھئے: ''گھوڑے کے پانچ عیب''۔

شبہ بروزن ''رتبہ''۔ آج کل لاعلمی یا عدم احتیاط کے سبب اس لفظ کو بعض لوگ یوں لکھتے ہیں گویا یہ اور ''شک'' ہم معنی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''شبہ'' بمعنی Suspicion ہے، اور ''شک'' بمعنی Doubt ہے۔

غلط: مجھے شبہ ہے کہ یہ آدمی ویسا نہیں جیسا یہ خود کو بیان کر رہا ہے۔

صحیح: مجھے شک۔۔۔

غلط: ڈاکٹر کو شبہ ہے کہ مریض صحت مند نہ ہو سکے گا۔

صحیح: ڈاکٹر کو شک۔۔۔

غلط: ایسا خوبصورت کہ گلاب کے پھول کا شک ہو۔

صحیح: ۔۔۔ کا شبہ ہو۔

صحیح: چچا جان بڑے شکی آدمی ہیں، اگر انھیں پانی کے تازہ ہونے پر ذرا بھی شبہ ہوا تو وہ اسے پئیں گے نہیں، پھینک دیں گے۔

صحیح: مجھے شبہ تھا کہ وہ چیز نہیں، ہاتھی کی پرچھائیں ہے، لیکن ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو شبہ دور ہو گیا، وہ چیز ہی تھا۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ ''شبہ'' کسی چیز کی نوعیت کے بارے میں ہوتا ہے اور ''شک'' کسی چیز یا بات کی کیفیت کے بارے میں۔ بعض اوقات زور کلام کے لئے ''شک وشبہ'' اکٹھا بول دیتے ہیں۔ لیکن یہ فقرہ وہیں پورا زور حاصل کرتا ہے جہاں نوعیت اور کیفیت دونوں کا بیان یا ان کی طرف اشارہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ ''شک ہونا'' کے ایک معنی ہیں: ''کسی بات کے بارے میں یقین یا اطمینان نہ ہونا۔'' ان معنی میں ''شبہ'' نہیں بول سکتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل جملوں میں ''شک'' کی جگہ ''شبہ'' نہیں بول سکتے:

(۱) مجھے اس بات کی سچائی میں شک ہے۔

(۲) لوگ کہتے تو ہیں، مگر مجھے شک ہے۔ فراق گورکھپوری

مشیتیں کبھی بدلی ہیں اور نہ بدلیں گی یقین اس کا زمانے کو ہے مجھے شک ہے

(۳) ہر بات میں شک کرنا عقلمندی نہیں۔

(۴) مجھے شک ہے کہ کہیں بادشاہ خفا نہ ہو۔ یعنی مجھے اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ۔۔۔

تیسری بات یہ کہ ''شک'' کا اسم مفعول ''مشکوک'' مستعمل ہے، لیکن ''شبہ'' کا اسم مفعول اردو میں کچھ نہیں۔ لہٰذا جہاں شک ہو کہ یہاں ''شبہ'' بہتر ہے کہ ''شک''، تو وہاں اسم مفعول رکھ کر دیکھیں، اگر ٹھیک معلوم ہو تو پھر ''شک'' لکھیں۔ مثلاً:

ان کی شکل پر بالکل ان کی ماں کا شبہ ہوتا ہے۔

ان کی شکل ماں کی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسرا جملہ مضحکہ خیز اور نادرست ہے۔ لہٰذا پہلا جملہ درست ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس لفظ کا صحیح املا ایک ہی ہائے ہوز سے ہے، ''شبہ''۔ کچھ لوگ ''شبہہ'' لکھتے ہیں جو درست نہیں۔

شپرہ اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد، بمعنی ''چمگادڑ''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، تانیث سے عاری نام، جانوروں کے۔

شتر بمعنی ''اونٹ''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

شراکت عام طور پر اول مفتوح کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں اول مکسور ہونا چاہیے، کیونکہ عربی میں ''شرکت'' اول مکسور کے ساتھ ہے۔ لیکن ''شراکت'' تو عربی میں ہے ہی نہیں، اردو فارسی والوں کا بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے تلفظ پر عربی نافذ کرنا بے معنی ہے۔ پلیٹس نے اس لفظ کو فارسی بتایا ہے اور اس خیال سے کہ یہ عربی سے لیا گیا ہے، (حالانکہ یہ استدلال بے معنی ہے) اسے اول مکسور سے لکھا ہے۔ پلیٹس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اول مفتوح سے بھی رائج ہے، لیکن یہ تلفظ عامیانہ ہے۔ شان الحق حقی نے بھی اول مفتوح لکھا ہے اور کہا کہ ''اصلاً شرکت'' [اول مکسور] ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''شرکت'' سے ''شراکت'' بننے کا کوئی اصول نہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اردو فارسی والوں نے اسے ''شرافت'' (اول مفتوح) پر قیاس کر لیا ہے۔ ''آصفیہ'' نے اول مفتوح اور مکسور دونوں صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فارسی میں اول مکسور ہے۔ مختصر یہ کہ اب اردو میں اول مفتوح سے رائج ہے اور یہی مرجح بھی ہے۔ اول مکسور کہنے سے خواہ مخواہ شرک کی طرف دھیان جاتا ہے۔

شرارہ یہاں ہائے ہوز زائد ہے۔ ''شرار'' اور ''شرارہ'' میں بہ اعتبار جنس اور بہ اعتبار معنی کوئی فرق نہیں۔

شربتی رنگ کا نام۔ لیکن بظاہر دو مختلف رنگوں کو ''شربتی'' کہتے ہیں۔ عام طور پر لغات میں اسے ''ہلکا زرد، سرخی مائل'' بتایا گیا ہے، یعنی ایک طرح کا نارنجی۔ ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتاب ''میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' میں ''شربتی'' رنگ کی تعریف حسب ذیل لکھی ہے: ''نارنجی رنگ، زرد دھیما رنگ، فالسئی دودھیا مائل''۔ پلیٹس نے اسے Orange or pale yellow

colour بتایا ہے۔ "نور اللغات" میں اسے "ہلکا زرد کسی قدر سرخی لئے ہوئے رنگ، ہار سنگھار اور شہاب ملا کر بنایا ہوا رنگ" لکھا ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں یہی لفظ دہرا دیے گئے ہیں، لیکن آگے عجیب عبارت لکھی ہے: "(آنکھوں کی صفت) شربت کے رنگ سے مشابہ۔" ظاہر ہے کہ یہ تعریف دوری (circular) ہے، کیوں کہ "شربت" کس رنگ کا ہوتا ہے، بیان نہیں کیا گیا۔ سند میں واجد علی شاہ کا ایک شعر لکھا ہے جس سے بات کچھ واضح ہوتی ہے ؎

کون ان کو سیاہ کہتا ہے واہ ہر آنکھ شربتی ہی تو ہے

اس سے متبادر ہوتا ہے کہ "شربتی" رنگ کچھ سیاہی مائل ہوتا ہوگا۔ اس کی تصدیق شان الحق حقی کی "فرہنگ تلفظ" سے ہوتی ہے جس میں "شربتی" کے معنی "گڑ کے شربت کا رنگ کا" درج ہیں۔ یہ معنی آنکھ کے رنگ کے لئے بہت مناسب ہیں، اور واجد علی شاہ کا شعر بھی ان کی تصدیق کرتا ہے، کہ گڑ کے شربت کا رنگ کچھ سرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں عبد الحلیم شرر کا بھی ایک فقرہ درج ہے: "گھنی داڑھی، چھوٹی چھوٹی اور شربتی آنکھیں۔" "نور اللغات" نے اپنی تعریف پوری کی پوری "فرہنگ آصفیہ" سے اخذ کی ہے۔ "آصفیہ" میں (اور اس کے تتبع میں "نور" میں) مولفین نے یہاں ایک غیر متعلق عبارت "شکری فالسے" کے بارے میں لکھ کر بحر لکھنوی کا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے ؎

یہ آب آب خال رخ یار سے ہوئے شکری جو تھے وہ شربتی اب فالسے ہوئے

لیکن اس شعر سے "شربتی" کے معنی "سرخی مائل سیاہ رنگ" بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ بڑے فالسوں کو "شکری" کہتے ہیں، اور فالسے کا رنگ سرخی مائل سیاہ، یعنی "شربتی" ہوتا ہے، اور یہی رنگ "خال" کا بھی ہوتا ہے۔ بحر کا شعر کمال کا ہے، کہ "شکری" اور "شربتی" دونوں میں تعلیل نہایت خوب ہے اور ایہام بھی ہے۔

لہٰذا "شربتی" رنگ دو طرح کے رنگوں کو کہتے ہیں۔ ایک تو سرخی مائل ہلکا زرد یا نارنجی رنگ (ان معنی میں فارسی میں "شکری" ہے)، اور دوسرا گڑ کے شربت کے رنگ کا، یعنی سرخی مائل سیاہ رنگ۔ ان معنی میں "تیلیاں" رنگ اس کی بالکل ضد ہوا، یعنی سیاہی مائل سرخ رنگ۔ دیکھئے، "تیلیاں"۔

ملحوظ رہے کہ اردو میں "شکری" کوئی رنگ نہیں ہے، اور فارسی میں "شربتی" اور "شکری" البتہ رنگ ہیں۔ اردو فارسی میں بعض پھلوں اور پتھروں کو "شربتی" اور "شکری" کہتے ہیں، لیکن ان معنی سے فی الحال بحث نہیں۔ میر کے یہاں "شربتی" بمعنی "میٹھا" یا "سرخی مائل سیاہ، جیسا کہ مسی لگا ہوا ہونٹ ہوتا ہے" ضرور ہے ؂

ہائے اس شربتی لب سے جدا   کچھ بتاشا سا گھلا جاتا ہے جی

شرجیل شرجیل، بروزن تفصیل (اول مفتوح، یائے معروف) مردانہ نام کے طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس لفظ کے صحیح معنی نہیں مل سکے۔ "شرج" مع اول مفتوح اور دوم ساکن کے ایک معنی ہیں: "سنگستان سے نرم زمین کی طرف بہنے والا پانی"۔ شرجیل غالباً اسی سے مشتق ہے لیکن "شرجیل" کسی لغت میں ملا نہیں۔

شرحبیل اول مضموم، دوم مفتوح، مع یائے معروف، بروزن تفاعیل (شُرَح بیل) مشہور صحابی تھے۔ عام طور پر وہ شرحبیل بن حسنہ، یعنی اپنی والدہ محترمہ کی نسبت سے مشہور ہیں۔ بہت سے لوگ ان کا نام "شرجیل" بروزن تفعیل پڑھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔

شغل عربی میں اول مضموم، اور بعض صورتوں میں اول مفتوح ہے، لیکن اردو میں اول مفتوح رائج ہے اور اردو کے لئے یہی صحیح ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" نے اول مفتوح اور مضموم دونوں کا التزام کیا ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

شک دیکھئے: "شبہ"۔

شکر "چینی" کے معنی میں بتحسین بروزن فعل ہے، لیکن اول مفتوح اور دوم مفتوح مشدد بروزن فع لن یا "چکر" بھی درست ہے۔ امداد علی بحر ؂

شکر گذار بہر صورت ہیں   زہر ہمیں دو یا شکر دو

شکر خورا ایک چھوٹی سی چڑیا جو صرف پھولوں کا عرق پیتی ہے۔ اسی لئے کہاوت ہے: خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔

دیکھئے: "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔ جناب عبد الرشید نے بتایا ہے کہ نظیر اکبرآبادی نے اس کا مونث "شکر خوری" استعمال کیا ہے ؂

شکر کے غم میں شکر خوری خاک اڑاتی ہے جلیبی پیڑوں پر مکھی بھنبھناتی ہے

''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ''شکر خوری'' کے معنی ''شکر کھانے کی عادت'' لکھے ہیں، اور ان معنی کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی اور نظیر کے شعر میں بھی یہی معنی معلوم ہوتے ہیں۔

شکری ''چینی کی طرح کا، یا چینی جیسا [میٹھا]، یا چینی ملا ہوا'' کے معنی میں فتحۂ اول و دوم کے ساتھ بھی ٹھیک ہے اور اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد بھی درست ہے۔ ''شکریں'' میں نون زائد ہے اور معنی کا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ حرکات میں دونوں الفاظ متحد ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ بعض پھلوں کو بھی ''شکری'' کہتے ہیں۔ ان معنی میں حرف دوم مشدد نہیں ہے۔ اور ''شکریں'' سے یہ معنی مستفاد بھی نہیں ہوتے۔ دیکھئے، ''شربتی''۔

شکریں دیکھئے، ''شکری''۔

شکست بیش از بیش بولنے والوں کی زبان پر اس لفظ کو اول مکسور اور دوم مفتوح کے ساتھ سنا گیا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی زبان پر اول مفتوح اور دوم مکسور کے ساتھ بھی سنا گیا ہے۔ اس تلفظ کی تائید کسی لغت سے نہیں ہوتی۔ موجودہ صورت حال میں اول مفتوح اور دوم مکسور کے ساتھ تلفظ کو غلط اور قابل ترک سمجھنا چاہئے۔

شکنجہ کسنا تہدید کے طور پر کسی شخص کے ساتھ کچھ سختی کا برتاؤ کرنا، کسی شخص کی آزادی عمل پر بطور سزا روک لگانا، کسی بھی کام کے کرنے والے کو اس کام کی ممانعت کرنا۔ ان معنی میں ہندی والوں نے یہ محاورہ وضع کیا ہے۔ اردو میں اس کا وجود نہیں، اور نہ رہے تو اچھا ہے۔

غلط: حکومت نے شیوسینا پر شکنجہ کسا۔

صحیح: ۔۔۔کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا۔

صحیح: ۔۔۔کے ساتھ حکومت کا سخت رویہ۔

غلط: عام جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر لگانے والوں پر شکنجہ کسا گیا۔

صحیح: ۔۔۔کو سختی سے روکا گیا۔

صحیح: ۔۔۔پر سختی سے روک لگائی گئی۔

غلط: اسلام میں اسراف پر شکنجہ کسا گیا۔
صحیح: ۔۔۔اسراف کے خلاف سختی کی گئی / کے خلاف سخت احکام جاری۔۔۔/ سخت اقدامات۔۔۔
ملحوظ رہے کہ اردو کے محاورے ''شکنجے پر کسنا''؛ ''شکنجے پر چڑھانا''؛ ''شکنجے میں کھینچنا'' وغیرہ ہیں لیکن ان کے معنی مختلف ہیں۔ دیکھئے: ''لگام کسنا''۔

شک و شبہ دیکھئے: ''شبہ''۔

شکوہ عربی میں الف مقصورہ سے ہے۔ اردو فارسی میں ہائے ہوز ہی سے صحیح ہے۔ بعض لوگ اس کا تلفظ اول مفتوح سے کرتے ہیں اور بعض لوگ مصر ہیں کہ عربی میں ''شکویٰ'' ہے، لہٰذا اردو میں بھی ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ عربی کا تلفظ یا محاورہ اردو کے لئے کوئی سند نہیں۔

شکیل بمعنی اچھی شکل والا؛ ''شکیلہ'' مونث۔ یہ لفظ عربی نہیں، فارسی ہے لیکن ممکن ہے فارسی والوں نے اسے عربی ''بعد/ بعید؛ عرض/ عریض'' کے طرز پر ''شکیل'' بمعنی [اچھی] شکل والا'' بنا لیا ہو۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ اردو میں یہ لفظ بالکل صحیح ہے۔ عربی نہ سہی، لیکن فارسی ہونے کی وجہ سے فارسی/ عربی الفاظ کے ساتھ بے تکلف اس کو مع اضافت لکھا گیا ہے۔

شمارہ فارسی میں ''شمار'' اور ''شمارہ'' کم و بیش ہم معنی ہیں۔ لیکن اردو میں یہ لفظ صرف ''اخبار یا رسالے کی گنتی'' کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً ''کاروان ادب کا شمارہ پانچ''، یا ''کاروان ادب کا تیسرا شمارہ'' وغیرہ۔ رسالے اور اخبار کی گنتی کے ساتھ یہ لفظ اس قدر منسلک ہو گیا ہے کہ ''شمارہ'' بمعنی ''پرچہ، رسالہ'' بھی بولنے لگے ہیں۔ مثلاً ''جون کا شمارہ''، یا ''تازہ شمارہ''۔ اکثر یوں بھی بولتے ہیں: ''شمارہ آیا کہ نہیں؟'' یعنی ''رسالہ آیا کہ نہیں؟'' یہ لفظ گذشتہ ساٹھ ستر برس میں اردو میں رائج ہوا ہے۔ ''نور اللغات'' میں اس کا اندراج نہیں ہے۔

شوقین بمعنی ''شوق رکھنے والا، دلدادہ، رنگین مزاج'' فارسی میں نہیں ہے اور عربی میں تو ممکن ہی نہیں کیونکہ وہاں ''ین'' کا لاحقہ نہیں ہے۔ یہ لفظ اردو والوں نے ''رنگ/ رنگین؛ سنگ/ سنگین'' کے طرز پر بنا لیا ہے۔ چونکہ یہ خالص اردو ہے اس لئے اسے فارسی عربی لفظوں کے ساتھ مرکب نہیں دیکھا گیا۔

شوقیہ بمعنی ''شوق کے طور پر، کسی خاص مقصد یا سنجیدگی سے نہیں''، یہ لفظ اردو ہے۔ ''شوق

سے بھرا ہوا'' (جیسے ''شوقیہ خط'') کے معنی میں یہ فارسی سے اردو میں آیا ہے۔ ''شوقی'' کے مونث کے طور پر یہ عربی میں بھی ہے لیکن ان معنی میں یہ لفظ اردو میں مستعمل نہیں۔

شہاب کسم کے پھول کو فارسی میں ''شہاب'' کہتے ہیں (اول مفتوح)۔ اس پھول سے ایک نہایت شوخ سرخ رنگ بنتا ہے۔ اردو میں ''میدہ شہاب رنگ'' اسی کی مناسبت سے ایسے شخص کے لئے کہتے ہیں جو بہت خوبصورت اور سرخ سفید رنگ کا ہو۔ اول مکسور کے ساتھ ''شہاب'' عربی ہے، بمعنی ''روشن ستارہ'' یا ''ٹوٹتا ہوا تارا'' (انگریزی میں shooting star)۔ لہٰذا ''شہاب الدین'' نام میں اول مکسور ہے لیکن بعض لوگ اول مفتوح سے لکھتے ہیں۔

شہر عربی کا ''شہر'' اور اردو فارسی کا ''شہر'' الگ الگ لفظ ہیں۔ عربی لفظ کا مادہ ش۔ ہ۔ ر۔ ہے جس کے معنی ہیں، ''نمودار ہونا، نمایاں ہونا۔'' چونکہ مہینے کا آغاز چاند کے نمودار ہونے پر منحصر تھا، لہٰذا شہر کے ''مہینہ'' ہو گئے، یعنی جب چاند نمودار ہوا تو مہینہ شروع ہوا۔ فارسی کا لفظ ''ماہ'' بمعنی ''مہینہ'' بھی اسی منطق کی یادگار ہے۔ اردو فارسی لفظ ''شہر'' بمعنی City وغیرہ، بہت قدیم فارسی لفظ ہے۔ قدیم فارسی میں یہ لفظ کچھ ''کشتر'' کی طرح کا تھا۔ سنسکرت میں بھی یہ ''کشتر'' ہے جہاں سے ہم نے ''شہر'' بنالیا۔

شہرت دیکھئے، ''تشہیر''۔

شیشہ پہلے زمانے میں یہ لفظ ''بوتل'' کے معنی میں بھی مروج تھا۔ میر درد ؎

نشہ کیا جانے وہ کہنے کو ہے آشام ہے شیشہ　　جہاں میں دختر رز سے عبث بدنام ہے شیشہ

حیدرآبادی اردو میں ''شیشہ'' اب بھی ''بوتل'' کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہ مناسب بھی ہے۔ اس معنی میں اس کی تصغیر ''شیشی'' ہر جگہ رائج ہے۔ ''شیشہ'' بمعنی ''بوتل'' کو رواج دینا چاہئے، کہ یہ ہر طرح ''بوتل'' سے بہتر لفظ ہے۔ دونوں ہی مروج رہیں تو اور بھی خوب ہے۔

شیعہ اس لفظ کی جمع ''شیعوں'' ہے، لیکن دہلی اور بعض دوسرے علاقوں میں ''شیعاؤں'' مستعمل ہے۔ اسے علاقائی تصرف سمجھنا چاہئے۔

شین، سین اردو میں ایک لطف کی بات یہ بھی ہے کہ اگرچہ اس میں ''شین'' کو صحیح ادا کرنے پر بہت زور دیا جاتا ہے، اور جس شخص کا لہجہ گنوارو ہو، اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں کا

''شین قاف درست نہیں ہے''۔ لیکن غیر زبانوں سے بہت سے لفظ ہم نے ایسے لئے ہیں جن میں شین کو ہم نے بدل کر ''سین'' کر دیا ہے، اور وہی فصیح ہے:

بدیش، غلط / بدیس، صحیح (اسی طرح، ویس بدیس)؛ دیش، غلط / دیس، صحیح؛

کارتوش، غلط / کارتوس، صحیح؛ ویش، غلط / بھیس، صحیح۔

غالب نے ''پنشن'' کو برابر ''پنسن'' اور ''انگلش'' کو برابر ''انگلس'' لکھا ہے۔ یہ دونوں تلفظ اب رائج نہیں، لیکن فارسی میں اب بھی ''انگلیس / انگلیسی'' کہتے ہیں۔

صاحب سوم مکسور، لیکن پہلے زمانے میں سوم مفتوح بھی بولتے تھے، غالب ؎

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

''صاحب'' آج کل بھی زبانوں پر سوم مفتوح کے ساتھ ہے، خصوصاً جب بلا اضافت بولا جائے۔ پلیٹس نے بھی سوم کے فتحہ کے ساتھ تلفظ دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ''صاحب'' (بروزن ''طالب'') کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ فارسی میں اس لفظ کے معروف معنی ''یار'' یعنی ''ساتھی'' کے ہیں، اور ''وزیر'' اور ''خداوند'' کے بھی معنی میں بولا جاتا ہے (''بہار عجم'')۔ یہ معنی اردو میں متداول نہیں ہیں۔ یعنی ''یار، وزیر، خداوند، مالک'' وغیرہ کے معنی میں تنہا لفظ ''صاحب'' بہت شاذ ہے، لیکن اضافت کے ساتھ ''مالک، خداوند'' کے معنی میں بکثرت مستعمل ہے۔ ''افسر'' کے معنی میں البتہ کبھی اسے بولتے ہیں: ''صاحب آگئے ہیں۔'' یا ''صاحب بیٹھے ہیں۔'' وغیرہ۔ اردو میں اس لفظ کے کئی اور معنی ہیں جو فارسی عربی میں نہیں ہیں۔ مثلاً معشوق، بیوی، شوہر، افسر، ان سب کے لئے ''صاحب'' لاتے ہیں۔ بیوی کے لئے ''میری صاحب'' کا فقرہ ایک زمانے میں عام تھا۔ اب بعض عورتیں اپنے شوہر کو ''میرے صاحب'' کہتی ہیں۔ محترم لوگوں کے نام یا لقب یا خطاب کے آگے بھی ''صاحب'' لگاتے ہیں، مثلاً ''داغ صاحب، ڈاکٹر صاحب، ماسٹر صاحب، میر صاحب، نواب صاحب''، وغیرہ۔ لیکن نبیوں کے نام کے آگے ''صاحب'' نہیں لگتا۔ ''محمد صاحب'' اردو کا روزمرہ نہیں ہے۔ ہندی میں ضرور ملتا ہے۔ اردو میں کبھی کبھی ''حضرت محمد صاحب'' کہہ دیتے ہیں۔ اردو میں ''پیغمبر صاحب'' نامانوس تو نہیں

ہے لیکن بہت کم سننے میں آتا ہے۔ ''ارے صاحب، واہ صاحب، صاحب من'' [موخر الذکر مع اضافت] جیسے فقروں میں ''صاحب'' کے معنی میں ''خداوند'' کا بھی شائبہ ہے اور محض احترام کا بھی۔ دیکھئے: ''صاحب''۔

صاحب حال یہ ترکیب عام طور پر کسرۂ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ ''سب رس'' میں حسب ذیل فقرہ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں ''صاحب حال'' باضافت ہے:

اگر مرد ہے توں صاحب حال تو اس نفسانی خطریاں کو سنبھال۔

دیکھئے: ''فک اضافت''۔

صاحب حسن یہ ترکیب بے اضافت شاذ ہے۔ آتش نے باضافت باندھا ہے

صاحب حسن وہ صانع نے بنایا ہے تجھے حسرت بندگی آزاد کیا کرتے ہیں

صاحب دل عام خیال ہے کہ یہ ترکیب ہمیشہ بے اضافت بولی جاتی ہے، لیکن یہ درست نہیں۔ آرزو لکھنوی کا شعر سند کے لئے دیکھئے: ''فک اضافت''۔

صاحب دیوان بہ اضافت، بمعنی ''دیوان [یعنی دفتر] کا مالک''۔ فارسی میں ''وزیر'' کے معنی میں مستعمل ہے، طاہر وحید ؎

صاحب دیواں علی ابن ابی طالب کہ ہست خلق عالم راز نامش اسم اعظم بر زباں

اردو میں ان معنی میں صرف ''دیوان'' ہے، اور یہ لفظ بعض ہندوستانی ریاستوں کے وزراء اول کے لئے مخصوص تھا۔ ''صاحب دیوان'' کے معنی ہمارے یہاں اس شاعر کو کہتے ہیں جس نے اپنے اشعار کا مجموعہ حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیا ہو اور اسے ''دیوان'' کا نام دیا ہو۔ آغا جان عیش نے غالب کی ہجو میں کہا تھا ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

صاحب زادہ یہ فقرہ صرف دوسروں کے بیٹے کے لئے تعظیماً یا تکلفاً بولا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے اپنے بیٹے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ نہایت قبیح ہے۔

غلط اور قبیح: میرے صاحب زادے ان دنوں یہاں نہیں ہیں۔

صحیح: میرا بیٹا/لڑکا۔۔۔

صحیح: کیا یہ آپ کے صاحب زادے ہیں؟

اردو میں ''صاحب زادہ'' کا مونث ''صاحب زادی'' مستعمل ہے۔ لیکن ملحوظ رہے کہ فارسی میں نہ ''شہزادی/شاہزادی'' ہے نہ ''صاحب زادی''، کیونکہ وہاں مذکر مونث کا جھگڑا نہیں۔ لہٰذا فارسی میں بادشاہ کی بیٹی کو بھی ''شاہزادہ/شہزادہ'' کہتے ہیں، اور اولاد کے لئے ''صاحب زادہ'' بلاتخصیص جنس مستعمل ہے۔

صاحب زادی دیکھئے: ''صاحب زادہ''۔

صاحب فراش عموماً بے اضافت بولا جاتا ہے۔ کوئی باضافت بولے تو غلط نہ ہوگا، لیکن خلاف محاورہ کہا جا سکتا ہے۔ دیکھئے: ''فک اضافت''۔

صاحب کمال عام طور پر بے اضافت بولتے ہیں لیکن باضافت بھی غلط نہیں۔ سند کے لئے اصغر علی خاں نسیم کا شعر دیکھئے: ''فک اضافت''۔

صاحبہ ''بہار عجم'' میں ''صاحبہ'' درج نہیں۔ ''آنند راج'' میں اس کے معنی لکھے ہیں، ''وہ عورت جو کسی کی بیوی ہو۔'' یعنی اردو میں جن معنی (بیوی) میں ''صاحب'' ہے، فارسی میں ''صاحبہ'' انھیں معنی میں ہے۔ اردو میں صاحبہ'' کو ''صاحب'' کی تانیث قرار دے کر عورتوں کے نام یا عہدے کے ساتھ ''صاحبہ'' کا لاحقہ گذشتہ پچاس ساٹھ برس میں رواج پا گیا ہے۔ ورنہ شبلی نے اپنے مکتوبات میں زہرا فیضی کو ہمیشہ ''زہرا صاحب'' لکھا ہے۔ آج بھی ''بیگم صاحب'' زیادہ رائج ہے، ''بیگم صاحبہ'' کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ''شہزادی، ملکہ'' وغیرہ جیسے الفاظ اور رشتوں کے ساتھ اب ''صاحبہ'' کا چلن عام ہو گیا ہے۔

نامناسب: استانی صاحبہ، بی بی صاحبہ، بیگم صاحبہ، خاتون خانہ صاحبہ، وغیرہ۔

مناسب: استانی صاحب، بی بی صاحب، بیگم صاحب، پرنسپل صاحب، خاتون خانہ صاحب، ڈاکٹر صاحب، سکریٹری صاحب، لیڈی ڈاکٹر صاحب، وغیرہ۔

مناسب: بھابی صاحبہ، بھیرانی صاحبہ، خالہ صاحبہ، دادی صاحبہ، رانی صاحبہ۔ [لیکن اگر اس جگہ کا بھی نام بتایا جائے جہاں کی رانی ہے، تو ''صاحب'' لگانا بہتر ہے۔ مثلاً ''رانی صاحب جے پور، رانی صاحب دربھنگہ'' وغیرہ] شہزادی صاحبہ، ملکہ صاحبہ وغیرہ۔

عبدالرشید کہتے ہیں کہ یہ لفظ "آصفیہ" میں بھی ہے۔ یہ درست ہے، لیکن وہاں جو معنی لکھے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں (جناب، صاحب کی تانیث)۔ ان سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ جناب فیصل احمد بھٹکلی نے مجھے بتایا ہے کہ عربی میں "صاحب" بمعنی "شوہر" اور "صاحبہ" بمعنی "بیوی" عام ہیں۔

صاف نامہ دیکھیے، "کلین چٹ"۔

صحارا عربی میں الف مقصورہ سے ہے۔ اردو میں سیدھے الف ہی سے صحیح ہے۔ فارسی میں الف مقصورہ سے بھی لکھا گیا ہے، بلکہ "صحاری" بھی فارسی میں ملتا ہے۔ منوچہری ؎

شدم از صحاری من اندر عماری وقد صرت حقا سعید العواقب

صحیح پرانی اردو میں "صحیح" کی ایک شکل "سہی" بھی تھی۔ دیکھیے، "سہی"۔

صفیل اول مفتوح، یائے معروف۔ انشا نے لکھا ہے کہ اہل دلی "فصیل" کو "سفیل/صفیل" بولتے ہیں، اور یہی فصیح سمجھا جائے گا۔ یہ تلفظ دہلی کے باہر نہ پہلے سنا گیا اور نہ اب پرانی دلی کے لوگوں کے علاوہ کوئی اسے برتتا ہے۔ اس تلفظ کو اب دہلی کی علاقائی زبان قرار دینا چاہیے، لیکن ممکن ہے سو برس ادھر یہ دہلی کے باہر بھی مروج رہا ہو۔ شیخ تصدق حسین لکھنوی کی داستان "آفتاب شجاعت"، جلد سوم (مطبوعہ ۱۹۰۲) کے صفحہ ۹۴۶ پر ہے:

ایک جوان تاجدار صفیل قلعہ پر زیر تکبیر ہ زر بفتی کھڑا ہوا ہے۔

عبدالرشید نے لکھا ہے کہ یہ لفظ کئی لغات میں ہے اور دہلی کے سن رسیدہ لوگوں، خصوصاً عورتوں میں اب بھی سنا جاتا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اردو میں بعض الفاظ کا عوامی تلفظ ایک دو حرفوں کی تقدیم و تاخیر سے بھی رائج ہے۔ دیکھیے "تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں"۔

صلواتیں سنانا بمعنی "برا بھلا کہنا"۔ دیکھیے، "مزاج"۔

طاؤس مشہور پرند، اور ایک ساز کا نام۔ دونوں معنی میں یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

طبابت اول مکسور، بمعنی "طب کا پیشہ، یا طبیب کا کام"۔ یہ لفظ فارسی والوں "طب" سے بنایا ہے لیکن تعصب کا یہ عالم ہے کہ اسے نہ "آنندراج" میں جگہ ملی ہے نہ "لغت نامۂ دہخدا" میں۔

''وضعذا'' میں ''طب'' پر ایک طویل عبارت ہے جس میں ''طبابت'' دوبار آیا ہے، لیکن خود ''لغت نامہ'' اس لفظ سے خالی ہے۔ اردو میں یہ بہرحال بالکل صحیح ہے، صرف اتنا خیال رکھیں کہ اس کو عربی نہ سمجھیں، جیسا کہ بعض اردو لغات میں بتایا گیا ہے۔

طبیعیات بمعنی Physics۔ یہ لفظ اصل میں بروزن مفاعیلان ہے، لیکن اردو میں بروزن مفاعلان رائج ہو گیا ہے اور یہی فصیح ہے۔ بعض لوگ سے ''طبیعات'' بروزن فعولات بولتے ہیں۔ اس تلفظ کا کوئی جواز نہیں۔

طربیہ کامیڈی (Comedy) کے معنی میں یہ لفظ عربی میں نہیں ہے، اردو والوں کا بنایا ہوا ہے۔ بعض لوگ اسے عربی سمجھ کر اصرار کرتے ہیں کہ اس میں یائے تحتانی مشدد ہے اور اسے بروزن مفاعیلن برتنا چاہئے۔ لیکن یہ سراسر بھول ہے۔ بے شک یہ لفظ عربی ''طرب'' سے بنایا گیا ہے، لیکن یہ مہند بالعربی ہے، صحیح معنی میں یہ عربی نہیں، لہٰذا اس پر عربی قاعدے جاری کرنا بے معنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر یہ لفظ عربی میں بمعنی Comedy ہوتا بھی، تو اردو میں دخیل ہو جانے کے بعد اسے اردو قرار دیا جانا چاہئے۔ لفظ جس زبان میں داخل ہوتا ہے، اس کا پابند ہو جاتا ہے۔ غیر زبان میں داخل ہونے کے بعد اس پر اس زبان کے قاعدے نافذ نہیں ہو سکتے جہاں سے وہ آیا ہے۔ دیکھئے، ''المیہ''۔

طمانیت عربی میں یہ لفظ ''طمانینت'' (طما+نی+نت) ہے۔ لیکن اردو میں ''طمانیت'' بروزن مفاعلن یا بروزن مفاعیلن رائج ہے، اور یہی صحیح ہے۔ اردو میں ''طمانینت'' ہے ہی نہیں۔

طوطی بعض کا قول ہے کہ اس پرندے کا نام واحد حالت میں مذکر ہے، لیکن جمع کی حالت میں مونث۔ امداد علی بحر کا شعر ہے ؎

سحر کی باتیں ہیں غنچہ سادہن گل ہو گیا طوطی روئے مخطط صاف بلبل ہو گیا

غالب نے اپنے مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۶۳ میں میر مہدی مجروح کو لکھا ہے:

طوطی بولتا ہے۔ بلبل بولتی ہے۔

امداد علی بحر ہی نے جمع کی حالت میں مونث باندھا ہے ؎

آئینہ ہوتا ہے منھ دیکھ کے پانی پانی طوطیاں ہوتی ہیں سن کر تری تقریر سفید

بحر کے دیوان ''ریاض البحر'' مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۶۸ء میں یہ شعر یوں درج ہے ؎

آئینہ ہوتا ہی منھ دیکھ کی پانی پانی   طوطیاں ہوتی ہیں سن کرتری تقریر سفید

یہاں چونکہ چھوٹی ی اور بڑی ے کی کتابت میں فرق نہیں کیا گیا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ بحر نے ''طوطیاں ہوتے ہیں'' لکھا ہو۔ نظیر اکبرآبادی نے البتہ صاف مونث لکھا ہے ؎

بولے جو شوم بھڑوا مار اس کے سر پہ جوتی   دودن تو دوستوں میں بلوالے اپنی طوطی

اس سے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ واحد کی حالت میں یہ لفظ مذکر ہے۔ ''صاحب آصفیہ'' نے اسے صرف مذکر لکھا ہے، لیکن نظیر کی سند کے ساتھ کہا ہے کہ آج کل لوگوں کی زبان پر مونث ہی ہے۔ لیکن نظیر کے سوا جتنے شعر انھوں نے نقل کئے ہیں سب میں یہ مذکر ہی بندھا ہے۔ عبدالرشید نے مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ ولی اور سودا نے اسے مونث باندھا ہے۔ شان الحق حقی نے اسے مذکر بتایا ہے اور آج کے زمانے میں یہی درست ہے اور یہ قول اب درست نہیں کہ جمع کی حالت میں یہ لفظ مونث ہے اور واحد کی حالت میں مذکر۔

طیار دیکھئے ''تیار''۔

طیب عربی میں بکسر تحتانی مشدد بمعنی ''پاک، خوشگوار، اچھا، خبیث کا الٹا'' درست ہے۔ لیکن اردو میں تحتانی کے زبر کے ساتھ بروزن ''نیر'' (بمعنی سورج) مستعمل ہے اور اردو کے لئے یہی درست ہے۔ آنحضرتؐ کے دو صاحب زادگان کے نام طیب اور طاہر یا مطاہر، اور بقول بعض طاہر اور مطاہر بتائے گئے ہیں۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ صاحبزادۂ نبی کے نام کے طور پر ''طیب'' مع فتحہ وتشدید تحتانی (یعنی طَیَّب) ہی درست ہے۔ یہ قول مختلف فیہ ہے، بہر حال اردو میں ''طیب'' چھوٹی ی پر زبر کے ساتھ (بروزن ''نیر'' بمعنی سورج) ہی درست ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یائے تحتانی مکسور مشدد کے پہلے فتحہ ہو تو اردو والے یائے تحتانی کے کسرہ کو فتحہ میں بدل دیتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کے تمام الفاظ میں تحتانی مکسور ہے لیکن اردو میں مفتوح بولی جاتی ہے:

جید؛ سید؛ میت؛ وغیرہ۔

ظاہری بات بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ''ظاہر ہے'' کی جگہ ''ظاہری بات ہے'' زیادہ لطف یا حسن، یا زور رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فقرے میں محض تصنع ہے، اور معنوی لطف کچھ نہیں۔

کوئی بات یا تو ظاہر ہوگی، یا ظاہر نہ ہوگی۔ ''ظاہری'' بات کا کوئی رتبہ نہیں۔ اور اگر واقعی شک کا بیان مقصود ہو تو اور بھی فقرے ہیں:

نامناسب اور قبیح: ظاہری بات ہے کہ پہاڑوں پر میدان سے زیادہ ٹھنڈک ہوتی ہے۔

نامناسب اور قبیح: ظاہری بات ہے کہ شعر میں نثر سے زیادہ ایجاز ہونا چاہئے۔

مناسب: ظاہر ہے کہ۔۔۔

مناسب: یہ بات کم وبیش ظاہر ہے کہ۔۔۔

مناسب: یہ بات تو گویا سامنے کی ہے کہ۔۔۔

مناسب: ۔۔۔ قریب قریب ظاہری ہے۔۔۔

عادی اردو میں یہ لفظ ''عادت اختیار کرنے والا، یعنی جس شخص کو کوئی عادت ہو'' کے معنی میں مستعمل ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس معنی کو ظاہر کرنے والا لفظ عربی میں ''معتاد'' ہے نہ کہ ''عادی''، لہٰذا ''عادی'' کو ترک کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا سروکار اردو سے ہے، عربی سے نہیں۔ اردو کے لئے یہ لفظ مہند بالعربی ہے اور ''عادت اختیار کرنے والا'' کے معنی میں بالکل درست ہے۔ اردو میں ''معتاد'' شاید ہی کوئی بولتا یا لکھتا ہو، لیکن اگر کسی نے لکھا، یا بولا، تو اس نے اردو میں عربی کی ملاوٹ کی۔ یہی صورت ''راشی'' کی ہے۔ دیکھئے: ''راشی''۔

عالم کار دیکھئے: ''گلوبل/گلوبلائزیشن''۔

عالم کاری دیکھئے: ''گلوبل/گلوبلائزیشن''۔

عجلت عربی میں اول ودوم دونوں مفتوح ہیں۔ لیکن اردو میں یہ لفظ اول مضموم اور دوم ساکن کے ساتھ رائج ہے، اور اردو کے لئے وہی صحیح ہے۔

عدد جس طرح ''رقم'' اور ''نگ'' کو مطلق گنتی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اسی طرح ''عدد'' کو بھی جواہرات یا سامان کی گنتی کے بھی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، یعنی ''چار عدد کی انگوٹھی'' کے معنی ہوں گے: ''انگوٹھی جس میں چار نگ لگے ہوں''۔ میر (دیوان اول)

اشک تر قطرۂ خوں لخت جگر پارۂ دل ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہ کر نکلا

یعنی لطف کی بات یہ ہے کہ ''نگ'' کے معنی ہیں، ''قیمتی پتھر''، اور اسے ''عدد'' کے معنی میں استعمال

کرتے ہیں (مثلاً ''سامان چار رنگ ہے'')، اور ''عدد'' کے معنی ہیں محض گنتی (Number) اور اسے قیمتی پتھر کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ دیکھئے ''رقم''، ''نگ''۔

عرصہ عربی فارسی میں ''میدان'' کے معنی میں، اور اردو میں ''مدت'' کے معنی میں ہے۔ ''مدت'' کے معنی میں اس لفظ کو اس بنا پر غلط قرار دینا کہ عربی فارسی میں یہ معنی نہیں ہیں، اردو کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔

عصفور اول مضموم، واؤ معروف، بمعنی ''گوریا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

عصمت یہ لفظ بکسر اول اور بسکون دوم ہے۔ بعض لوگوں کی زبان پر یہ بفتح اول ہے۔ یہ تلفظ (عین بالفتح) غلط تو ہے لیکن ہے اتنا پرانا کہ ''غیاث''، ''آنند راج''، اور ''نور'' نے بطور خاص لکھا ہے کہ بالفتح غلط ہے۔ ان دنوں اردو میں بہر حال یہ بہت کم سننے میں آتا ہے، لہٰذا اسے غلط قرار دینا اور ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

عقاب اول مضموم، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

عقلیت بمعنی ''عقل پرستی، عقیدے یا جذبے کے بجائے عقل کو رہنما بنانا''۔ ان معنی میں یہ لفظ عربی فارسی میں نہیں ہے، اردو والوں نے ''عقلی'' سے بطرز عربی بنا لیا ہے۔ اردو میں اس کا تلفظ حرف چہارم کی تشدید کے ساتھ، یعنی بروزن مفعولن کبھی کبھی سننے میں آتا ہے۔ لیکن عموماً اسے بتخفیف یائے معروف، یعنی بروزن فاعلن بولا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس لفظ کو صرف بروزن مفعولن ہی بولنا چاہئے۔ شان الحق حقی نے یہی لکھا ہے، لیکن مجھے دہلی میں بھی یہ لفظ بروزن فاعلن ہی سنائی دیا ہے۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ چونکہ عربی میں ''عقلیہ'' بتشدید یائے معروف ہے، اس لئے اردو میں ''عقلیت'' کو بھی بتشدید یائے معروف بولنا چاہئے۔ عربی میں ''عقلیہ'' تانیث ہے ''عقلی'' کی، اس سے ''عقل پرستی'' کے معنی مستفاد نہیں ہوتے۔ عربی لفظ ''عقلیہ'' لفظ کا آخری حرف تائے تانیث ہے، لاحقۂ کیفیت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اردو میں بیش از بیش لوگ اب ''عقلیت'' بروزن فاعلن بولتے ہیں اور اسی کو درست، یا کم از کم مرجح

ماننا چاہئے۔

علالت ''علیل ہونا'' ''یا بیماری'' کے معنی میں یہ لفظ نہ فارسی میں ہے نہ عربی میں۔ لیکن اردو میں یہ فصیح ونظیف ہے۔ بس یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اسے عربی/ فارسی نہ قرار دیں، جیسا کہ اکثر اردو لغات میں وارد ہوا ہے۔

علام مع اول مفتوح یا اول مضموم، دیکھئے، ''علامہ''۔

علامہ عربی میں ''عَلام'' مع اول مفتوح، ''عُلام'' مع اول مضموم، اور ''عَلامہ'' مع اول مفتوح و تائے وحدت، تینوں الفاظ موجود ہیں، بمعنی ''بہت زیادہ جاننے والا، بہت بڑا عالم''۔ بعض لوگ ''علامہ'' میں تائے تانیث سمجھتے ہیں، لہٰذا ان کی رائے یہ ہے کہ مردوں کو ''علامہ'' نہ کہنا چاہئے۔ اول بات تو یہ کہ یہاں اگر تائے تانیث ہے تو عربی میں ہوگی، اردو کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''علامہ'' میں تائے تانیث نہیں، بلکہ تائے وحدت ہے۔ ''علام'' صیغۂ مبالغہ ہے، یعنی ''بہت عالم''، اور ''عالم'' کا دوسرا مبالغہ ہے ''عَلامہ'' یا ''عُلام''۔ ''علامہ'' میں چھوٹی ہ تائے وحدت اور مزید علیہ ہے اور معنی میں اضافہ نہیں کرتی۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''علام'' چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس لئے انسان پر اس کا اطلاق درست نہیں، لہٰذا کسی بہت عالم انسان کو ''علام'' کی جگہ ''علامہ'' کہا جانا چاہئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''علامہ'' کی تائے وحدت پر تائے تانیث کا دھوکا ہوتا ہے، اس لئے ''علامہ'' کہیں نہ ''علام''، بلکہ ''علامی'' کہیں۔ یہ سب فضول کی موشگافیاں ہیں اور ''عَلامی'' بروزن فعولن الگ ہی لفظ ہے، یہ ''عالم'' کا مبالغہ نہیں۔ ''علامہ'' ہر سہ زبانوں (فارسی، عربی، اردو) میں موجود ہے، بمعنی ''بہت عالم شخص''۔ اس میں مذکر مونث کی قید نہیں، یہ عورت مرد دونوں کے لئے آتا ہے۔ احتیاط صرف اتنی ضروری ہے کہ اللہ کو ''علامہ'' کے خطاب سے نہیں یاد کرتے، صرف ''علام'' کہتے ہیں۔ مثلاً اللہ کا ذکر یوں کرنے میں کوئی قباحت نہیں: ''اللہ تو علام ہے، وہ سب عالموں سے بڑھ کر ہے''۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ''علام'' ضرور ہے، لیکن عام طور پر اسے تنہا نہیں بولتے، صرف ''علام الغیوب'' لاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ''بڑے عالم'' کے مفہوم میں، مرد عورت دونوں کے لئے ''عَلام، عُلام/ علامہ'' (بہ تشدید لام) کہنا بالکل صحیح ہے۔ بعض لغات میں ''علامہ/ علامی'' کی جنس

مذکر/مونث بتائی گئی ہے۔ یہ محض تکلف ہے۔ ''گرم، سرد، تیز، عالم، فاضل'' وغیرہ کی طرح ''علامہ/علام/غلام'' دونوں صنفوں کے لئے یکساں بولے جاتے ہیں، ان کی کوئی جنس نہیں۔ کبھی کبھی طنزاً کسی عورت کے لئے یوں بھی کہہ دیتے ہیں: ''وہ خود کو بڑی علامہ سمجھتی ہے۔'' عربی میں ''عُلامی'' بروزن فعولن مع اول مضموم ''تیز فہم، سبک روح'' کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ لفظ اردو فارسی میں رائج نہیں۔

علامی دیکھئے: ''علامہ''۔

علمیت بروزن فاعلن۔ اردو میں اس لفظ کے معنی ہیں ''عالم ہونے کی کیفیت''۔ ڈاکٹر شفیع شیخ فرماتے ہیں اور درست فرماتے ہیں کہ اس لفظ کا عربی میں وجود نہیں۔ لیکن وہ اسے عربی طرز پر ''علمیّت'' مع تحتانی مشدد بروزن مفعولن قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ عربی ہوتا تو بے شک بروزن مفعولن ہوتا۔ اردو کا مزاج تشدید سے زیادہ تسہیل کی طرف مائل ہے۔ لہٰذا اس لفظ کو بہ تسہیل تحتانی، اور بروزن فاعلن ہی لکھنا بولنا درست ہے اور یہی رائج بھی ہے۔ برسبیل تذکرہ، یہ لفظ فارسی میں بھی نہیں ہے۔ فارسی میں ''علمیہ'' ہے، بمعنی ''متعلق بہ علم یا علوم''۔ اردو میں بھی یہ لفظ انھیں معنی میں رائج ہے۔

علمیہ دیکھئے: ''علمیت''۔

علومیہ بمعنی ''علم کی کوئی شاخ، مثلاً تاریخی لسانیات، ارتقائی حیاتیات'' یعنی Discipline کے معنی میں یہ لفظ اچھا ہے اور رائج ہو جائے خوب تر ہے۔

عمل جراحی دیکھئے: ''عملیہ''۔

عملیہ انگریزی لفظ Operation بمعنی ''عمل جراحی'' کے لئے پہلے ''عملیہ'' اور پھر ''عمل جراحی'' بنایا گیا۔ ''عملیہ'' تو اب بالکل نہیں ملتا، لیکن تحریری اردو میں ''عمل جراحی'' اب بھی مل جاتا ہے اور میں بھی اسے ہی مرجح سمجھتا ہوں۔ اور فوجی اصطلاح Operation کے لئے تو ''عملیہ'' بہترین لفظ ہے، کم سے کم تحریر کی حد تک۔

عندلیب اول سوم مفتوح، یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ عبدالرشید نے لکھا ہے کہ بعض اساتذہ مثلاً آتش اور اسیر کے یہاں یہ مذکر بھی دیکھا گیا ہے۔ ''معین الشعرا''

نے اسے مختلف فیہ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کل اسے سب مونث ہی بولتے ہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

عنقا ایک خیالی پرند۔ اول مفتوح، عربی میں مع ہمزہ ہے، لیکن فارسی اردو میں بے ہمزہ رائج ہے۔ بعض لوگ اول مضموم بولتے ہیں جو غلط ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ عنقا اور ہما میں فرق یہ ہے کہ ہما کو محض چڑیا فرض کرتے ہیں، لیکن عنقا کے ایک معنی ہیولائے روح انسانی، اور عقل فعال بھی ہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

عورات اول مفتوح، ''عورت'' کی جمع اردو والوں نے بنالی ہے۔ فارسی عربی میں اس کا وجود نہیں لیکن اردو میں بالکل صحیح ہے، اگرچہ اب کم مستعمل ہے۔

عیارہ دیکھئے، ''آوازہ''۔

عیدالاضحیٰ دیکھئے ''عیدالضحیٰ''۔

عیدالضحیٰ ''عیدالاضحیٰ'' یا ''بقرعید'' کے معنی میں یہ لفظ ایک زمانے میں تحریر میں مستعمل ہو گیا تھا۔ ''ضحیٰ'' کے معنی ''سورج، دھوپ، سورج کی کرن'' وغیرہ ہیں۔ ایک خاص حالت میں یہ لفظ ''قربانی'' کے معنی بھی دیتا ہے، لیکن عمومی طور پر ''ضحیٰ'' بمعنی ''قربانی'' درست نہیں۔ ''قربانی، یا قربانی کا جانور'' کے معنی میں ''اضحیٰ'' ہے۔ لہٰذا ''بقرعید'' کا عربی نام ''عیدالاضحیٰ'' ہے، ''عیدالضحیٰ'' نہیں۔ چونکہ ''عیدالضحیٰ'' بول چال میں تقریباً بالکل ہی نہیں ہے، صرف تحریری لفظ ہے، اور وہ بھی شاذ، لہٰذا اسے آسانی سے ترک، اور ''عیدالاضحیٰ'' کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔

عیسائی بمعنی ''دین عیسوی کا ماننے والا''، دیکھئے، ''الف''۔

عیسیٰ اصل میں یہ لفظ مع الف مقصورہ ہے، ''عیسیٰ''، لیکن شعر میں اسے ''عیسی'' بروزن ''عیسی'' بھی استعمال کرتے ہیں، خاص کر جب یہ مرکب آئے، مثلاً ''عیسیِ دوراں''۔ ایسی صورت میں اسے ''عیسی'' ہی لکھنا چاہئے اور الف مقصورہ نہ لگانا چاہئے۔ یہی صورت ''موسیٰ'' کی ہے۔ ''موسیِ عمراں'' میں الف مقصورہ لکھنا یا بولنا غلط ہے۔ غالب کی مشہور غزل ''دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا'' میں قوافی ''تسلی، معنی، راضی'' وغیرہ ہیں۔ لہٰذا مصرع ''یہ زمرد بھی حریف دم عیسی نہ ہوا'' میں ''عیسی'' بروزن ''عیسی'' ہی پڑھیں گے۔

غالیچہ چھوٹے قالین کے معنی میں یہ لفظ ''قالین'' کی مبدل صورت ''قالی'' کے آخر میں علامت تصغیر ''چہ'' لگا کر بنایا گیا ہے۔ ایران کے بعض لہجوں میں قاف کو غین سے بدل لیتے ہیں، مثلاً ''آقا/آغا'' لہٰذا ''قالین'' سے ''قالی'' بنا اور پھر ''غالی''، اور غالی کی تصغیر ''غالیچہ'' بنی۔

غرضیکہ پہلے زمانے میں ''غرض کہ'' کے بجائے ''غرضیکہ'' کہنے کا تھوڑا بہت رواج تھا، خاص کر جب کوئی بات ایسی کہنی ہو جو عام سے ذرا ہٹی ہوئی ہو، یا بات پر کچھ زیادہ زور دینا مقصود ہو۔ مثلاً:

انھوں نے طب، فلسفہ، نجوم، ریاضی، غرضیکہ سارے ہی معقولات میں کمال حاصل کیا۔

لیکن اب تو ''غرض کہ'' بھی بہت کم لکھا یا بولا جاتا ہے اور ''غرضیکہ'' بہت شاذ ہو گیا ہے۔ اس سے پرہیز بہتر ہے۔

غرقہ اول مفتوح۔ اس لفظ میں ہائے ہوز مصدری ہے۔ لیکن اردو کی حد تک ''غرق'' اور ''غرقہ'' کے معنی ایک ہیں۔ غالب ؎

جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے سر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب

غزال اول مفتوح، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

غزالہ اول مفتوح، مونث، یہاں ہائے ہوز اصلی ہے۔ عربی میں ''غزال'' اور ''غزالہ'' کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اردو میں ''غزالہ'' صرف لڑکیوں کے نام کے طور پر مستعمل ہے۔

غش اول مفتوح، دیکھئے، ''غشی''۔

غش آنا بمعنی ''بے ہوشی آنا'' دیکھئے، ''غشی''۔

غش لانا بمعنی ''بے ہوش ہونا''، دیکھئے، ''غشی''۔

غش ہونا بمعنی ''عاشق ہونا''، دیکھئے، ''غشی''۔

غشی بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عربی میں ''غش'' ہے، ''غشی'' نہیں ہے، لہٰذا اردو میں بھی ''غش'' ہونا چاہئے، ''غشی'' غلط ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمیں عربی سے مطلب نہیں، جو اردو میں رائج ہے اردو کے لئے وہی صحیح ہے۔ اردو میں ''غش آنا'' اور ''غشی آنا/ طاری ہونا'' دونوں

مستعمل ہیں، اور دونوں کے معنی قریب قریب یکساں ہیں، یعنی ''بے ہوش ہونا/ بے ہوش آنا، بے ہوشی پیدا ہونا۔'' انھیں معنی میں ''غش کھانا/ لانا'' اور اس طرح کے کئی محاوراتی فقرے ہیں۔ لیکن ''غش ہونا'' بمعنی ''کسی پر عاشق ہونا، کسی پر شیدا ہونا'' بھی مستعمل ہے۔ میر ؎

ہمیں غش آ گیا تھا وہ بدن دیکھ بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے

کیا ہو سکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ اس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

(مصطفیٰ خاں شیفتہ)

بے سبب تو نے سنبھالا نہیں ہاتھوں سے اسے غش ہے عارض کی صفائی پہ مقرر سہرا

(اکبر الہ آبادی)

شبلی نعمانی، فقرہ: ان پر غش طاری تھی۔

نذیر احمد، فقرہ: موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔

محفل سے اٹھانے کا جب قصد کیا اس نے دانستہ میں غش لایا تو دیر اسے کہتے ہیں

(ناسخ)

غلطی

عام خیال یہ ہے کہ یہ لفظ فارسی میں نہیں ہے، اردو میں مہند بالعربی ہے۔ اور اسی بنا پر غالب پر اعتراض کیا گیا کہ انھوں نے ''غلطی'' کی جمع ''غلطیہا'' بنائی اور پھر اسے فارسی کے طور پر مضاف بھی کر دیا۔ غالب ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ''غلطی'' کا لفظ جدید فارسی میں موجود ہے، اور پرانی فارسی میں بھی تھا، اگرچہ ثقہ لوگ اس کا استعمال نہ کرتے تھے۔ ''غیاث اللغات'' نے اسے فارسی مانا ہے مگر لکھا ہے کہ اسے ناواقف لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ ''نور اللغات'' میں بھی کم و بیش یہی ہے اور پھر غالب کا منقولہ بالا شعر درج کر کے صاحب ''نور'' نے لکھا ہے کہ غالب یہاں مستند نہیں۔ غالب مستند ہوں نہ ہوں، لیکن لفظ ''غلطی'' فارسی میں ہے، چاہے ''نیچی'' فارسی (Low Persian) میں ہو، لہٰذا اسے فارسی قاعدے سے مضاف کر سکتے ہیں۔ دوسری، اور بنیادی بات یہ ہے کہ اگر ''غلطی'' دیسی ہی لفظ ہے، فارسی نہیں ہے، تو بھی اسے فارسی/ عربی لفظ کے ساتھ مرکب کرنے میں کوئی ہرج

نہیں۔ پہلے زمانے میں اس کا رواج تھا اور اسے ترک کر کے ہم نے اپنی زبان کی ایک بڑی قوت کو کم کر دیا ہے۔

غلیواز اول مفتوح، یائے معروف، بمعنی ''چیل'' یا ''گدھ''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ پلیٹس نے اسے مذکر مونث دونوں لکھا ہے، لیکن یہ قول معتبر نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

غیر زبانوں کے الفاظ غیر زبانوں کے جو لفظ کسی زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں انھیں ''دخیل'' کہا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ صرف اور نحو کے اعتبار سے دخیل لفظ اور غیر دخیل لفظ میں کوئی فرق نہیں۔ جب کوئی لفظ ہماری زبان میں آ گیا تو وہ ہمارا ہو گیا اور ہم اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھیں گے جو اپنی زبان کے اصلی لفظوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں، یعنی اسے اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق اپنے رنگ میں ڈھال لیں گے اور اس پر اپنے قواعد جاری کریں گے۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی دخیل لفظ کے معنی، تلفظ، جنس، یا املا ہماری زبان میں وہ نہ ہوں جو اس زبان میں تھے جہاں سے وہ ہماری زبان میں آیا ہے۔ اردو میں عملاً اس اصول کی پابندی تقریباً ہمیشہ ہوئی ہے۔ لیکن شاعری میں اکثر اس اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ صرف و نحو کی کتابوں میں بھی بعض اوقات اس اصول کے خلاف قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط اور افسوسناک ہیں۔ نحوی کا کام یہ ہے کہ وہ رواج عام کی روشنی میں قاعدے مستنبط کرے، نہ کہ رواج عام پر اپنی ترجیحات جاری کرنا چاہے۔ شاعر کا منصب یہ ہے کہ وہ حتی الامکان رواج عام کی پابندی کرتے ہوئے زبان کی توسیع کرے، اس میں لچک پیدا کرے، نہ کہ وہ رواج عام کے خلاف جا کر خود کو غلط یا غیر ضروری اصولوں اور قاعدوں کا پابند بنائے۔

اردو میں دخیل الفاظ بہت ہیں اور دخیل الفاظ کے ذخیرے سے بھی بہت بڑا ذخیرہ ایسے الفاظ کا ہے جو دخیل الفاظ پر تصرف کے ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ یہ تصرف کئی طرح کا ہو سکتا ہے۔

(۱) غیر زبان کے لفظ پر کسی اور زبان کے قاعدے سے تصرف کر کے نیا لفظ بنانا۔ اس کی بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

فارسی لفظ ''رنگ'' پر عربی کی تائے صفت لگا کر ''رنگت'' بنا لیا گیا۔

فارسی ''نازک'' پر عربی قاعدے سے تاے مصدری لگا کر ''نزاکت'' بنا لیا گیا۔

عربی لفظ ''طرف'' پر فارسی کی علامت فاعلی لگا کر ''طرفی'' بنایا گیا۔

فارسی لفظ ''دہ/دیہہ'' پر عربی علامت جمع لگا کر ''دیہات'' بنایا اور اسے واحد قرار دیا۔

عربی لفظ ''شان'' کے معنی بدل کر اس پر فارسی کا لاحقۂ کیفیت لگایا اور ''شاندار'' بنالیا۔

عربی لفظ ''نقش'' پر خلاف قاعدہ تاے وحدت لگا کر ''نقشہ'' بنایا، اس کے معنی بدل دیے، اور اس پر فارسی لاحقے لگا کر ''نقشہ کش/نقش کشی؛ نقشہ نویس/نقشہ نویسی؛ نقشہ باز'' وغیرہ بنالئے۔

عربی لفظ ''تابع'' پر فارسی لاحقہ ''دار'' لگالیا اور لطف یہ ہے کہ معنی اب بھی وہی رکھے، کیونکہ ''تابع'' اور ''تابع دار'' ہم معنی ہیں۔

(۲) غیر زبان کے لفظ پر اپنی زبان کے قاعدے سے تصرف کرنا۔ اس کی بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

عربی ''صد'' پر اپنا لفظ ''چو'' بمعنی ''چار'' اضافہ کیا پھر اس پر یاے نسبتی لگا کر ''چودھری'' بنالیا۔

عربی لفظ ''جعل'' کے معنی تھوڑا بدل کے اس پر اردو کی علامت فاعلی لگا کر ''جعلیا'' بنایا گیا۔ فارسی کی علامت فاعلی لگا کر ''جعل ساز'' بھی بنالیا گیا۔

عربی لفظ ''دواء'' کو ''دوائی'' میں تبدیل کر کے اس کی جمع اردو قاعدے سے ''دوائیاں'' کی۔

فارسی لفظ ''شرم'' پر اپنا لاحقۂ صفت بڑھا کر ''شرمیلا'' بنالیا۔

فارسی لفظ ''بازار'' پر اردو لفظ ''بھاؤ'' لگا کر اردو قاعدے کی اضافت بنائی گئی: ''بازار بھاؤ''۔

(۳) اپنی زبان کے لفظ پر غیر زبان کا قاعدہ جاری کر کے نیا لفظ بنا لینا۔ بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

''اپنا'' میں عربی کی تائے مصدری اور اس پر ہمزہ لگا کر ''اپنائیت'' بنایا گیا۔ لکھنؤ میں ''اپنایت'' بولتے تھے، لیکن بعد میں وہاں بھی ''اپنائیت'' رائج ہو گیا۔ ''آصفیہ'' میں ''اپنائیت'' ہی درج ہے۔

اردو کے لفظ پر ''دار'' کا فارسی لاحقہ لگا کر متعدد لفظ بنائے گئے: ''سمجھ دار؛ چوکیدار؛ پہرے دار''؛ وغیرہ۔

اردو کے لفظ پر ''دان'' کا لاحقہ لگا کر بہت سے لفظ بنا لئے گئے، جیسے: ''اگر دان''؛ ''پیک دان''؛ ''پاندان''، وغیرہ۔

(۴) غیر زبان کے لفظ سے اپنے لفظ وضع کر لینا۔ بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

مصدر: ''گرم'' سے ''گرمانا''؛ ''شرم'' سے ''شرمانا''؛ وغیرہ۔

اسم: ''نالہ'' سے ''نالش''؛ ''چشم'' سے ''چشمہ'' [بمعنی ''عینک'']۔

صفت: ''خاک'' سے ''خاکی'' [رنگ، انگریزی میں Khaki، تلفظ ''کھیکی'']۔

(۵) غیر زبان کے طرز پر نئے لفظ بنا لینا۔ مثلاً حسب ذیل لفظ فارسی/عربی میں نہیں ہیں، اردو والوں نے وضع کئے ہیں:

بکر قصاب؛ دل لگی؛ دیدہ دلیل؛ ظریف الطبع؛ قابو پرست؛ قصائی؛ ہرجانہ؛ یگانگت؛ وغیرہ۔

(۶) اپنا اور غیر زبان کا لفظ ملا کر، یا غیر زبان کے دو لفظ ملا کر اپنا لفظ بنا لینا، مثلاً:

آنسو گیس (اردو، انگریزی)؛ جھنڈے بازار؛ (اردو، فارسی) خچر یاتری (اردو، انگریزی)؛ خود غرض (فارسی عربی)؛ گربہ قدم (فارسی، عربی)؛ وغیرہ۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، دخیل الفاظ، چاہے وہ براہ راست دخیل ہوئے ہوں یا ان کے زیر اثر مزید لفظ بنے ہوں، سب ہمارے لئے محترم ہیں۔ کسی دخیل لفظ، کلمے یا ترکیب کو، یا اس کے رائج تلفظ یا املا کو یہ کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ جس زبان سے یہ لیا گیا ہے وہاں ایسا

نہیں ہے۔ جب کوئی لفظ ہماری زبان میں آگیا تو اس کے غلط یا درست ہونے کا معیار ہماری زبان، اس کے قاعدے، اور اس کا روزمرہ ہوں گے، نہ کہ کسی غیر زبان کے۔

ہمارے یہاں یہ طریقہ عام ہے کہ کسی لفظ یا ترکیب یا اس کے معنی کے لئے فارسی سے سند لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ فارسی میں ایسا ہے اس لئے اردو میں بھی ٹھیک ہے۔ یہ طریقہ صرف اس حد تک درست ہے جب تک فارسی کی سند ہمارے روزمرہ یا ہمارے رواج عام کے خلاف نہ پڑتی ہو۔ ''فارسی میں صحیح ہے، اس لئے اردو میں صحیح ہے''، یہ اصول بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ اصول کہ ''فارسی [یا عربی] میں غلط ہے، اس لئے اردو میں بھی غلط ہے۔'' مثال کے طور پر، ''مضبوط'' کو جدید فارسی میں ''مخزون'' کے معنی میں بولتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ مثلاً: ''یہ کتاب نیشنل لائبریری میں مخزون ہے۔'' یہاں فارسی والا ''مضبوط'' کہے گا۔ ظاہر ہے کہ فارسی کی یہ سند اردو کے لئے بے معنی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ اردو نے فارسی/عربی سے بے شمار الفاظ، محاورات، اور تراکیب حاصل کئے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر اردو میں کسی عربی/فارسی لفظ کے بارے میں کوئی بحث ہو تو ہم عربی/فارسی کی سند لا کر جھگڑا فیصل کر لیں۔ لیکن شرط یہی ہوگی کہ عربی/فارسی کی سند ہمارے رواج عام یا روزمرہ کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً لفظ ''کتاب'' کی جنس کے بارے میں اختلاف ہو تو یہ سند فضول ہوگی کہ عربی میں ''کتاب'' مذکر ہے، لہٰذا اردو میں بھی یہ لفظ مذکر ہوگا/ہونا چاہئے۔ اسی طرح، اگر یہ سوال اٹھے کہ ''طشت از بام ہونا'' صحیح ہے کہ نہیں، تو یہ استدلال فضول ہوگا کہ فارسی میں ''طشت از بام افتادن'' ہے، لہٰذا اردو میں بھی ''طشت از بام گر پڑنا'' ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے یہاں یوں بولتے ہیں: ''سارا معاملہ طشت از بام ہوگیا''، جب کہ فارسی میں یہ محاورہ ''طشت'' کے حوالے سے بولتے ہیں، یعنی یوں کہتے ہیں: ''طشت او از بام افتاد۔'' ظاہر ہے کہ یہ ضد کرنا بھی غلط ہے کہ اردو میں بھی یوں ہی بولنا چاہئے۔ یا مثلاً اردو میں ''لطیفہ'' کے عام معنی ہیں: ''کوئی خندہ آور چھوٹی سی کہانی یا چٹکلا۔'' یہ معنی نہ فارسی میں ہیں نہ عربی میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اردو میں رائج معنی کو اس بنا پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ''لطیفہ'' کو اردو میں ''سخن خوب و نیکو'' یا ''اچھی چیز، اچھائی'' کے معنی میں استعمال کرے اور کہے کہ (مثلاً) ''مقدمہ شعرو

شاعری لطیفوں [یا لطائف] سے بھری ہوئی ہے'' درست استعمال ہے کیوں کہ فارسی میں ''لطیفہ'' بمعنی ''سخن خوب'' اور عربی میں بمعنی ''اچھی چیز'' وغیرہ ہے، تو اس کی بات قطعی غلط قرار دی جائے گی۔

لہٰذا بنیادی بات یہی ہے کہ جو استعمال، لفظ، ترکیب، کلمہ، اردو کے قاعدے یا رواج کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو پر غیر زبانوں، خاص کر عربی/فارسی کے قاعدے جاری کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کو جتنا دھیما کیا جائے، اچھا ہے۔

فاختہ یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ عربی میں سوم مکسور بروزن ''شاعرہ'' ہے، لیکن اردو میں سوم ساکن ہی بولتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس کی جمع ''فاختے/فاختیں'' نہیں، بلکہ ''فاختائیں/فاختاؤں'' ہے۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

فاعل اور فعل کا توافق اگر فاعل اور اس کا فعل ایک دوسرے سے دور جا پڑیں تو پرانے لوگ فعل کا توافق اصل فاعل سے کرنے کے بجائے فعل کے نزدیک ترین اسم سے روا رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر میر (۱) اور ذوق (۲) ـــ

یوں گئی قد کے خم ہوئے جیسے عمر اک رہرو سر پل تھا

دریائے غم سے میرے اترنے کے واسطے تیغ خمیدہ یار کی لوہے کا پل ہوا

ان دونوں اشعار میں ''عمر'' اور ''تیغ'' کی مناسبت سے آخری فعل ''تھا''/''ہوئی'' درکار تھا، لیکن فاعل کے بہت دور پڑ جانے کے باعث میر اور ذوق نے فعل کے قریب ترین اسم ہی کو فاعل فرض کر لیا۔ آج کل اس عدم توافق کو غلط قرار دیں گے۔ میر اور ذوق کے لئے ٹھیک تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایک سے زیادہ فاعل ہوں اور ان میں مذکر مونث دونوں ہوں تو فعل اور ضمیر کی جنس کیا ہوگی؟ یہاں عام قاعدے دو ہیں اور ان میں سے کسی کو حسب ضرورت اختیار کیا جا سکتا ہے:

(۱) فاعلوں کے مجموعے کو ایک مذکر فقرہ مان لیا جائے اور فعل اسی اعتبار سے متعین ہو۔ مثال کے طور پر:

صحیح: ان کے یہاں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔

صحیح: کتاب، رسالہ، قلم، روشنائی، سب بکھر گئے۔

صحیح: آسمان زمین اس کی ثنا کرتے ہیں۔

صحیح: ان کا مطالعہ اور سمجھ دونوں غیر معمولی تھے۔

صحیح: میرا خیال اور عقل تو یہی کہتے ہیں۔

صحیح: دو لڑکیاں اور ایک لڑکا مجھ سے ملنے آئے۔

(۲) فعل کی موافقت اس فاعل سے ٹھہرائی جائے جو آخر میں ہو۔ مثلاً:

صحیح: صرف دو لڑکیاں اور ایک لڑکا مخالف تھا۔

صحیح: ایک کتا اور ایک کتیا جھپٹ پڑی۔

صحیح: فٹ پاتھ، سڑکیں، سب کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔

صحیح: میری کتاب اور قلم چوری ہو گیا۔

صحیح: پتیاں اور پودے مرجھا گئے۔

صحیح: ان کے یہاں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

یہ ضروری نہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی قاعدہ اختیار کیا جائے۔ ذوق، اسلوبیاتی ضرورت، اور خوش آہنگی کو پیش نظر رکھیں اور جس جگہ جو قاعدہ اچھا لگے اس پر عمل کریں۔ مثال کے طور پر، حسب ذیل جملہ ہی بہتر ہے:

صحیح: کتاب، رسالہ، قلم، روشنائی، سب بکھر گئے۔

اگر یوں کہا جائے:

کتاب، رسالہ، قلم، روشنائی، سب بکھر گئی/بکھر گئیں۔

تو خلاف محاورہ محسوس ہوگا۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ "دونوں/تینوں/سب/سب کے سب/تمام/تمام کے تمام" وغیرہ فقرے عموماً مذکر قرار دیے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر مخلوط فاعلوں کے ساتھ متذکرہ بالا کوئی کلمہ ہو تو مخلوط فاعل کو مذکر لکھنا بہتر ہوگا۔ مثال کے طور پر:

صحیح: گھڑیال، شیر، بلی، سب گوشت کھاتے ہیں۔
صحیح: پھول، پتی، درخت، گھاس، پودا، کلی، سب کے سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔
صحیح: رمیش اور بملا دونوں دوڑے۔
صحیح: اشوک، سروجنی، کلثوم، زہرا، چاروں آئے تھے۔

فراسیس اول مفتوح، یائے معروف۔ دیکھیے "فرانسیسی"۔

فرانس دیکھیے "فرانسیسی"۔

فرانسیسی اول مفتوح، نون معلن، یائے معروف، بمعنی "فرانس سے متعلق"، مثلاً "فرانسیسی زبان، فرانسیسی قوم،" وغیرہ۔ شروع میں یہ لفظ "فراسیس" تھا، یعنی اس میں یائے نسبتی نہیں تھی اور خود اسی کے معنی وہی تھے جو آج "فرانسیسی" کے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی لفظ Francais سے بنا ہے۔ اصل زبان میں اس کا تلفظ "فراں سے" ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں نے یا تو اسے نون غنہ کے بغیر، اور یائے معروف سے سنا (جو کچھ بعید نہیں)، یا اسے فارسی رسم الخط میں لکھا دیکھا اور بے نون غنہ لیکن مع یائے معروف فرض کیا۔ مغل بادشاہوں، خاص کر شاہجہاں کی فوج میں فرنگیوں کی بھی ایک پلٹن ہوتی تھی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اس پلٹن کا کمیدان ایک فرانسیسی تھا جس کا نام (یا خطاب) فراسیس خان تھا۔ انشا نے "فراسیس" بمعنی "فرانس کا باشندہ" مع یائے معروف لکھا ہے۔

پگڑی تو نہیں ہے یہ فراسیس کی ٹوپی یاں وقت سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی

اغلب ہے کہ بعد میں اصل لفظ کا نون غنہ ہمارے لفظ میں شامل ہو گیا۔ اور جب ملک کا نام (فرانس) ہمارے یہاں زبانوں پر رواں ہوا تو "فرانس" مع نون معلن کو اصل لغت اور "فرانسیسی" کو فرض کر لیا گیا کہ اس میں یائے نسبتی ہے۔ یہ بات نظر انداز کر دی گئی کہ "فرانسیسی" میں یائے نسبتی ہے تو اصل لفظ "فرانس" نہیں بلکہ "فرانسیس" ہوگا۔ لیکن نئے لفظ یوں ہی بنتے ہیں۔ لفظ "فرانسیس" بھی بہت دن مستعمل رہا، لیکن بہت کم۔ شیکسپیئر میں "فرانسیس" یا "فرانسیسی" نہیں ہے، صرف "فراسیس" ہے۔ فیلن نے "فراسیس" درج کیا ہے لیکن اس کا ایک تلفظ "فرانسیس" بھی بتایا ہے۔ گویا فیلن کے لغت کی تالیف کے وقت (۱۸۷۹) تک

''فرانسیس'' رائج ہونے لگا تھا۔ پلیٹس نے ''فراسیس/فراسیسی'' کو اصل لفظ کے طور پر داخل کیا ہے اور ''فرانسیسی'' کو ان کی محرف شکل کے طور پر۔ اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' میں ''فرانسیس'' مع نون غنہ ہے، لیکن وہاں یہ واضح نہیں کہ بمعنی ''فرانس'' ہے، یا بمعنی ''فرانسیسی'' ؎

چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب　　جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

''فرانسہ'' اور ''فرنسہ'' بھی بمعنی ''فرانس'' مستعمل رہے، لیکن بہت شاذ۔ اول الذکر کا اندراج ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ہے، لیکن ''فرنسہ'' اس میں بھی نہیں۔ ''فراسیس'' تو پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا، بالآخر ''فرانس'' اور ''فرانسیسی'' ہی رائج رہ گئے۔

فرزی　　شطرنج کا سب سے طاقتور مہرہ اردو فارسی میں ''وزیر''، ''فرزیں'' یا ''فرزی''، اور انگریزی میں Queen کہلاتا ہے۔ یعنی ''فرزیں'' کی ایک شکل ''فرزی'' بھی ہے۔ یہ لفظ اردو میں بہت کم مستعمل ہے، لیکن بالکل ناپید نہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اس کے استعمال کی دو مثالیں درج ہیں۔ شیخ علی محمد جیو گام دھنی کی ''جواہر اسرار اللہ'' (۱۵۶۵) کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ہوش فرزی اچپں آیا　　مہرے ہو کر ہمیں بھرایا

شیکسپیئر اور پلیٹس کے یہاں ''فرزی'' اور ''فرزیں'' دونوں ہیں، لیکن ''آصفیہ'' اور ''نور اللغات'' میں ''فرزی'' کا پتہ نہیں۔ ''فرہنگ آنندراج''، ''برہان قاطع''، اور ''غیاث اللغات'' میں ''فرز'' بکسر اول بھی ''فرزی/فرزیں'' کے معنی میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن ''غیاث'' کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کوئی مہرہ تھا جو شاید اب مستعمل نہیں۔ ''موید الفضلا'' اور ''برہان'' میں ''فرزان'' بکسر اول بھی فرزیں کے معنی میں ملتا ہے۔

فرس　　اول دوم مفتوح، بمعنی ''گھوڑا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ اول مضموم اور سکون دوم سے جو لفظ بنتا ہے (فُرس، بروزن قُرص) اس کے معنی ہیں: ''ایران، ایرانی لوگ''۔

فرض بنتا　　''فرض سمجھنا'' کے معنی میں ''فرض بنتا'' پنجابی میں ہے۔ اردو میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

غلط اور نامناسب: میرا فرض بنتا ہے کہ آپ کی مشکل میں آپ کے کام آؤں۔

صحیح اور مناسب: میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی مشکل میں آپ کے کام آؤں۔
صحیح اور مناسب: میرا فرض ہے کہ آپ کی مشکل میں آپ کے کام آؤں۔
دیکھیے، ''حق بننا''۔

فرنسہ دیکھیے، ''فرانسیسی''۔

فعل مجہول کا غلط استعمال اردو کے روز مرہ میں فعل مجہول (Passive Voice) بہت ہی کم برتا جاتا ہے۔ انگریزی میں البتہ یہ بہت مقبول ہے، اگرچہ وہاں بھی اس کا استعمال گھٹ رہا ہے۔ ایک مدت ہوئی اردو کے مشہور انگریز پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز (David Matthews) مجھ سے ملنے آئے۔ وہ اردو بہت اچھی بولتے ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا: ''اردو لاکھوں آدمیوں سے بولی جاتی ہے۔'' ظاہر ہے کہ یہ انگریزی کے جملے کا براہ راست ترجمہ تھا: Urdu is spoken by millions of people۔ فعل مجہول کو نہ جانے کیوں ہندی والوں نے فروغ دینا شروع کر دیا، اور اب ہم لوگ بھی اسے لکھنے بولنے لگے ہیں۔

غلط اور قبیح: دہشت پسندوں کے ذریعہ مارے گئے لوگ۔۔۔
غور کیجیے کس قدر بھاری اور غیر اردو عبارت ہے۔ کہنا چاہیے تھا:
صحیح اور فصیح: جن لوگوں کو دہشت پسندوں نے مار ڈالا/موت کے گھاٹ اتارا/ جو لوگ دہشت پسندوں کے ہاتھوں قتل/شہید ہوئے۔

ایک جگہ میں خطبہ دینے گیا تو میرا تعارف جن پروفیسر صاحب کے ذمہ تھا انھوں نے فرمایا: یہ پہلا لکچر ہے جو فاروقی صاحب کے ذریعہ دیا جا رہا ہے۔

خدارا اردو جیسی خوبصورت زبان کو یوں قتل نہ کیجیے۔ فعل مجہول وہیں لکھیے جہاں کوئی اور راستہ ادائے مطلب کا نہ ہو۔ مزید دیکھیے، ''ہوئے، جا رہے، وغیرہ''۔

فغاں اول مضموم۔ فارسی میں اول مکسور سے بھی بولتے ہیں، لیکن اردو میں مع اول مضموم ہی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ''فغاں'' کو مذکر بھی (یا مذکر ہی) قرار دیتے تھے۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

کیوں کر نہ ہووے گرم فغاں عندلیب کا جلتا ہے گل کی آگ سے جاں عندلیب کا

مندرجۂ ذیل شعر میر عبدالحی تاباں کا ہے ؂

نہیں کوئی دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا
سناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا فغاں اپنا

آتش نے بھی پرانے محاورے کا اتباع کرتے ہوئے ''فغاں'' کو مذکر باندھا ہے ؂

عشق گل میں وہی بلبل کا فغاں ہے کہ جو تھا
پرتو مہ سے وہی حال کتاں ہے کہ جو تھا

خان آرزو نے ''چراغ ہدایت'' میں لکھا ہے کہ ''فغاں'' دراصل ''افغاں'' کا مخفف ہے۔ اس کے برعکس ''آنندراج'' میں ''فغاں'' کو اصل لفظ اور ''افغاں'' کو مزید علیہ بتایا ہے۔ بہر حال، اردو میں انیسویں صدی تک ''افغاں'' بمعنی ''فغاں'' مستعمل تھا، اور مذکر تھا۔ مومن ؂

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

اس دوغزلے کی دوسری غزل کے مطلع میں بھی ''افغاں'' بندھا ہے، اور مذکر بندھا ہے۔ ''نور اللغات'' نے ''افغاں'' کو مختلف فیہ لکھ کر کہا ہے کہ تانیث مرجح ہے۔ یہ قول غالباً ''امیر اللغات'' کے تتبع میں ہے، کیوں کہ ''امیر اللغات'' میں ''افغاں'' کو مونث لکھا ہے۔ آج کل ''افغاں'' بمعنی ''فغاں'' نہیں بولا جاتا۔ اور اس زمانے میں ''فغاں'' بہر حال مونث ہے لیکن پرانے لوگوں نے جو اسے مذکر لکھا ہے تو یہ ان کے زمانے کے رواج کے عین مطابق تھا، عجز نظم کی بنا پر نہ تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔

فُفرو ہو جانا اول مفتوح، دوم مکسور، سوم مشدد مضموم، واو معروف: ''بھاگ جانا، چمپت ہو جانا'' کے معنی میں یہ دلچسپ لفظ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ زبان اپنے معاملات اپنے ہی طور پر طے کرتی ہے، نحوی اور قواعد نویس کچھ کہیں۔ دراصل یہ لفظ عربی مادہ **فَرّ** کا صیغۂ امر جمع **فَفِرُّوا** (پس تم لوگ فرار ہو جاؤ) کو بگاڑ کر بنایا گیا ہے۔ جناب فیصل احمد بھٹکلی نے مجھے مطلع کیا ہے کہ یہ غالباً قرآن مجید کی آیت **ففروا الی اللہ۔۔۔الآیۃ** سے ماخوذ ہوگا۔ عربی میں ماضی جمع اور امر جمع کے صیغوں میں فعل کے آخر میں اگر واو ہے تو اس کے بعد الف لگاتے ہیں جو پڑھنے میں نہیں آتا۔ اردو نے فعل امر کو اسم قرار دے کر الف غائب کر دیا اور عربی کلمہ ''فـ'' بمعنی ''پس، پر، اس لیے'' کو اسم کا حصہ بنا کر اسم کے آگے ''ہونا / ہو جانا'' لگا کر ایک نیا فعل تیار کر دیا۔ اہل کتب کچھ کہیں، زبان تو من مانی کرتی ہی رہے گی۔ میر امن کی ''گنج خوبی'' میں ہے، اور غالباً انھیں کا

شعر ہے ؎

تیر سنتے ہی فقرہ ہو چلے چھوٹی جب بندوق کوے اڑ گئے

فقرہ اچھالنا اردو میں نہیں ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اس سے احتراز بہتر ہے۔

فقرہ پھینکنا اردو میں نہیں ہے۔ ہندی میں ہو تو ہو۔ اس سے احتراز بہتر ہے۔

فقرہ چست کرنا بمعنی ''کوئی گرم جملہ کہنا''، درست ہے۔

فقرہ کسنا بمعنی آوازہ کسنا''، درست ہے۔

فکّ اضافت ''اضافت'' ہمارے یہاں دو طرح سے ظاہر کی جاتی ہے:

(۱) مضاف اور مضاف الیہ کے بیچ میں زیر لگا کر۔ اسے کسرۂ اضافت کہتے ہیں۔ جیسے، ''کتابِ عشق''؛ ''شہرِ دل''، وغیرہ۔

(۲) مضاف اور مضاف الیہ کے بیچ میں ''کا/کی/کے'' لگا کر۔ اسے علامت اضافت کہتے ہیں۔

(۳) کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ دو لفظوں کے بیچ سے کسرہ، یا علامت اضافت اڑا دیتے ہیں لیکن مفہوم مرکب اضافی ہی کا رہتا ہے۔ اسے فک اضافت کہا جاتا ہے۔

جناب صابر سنبھلی نے لکھا ہے کہ فک اضافت کے قاعدے ہونا چاہئے، تا کہ سب جان سکیں کہ علامت اضافت کا حذف کرنا کہاں درست ہے اور کہاں نادرست۔ مرحوم تارا چرن رستوگی نے فارسی کی کسی گرامر کا ذکر کیا ہے جو انگریزی زبان میں ہے، اور اسٹائنگاس (Steingass) کے لغت کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان دونوں میں فک اضافت کے اصول تفصیل سے مذکور ہیں۔ فارسی گرامر کا نام انھوں نے نہیں بتایا، لہٰذا میں اس کتاب سے استفادہ نہ کر سکا۔ لیکن اسٹائنگاس کا لغت فکِ اضافت کے اصولوں سے مجھے بالکل خالی ملا۔ ''غیاث اللغات'' میں البتہ اضافت پر لمبا سا مقالہ ہے جس کا تقریباً نصف حصہ فکِ اضافت کے بارے میں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صاحب ''غیاث'' کی رائے ''یوں بھی ہے اور دوں بھی'' کی مصداق ہے۔ ایک طرف تو وہ

فکِ اضافت کی کئی مثالیں دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اس سے احتراز واجب ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ "صاحب" اور "سر" کو مرکب کریں تو کسرۂ اضافت حذف کر سکتے ہیں، یعنی "صاحب سر" بے اضافت لکھ سکتے ہیں۔ "آنند راج" نے لکھا ہے کہ یہ لفظ ("صاحب سر") "مقطوع الاضافت" ہے، لیکن اس پر اضافت کبھی کبھی لگا بھی دی جاتی ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ اردو کے دیسی مرکبات میں فکِ علامت اضافت ایک زمانے میں عام تھا۔ "جنگل جلیبی" بمعنی "جنگل کی جلیبی"؛ "بالک ہٹ" بمعنی "بالک کی ہٹ"؛ "ڈاک گھر" بمعنی "ڈاک کا گھر"؛ "چاند گرہن" بمعنی "چاند کا گرہن" وغیرہ۔ اب یہ صرف چند فقروں اور اعلام تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، یعنی اب نئے فقرے ایسے نہیں بنائے جاتے جن کے مضاف اور مضاف الیہ دونوں دیسی ہوں اور جن میں اضافت کی علامت حذف کر دی گئی ہو۔ "راجا بازار" بمعنی "راجا کا بازار"؛ "رانی گنج" بمعنی "رانی کا گنج"؛ "رام نگر" بمعنی "رام کا نگر" وغیرہ جگہوں کے نام پرانے زمانے کی یادگار ہیں۔ لہٰذا دیسی مرکبات میں فکِ اضافت اب صرف سماعی ہے، قیاسی نہیں۔ اس کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے بھی کوئی قاعدہ نہ تھا، اور نہ ہی کسی قاعدے کی ضرورت تھی۔ ایک عام اصول تھا کہ علامت اضافت کا حذف جہاں اچھا لگے یا ضروری معلوم ہو، وہاں اسے حذف کر دیا جائے۔

جہاں تک سوال فارسی مرکبات کا ہے، ان کا بھی اصول یہی ہے کہ کسرۂ اضافت لگانا یا نہ لگانا بولنے والے کی مرضی پر ہے۔ جو مرکبات کسرے کے ساتھ مروج ہو گئے ہیں ان کو بلا کسرہ بولنا خلاف محاورہ ہوگا لیکن غلط نہ ہوگا۔ یعنی کس مرکب کو کسرہ کے ساتھ بولنا ہے، اور کس کو کسرے کے بغیر بولنا مرجح ہوگا، یہ معاملہ پھر سماعی ہے۔ لیکن نحوی اعتبار سے مرکب دونوں طرح صحیح ہوگا، بلا کسرۂ اضافت، یا مع کسرۂ اضافت۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ بعض مرکبات لازماً مقطوع الاضافت ہوں اور بعض مرکبات لازماً مشمول الاضافت۔

اردو کے بعض علما، مثلاً کمال احمد صدیقی کا ارشاد ہے کہ لفظ "صاحب" کے ساتھ کسرہ بالکل نہیں آتا، یا مجبوراً آتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صاحب "غیاث" کے خیال میں فکِ اضافت سے احتراز واجب ہے، لیکن "صاحب" اور "سر" کو اگر مرکب کریں تو کسرۂ اضافت حذف کر

سکتے ہیں، اور" آنندراج" کا قول ہے کہ لفظ" صاحب" پر کسرۂ اضافت نہیں آتا، مگر بہ ندرت۔

اردو اور فارسی کے علما کی یہ تمام باتیں محل نظر ہیں۔ اضافت کے معنی ہیں، دو اسما کو ایک ساتھ جمع کرنا، اس طرح کہ معنی کا ایک نیا پہلو پیدا ہو جائے۔ یہ پہلو بہت انوکھا بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً دو اسما کے درمیان اضافت یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ اول الذکر اور موخر الذکر میں بیٹے باپ کا رشتہ ہے۔ اسے" اضافت ابنی" کہتے ہیں۔ مثلاً" بوعلی سینا" کے معنی ہیں" سینا کا بیٹا بوعلی۔" اور "مسعود سعد سلمان" کے معنی ہیں" سعد کا بیٹا مسعود اور سلمان کا بیٹا سعد"۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کہ معنی کا نیا پہلو مقصود ہے، ان اسما کے مابین کسرہ لگا دیتے ہیں۔ یعنی کسرے کا لگانا ایک نحوی اور بے کیفیت عمل ہے۔ اس کو کسی لفظ سے تخصیص نہیں۔ کوئی بھی دو اسما اس طرح برتے جاسکتے ہیں کہ ان میں مضاف اور مضاف الیہ کا رشتہ پیدا ہو جائے۔ یعنی دو الفاظ اگر مرکب کیے جائیں تو ان کے مابین کسرہ معنی کے پہلو کے لیے علامت کا کام کرتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں یہ علامت بعض الفاظ پر نہ روا رکھی جائے، اور یہ فرض کیا جائے کہ یہاں اس علامت کے بغیر کام چلانا چاہیے۔

علاوہ بریں، جب دو الفاظ کے درمیان کسرہ مقصود ہو، لیکن اسے حذف کر دیا گیا ہو، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں کسرہ تھا ہی نہیں۔ اگر دو لفظوں میں وہ توسیع معنی واقع ہو گئی ہے جو کسرۂ اضافت سے پیدا ہوتی ہے، تو پھر ان دو لفظوں مضاف مضاف الیہ کا رشتہ قائم ہو گیا۔ ایسی صورت میں اگر کسرہ موجود نہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ وہاں کسرہ تھا ہی نہیں۔ دلیل اس کی ایک یہ بھی ہے کہ ایسا مرکب بھی، جو عموماً بے کسرہ لکھا یا بولا جاتا ہے، اسے کسرے کے ساتھ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً" صاحب دل" بالعموم بلا کسرہ (بروزن مفعولن) بولا جاتا ہے، لیکن آرزو لکھنوی کا شعر ہے ؎

کیوں تمنا غیر کی تو پوچھ کر چپ ہو گیا تمھاری محفل میں کوئی صاحب دل اور بھی

ظاہر ہے کہ اگر" صاحب دل" اصلاً یا لازماً بے کسرہ ہوتا تو یہاں مع کسرہ کیوں آتا؟ اسی طرح، بعض لوگ" صاحب کمال" میں بھی کسرے کا وجود نہیں مانتے اور اسے بروزن مفعولن بولنے پر مصر ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ استادوں نے اسے مع کسرہ بھی استعمال کیا ہے۔

مثلاً نسیم دہلوی کا شعر ہے ؎

لاغر وہ تھا کہ چشم جہاں سے نہاں رہا — تھا صاحب کمال نہ پہنچا زوال کو

''صاحب'' کے بعض مرکبات ایسے بھی ہیں جو کم و بیش ہمیشہ مع اضافت بولے جاتے ہیں، مثلاً ''صاحب دیوان''، ''صاحب حال''، اور کچھ ایسے ہیں جو تقریباً ہمیشہ بے اضافت بولے جاتے ہیں، مثلاً ''صاحب فراش''۔ لیکن کوئی اس کے برعکس کرے تو غلط نہ ہوگا، خلاف محاورہ ضرور ہوگا۔

فلاکت زدہ دیکھئے: ''مفلوک الحال''۔

فیل یائے معروف، بمعنی ''ہاتھی''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ ملحوظ رہے کہ اس لفظ کا ہمارے لفظ ''فیل'' [یائے مجہول] سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ''فیل'' بمعنی ''شور غل، جھگڑا، جھنجھٹ، شرارت، ضد'' وغیرہ کے معنی میں ہے اور عموماً ''فیل اٹھانا / مچانا'' کے روپ میں استعمال ہوتا ہے۔ دیکھئے، ''پیل''۔

قاز یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

قاعدۂ ابجد دیکھئے: ''حروف ابجد''۔

قاعدۂ جمل ''جمل'' میں اول مضموم اور دوم مفتوح ہیں۔ دیکھئے: ''حروف ابجد''۔

قالی ''زمی'' اور ''فرزی'' کی طرح ''قالی'' میں بھی نون محذوف ہے، یعنی یہ لفظ ''قالین'' کی ایک شکل ہے۔ غالب ؎

دل بیمار از خود رفتہ تصویر نہالی ہے — کہ مژگاں ریشہ ارنیستان شیر قالی ہے

اردو میں ''قالی'' شاذ ہے، لیکن فارسی میں عام رہا ہوگا۔ غنی کاشمیری کا شعر ہے ؎

فراغت بہ نیستان بور یادارم — مبادا راہ دریں بیشہ شیر قالی را

دیکھئے: ''غالیچہ''۔

قبائے قدکار دیکھئے: ''قدکار''۔

قرضہ یہاں بھی ''موجہ''، ''آوازہ'' وغیرہ کی طرح سے ہائے ہوز زائد ہے۔ فرق صرف یہ

ہے کہ موخر الذکر، دونوں لفظ فارسی میں بھی ہیں جب کہ "قرضہ" اردو والوں کی اختراع ہے۔

قریب المرگ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "مرگ" فارسی لفظ ہے، اس پر عربی کا الف لگا کر "قریب المرگ" بنانا درست نہیں۔ بے شک یہ لفظ عربی نہیں ہے، اگر عربی میں لایا جائے تو صحیح نہ ہوگا۔ لیکن اردو کی حد تک "قریب" اور "مرگ" دونوں اردو کے لفظ ہیں۔ لہٰذا یہاں اردو والے اپنا تصرف کر سکتے ہیں۔ الف لام کے بغیر اور الف لام کے ساتھ عربی فارسی الفاظ کو اردو میں مرکب کرنے کی روایت پرانی ہے۔ مثلاً:

گلبدن، مسیحالب، سیماب صفت، مفلوک الحال، دلاور الدولہ، نمک حرام، جلوہ گاہ، زن جلب، وغیرہ۔

اس طرح "قریب المرگ" میں کوئی عیب نہیں، لیکن "قریب الموت" میں ہے، کیونکہ اگرچہ یہاں دونوں لفظ عربی ہیں، لیکن یہ مرکب اردو کے روزمرہ میں شامل نہیں ہے۔

قریب الموت دیکھئے "قریب المرگ"۔ یہ ترکیب قواعد کے اعتبار سے درست ہے لیکن اردو میں غیر فصیح ہے۔

قریشی "قبیلۂ قریش کا، اہل قریش" کے معنی میں یہ لفظ بہت پرانا ہے۔ عربی والے اعتراض کرتے ہیں کہ عربی میں "قریشی" نہیں ہے، صرف "قرشی" (اول مضموم، دوم مفتوح) ہے، بمعنی "قبیلۂ قریش کا"، اور تمام اہل قریش کے لئے عربی میں صرف "قریش" آتا ہے۔ یہ بات صحیح بھی ہے اور نہیں بھی۔ عربی والوں کا کہنا ہے کہ "قریشی" غلط ہے کیونکہ عربی میں نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو میں یہی درست ہے، عربی فارسی میں کچھ بھی ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ "غیاث" جیسے محتاط لغت میں لکھا ہے کہ "قرشی" اور "قریشی" دونوں صحیح ہیں۔ "دہخدا" نے "قریشی" اور "قرشیہ" کا الگ الگ اندراج کیا ہے، بمعنی "منسوب بہ قریش"۔ ایسی صورت مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ عربی میں صرف "قرشی" ہوگا، لیکن فارسی اور اردو میں "قریشی" بھی ہے اور "قریش" بھی۔

قلمکار اس لفظ کے کئی معنی ہیں۔ شروع شروع میں یہ "نقاش، مصور" کے معنی میں تھا۔ پھر اسے ایسے کپڑے یا لباس کے لئے کہنے لگے جس پر نقش و نگار بنے ہوں۔ پھر اس کے معنی "لکھنے کا کام

کرنے والا، یعنی منشی، مصنف وغیرہ ہو گئے۔'' آج کل یہی آخر الذکر معنی رائج ہیں۔ بعض لوگ ایک فرانسیسی اصطلاح یا لفظ Ecrivant کا ترجمہ ''لکھاری'' کرتے ہیں جو خاصا بد صورت اور بد آہنگ لفظ ہے۔ لیکن ''قلم کار'' کے ہوتے ہوئے یہ غیر ضروری بھی ہے۔ دوسرے نمبر کے معنی میں یہ لفظ صرف ''قبائے قلمکار'' میں نظر آتا ہے۔ پہلے معنی اب تقریباً بالکل گم ہو چکے ہیں۔ دیکھئے، ''لکھاری''۔

قلی یہ لفظ ترکی ہے، بمعنی ''خادم، غلام''۔ ''حمال'' کے معنی میں ہمارا لفظ ''قلی'' اور انگریزی لفظ Coolie اسی سے بنے ہیں۔ ''علی قلی، محمد قلی، درگاہ قلی'' وغیرہ ناموں میں یہی ترکی لفظ ''قلی'' ہے۔

قمری اول مضموم، یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

قہوہ اول سوم مفتوح۔ کشمیر میں جو مشروب ''قہوہ'' کے نام سے مقبول ہے وہ عربی اور اردو ''قہوہ'' سے بالکل مختلف ہے۔ کافی (coffee) کو عربی اور اردو میں ''قہوہ'' کہتے ہیں۔ اب اردو میں لفظ ''قہوہ'' بہت کم بولا جاتا ہے۔ بظاہر coffee اور ''قہوہ'' میں کوئی آواز یا حرف مشترک نہیں، لیکن اغلب یہ ہے کہ دونوں کی اصل Kaffa ہو جو ملک حبش کے اس علاقے کا نام ہے جہاں پہلے پہل قہوے کی کاشت ہوئی۔ اس بات کا امکان ہے کہ ہمارے یہاں شروع شروع میں ''کافی'' اور ''قہوہ'' دونوں لفظ رائج رہے ہوں۔ سترہویں صدی کے بعض انگریز سیاحوں کے بیانات سے ایسا ہی متبادر ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو لفظ ''کافی'' ہمارے یہاں سے انگریزی میں گیا، نہ کہ انگریزی سے ہمارے یہاں آیا۔

کارروائی چلانا کسی جلسے یا محفل کی نظامت کرنے کو اب بعض لوگ ''کارروائی چلانا'' کہنے لگے ہیں گویا ''کارروائی'' کوئی گاڑی ہو جسے کوئی چلاتا ہے۔ اس بے معنی اور غیر ضروری فقرے کا ترک اولیٰ اور انسب ہے۔ ''جلسے کی نظامت کرنا'' نہایت عمدہ فقرہ ہے اور ''کارروائی چلانا'' کی جگہ اسی کو استعمال کرنا چاہئے۔

کاڑھنا ''نکالنا'' کے معنی میں یہ لفظ پرانی اردو میں مستعمل تھا۔ میر ؎

خاطر نہ جمع رکھو دے پلکوں کی خلش سے   سر دل سے کاڑھتا ہے یاں خار رفتہ رفتہ

پورب میں یہ لفظ ان معنی میں اب بھی مستعمل ہے۔ اسے وہاں کے علاقائی استعمالات میں قرار دینا چاہئے۔

کاز انگریزی کا یہ لفظ (cause) آج کل پڑھے لکھے لوگ بھی بجنسہ لکھنے لگے ہیں، جب کہ اس کا بہت مناسب اردو مرادف ''مقصود'' سامنے کا لفظ ہے:

غلط اور قبیح: ہمیں اردو کے کاز کے لئے لڑنا چاہئے۔

صحیح: ہمیں اردو کے مقصود کے لئے لڑنا چاہئے۔

غلط اور قبیح: سیاست کے چکر میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں کہ اردو کا کاز پچھڑ جائے۔

صحیح: ۔۔۔مقصود۔۔۔

کاش کر دیکھئے: ''کاش کے''۔

کاش کہ دیکھئے: ''کاش کے''۔

کاش کے ''کاش کے'' اور ''کاش کہ'' ایک ہی ہیں۔ لیکن شیکسپیئر، ''آصفیہ'' اور ''نور'' میں ''کاش کہ'' مذکور نہیں۔ پلیٹس، فیلن اور ڈنکن فوربس میں البتہ ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' نے اس کا اندراج کیا ہے، لیکن شاعری سے کوئی سند اس کلمے کے لئے نہیں پیش کی ہے۔ نثر کا بھی صرف ایک اقتباس ''سب رس'' کا ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ وہاں بھی ''کاش کے'' رہا ہو اور ''کاش کہ'' سہو کاتب یا سہو تدوین ہو۔ ''کاش کہ'' کی اس وقت جو سند میرے پیش نظر ہے وہ ہمارے زمانے کی ہے:

تم سے ہمیں کیا کیا تھیں امیدیں دل میں ہوک سی اٹھتی ہے
مہر و محبت کم کم کیوں ہے کاش کہ ہوتی کم سے بیش

(خورشید الاسلام)

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش کے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

(غالب)

غالب کے منقولہ بالا شعر میں ہمارے زمانے کے لوگوں کو اکثر وضاحت کی ضرورت پڑی

ہے کہ اصل متن '' کاش کے'' ہے، '' کاش کہ'' نہیں۔ پہلے زمانے میں '' کاش کہ'' بھی تھا، اب مستعمل نہیں۔ وحید قریشی لکھتے ہیں کہ کاف بیانیہ ('' کہ'') کا ایک قدیم املا '' کی'' بھی تھا، اور '' کاش کے'' اسی کی ایک شکل ہے۔ فارسی میں کاف بیانیہ ('' کہ'') کا ایک قدیم املا '' کی'' ضرور تھا، لیکن اردو کی حد تک یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ '' کاش کہ'' بھی صحیح لغت ہے اور یہ '' کاش کی'' سے نہیں بن سکتا۔ قیاس چاہتا ہے کہ '' کاش کہ'' سے '' کاش کے'' بنا ہو، کیونکہ اردو میں فعل ناقص '' کر'' کو اکثر '' کے'' لکھتے ہیں (اس نے مجھے چائے بنا کر دی/ اس نے مجھے چائے بنا کے دی)۔ لہٰذا اغلب ہے کہ '' کاش کے'' کو صوتی املا کے اعتبار سے '' کاش کہ'' لکھنے لگے ہوں، اور پھر '' کاش کہ'' اور '' کاش کے'' دونوں کی جگہ '' کاش کہ'' نے لے لی ہو۔ مختصراً، اس زمانے میں '' کاش کہ'' بہتر ہے لیکن '' کاش کے'' بھی غلط نہیں ہے۔

کاغد مع دال مہملہ، یہ لفظ فارسی ہے، بعد میں دال کی جگہ ذال مستعمل ہو گیا۔ مشرقی علاقوں میں لوگ اب بھی '' کاگد'' کہتے ہیں۔ دیکھئے '' کواغذ''۔

کاغذ یہ لفظ عربی گمان کیا جاتا ہے، لیکن دراصل یہ فارسی ہے، اور اس کی اصل صورت '' کاغد'' ہے۔ دیکھئے '' کواغذ''۔

کاغذات عربی قاعدے سے '' کاغذ'' کی جمع، یہ لفظ عربی فارسی میں نہیں ہے لیکن اردو میں بالکل درست ہے۔ دیکھئے '' کواغذ''۔

کافی اس لفظ کے معنی ہیں، '' ضرورت کے مطابق''، '' صورت حال کے لئے مناسب''، یا '' جو کفایت کرے، کام نکل جانے کے قابل''، یعنی '' جو ضرورت کے لئے مناسب ہو''۔ لہٰذا اس لفظ میں ضرورت کا مفہوم ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مثلاً غالب ؎

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

آج کل لفظ '' کافی'' کو '' زیادہ''، بلکہ '' بہت زیادہ'' کے معنی میں برتنے کا رجحان دیکھا جا رہا ہے۔ ان معنی میں '' کافی'' کہنا بالکل نامناسب ہے۔ یہ غلط تو ہے ہی مضحکہ خیز بھی ہے۔ مثلاً:

حادثے میں کافی آدمی مرے۔ [یعنی جتنے لوگوں کے مرنے کی ضرورت تھی اتنے ہی مرے۔]

ان کی طبیعت کافی خراب ہے۔[یعنی جتنی خراب ہونا چاہئے اتنی خراب ہے۔]

میں کافی دیر سے انتظار میں ہوں۔[یعنی اتنی دیر سے جو ضرورت بھر ہے۔]

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا جملوں میں ''کافی'' کو غلط اور مضحکہ طور پر استعمال کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ استعمال غلط ہو تو ہو، لیکن اب ''کافی'' انھیں معنی میں بولا جا رہا ہے، تو اس کے دو جواب ہیں۔(۱) ایک تو یہ کہ ابھی ''کافی'' کو ''زیادہ'' کے معنی میں بولنے والے بہت نہیں ہیں (یا یوں کہیں کہ ''کافی'' نہیں ہیں)۔ لہٰذا ''کافی'' بمعنی ''زیادہ'' ابھی قائم نہیں ہوا ہے۔(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ''کافی'' کو ''بہت'' یا ''زیادہ'' کے معنی میں بولیں تو اس کے اصل معنی (''ضرورت بھر، جو کفایت کرے'') کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہ رہے گا۔ لہٰذا غلط معنی پر اصرار کرنا اور ایک صحیح اور ضروری معنی سے ہاتھ دھو لینا عقلمندی کی بات نہیں۔ ''کافی'' کے حسب ذیل استعمال بالکل درست ہیں:

مجھے بھوک زیادہ نہیں ہے، ایک پیالہ دودھ ہی کافی ہوگا۔

بس اتنا کہنا کافی ہے کہ یاد کرتے ہیں۔

اللہ نے تمھیں عقل دی، اعضاے سالم دیئے۔ کیا اتنا کرم کافی نہیں؟

کافی ہے تسلی کے لئے گز کا ملیدہ۔

بچوں کا کیا ہے، انھیں خوش کرنے کے لئے ایک کھلونا ہی کافی ہے۔

ملحوظ رہے کہ اگر ''کافی و وافی'' بولا جائے تو ''بخوبی''، ''بھرپور'' کے معنی نکلیں گے اور ان معنی کو کبھی کبھی ''زیادہ'' یا ''بہت'' کے برابر فرض کر سکتے ہیں۔ لیکن اکیلا ''کافی'' کبھی بھی ''زیادہ/بہت'' کے معنی میں نہیں بولا جائے گا۔ دیکھئے: ''خاصا''۔

کافی کچھ جس طرح ''کافی'' کو ''بہت'' کے معنی میں بولنا مضحکہ خیز ہے، اسی طرح ''بہت کچھ'' کے معنی میں ''کافی کچھ'' بولنا مضحکہ خیز ہے، بلکہ بدصورت اور بھونڈا بھی ہے۔ اسے ترک ہونا چاہئے۔

کافی و وافی دیکھئے: ''کافی''۔

کاکن سوم مضموم۔ دیکھیے: ''ککنی''۔

کالا پانی دیکھیے: ''آب سیاہ''۔

کانجی ہاؤس کانجی بروزن فاعلن یا بروزن کام جی، تامل اور تیلگو زبانوں کا لفظ ہے لیکن ہمارے یہاں غالباً انگریزی سے آیا ہے۔ تامل/تیلگو میں ''کانجی'' بہت پتلے پکائے ہوئے چاول کو کہتے ہیں، بلکہ اسے پکائے ہوئے چاولوں کی پیچ یا پساون کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں غذائیت برائے نام ہوتی ہے۔ انگریزوں نے اسے Congee کہا لیکن تلفظ وہی کانجی رکھا۔ انگریزی انتظام میں جن سپاہیوں کو قید کی سزا دیتے تھے انھیں کھانے کے لیے صرف کانجی ملتی تھی۔ اس طرح جس خیمے میں یہ قیدی رکھے جاتے تھے اسے Congee House کہنے لگے۔ یہی نام پھر ان باڑوں یا چھپر کے گھروں کے لیے منتقل ہو گیا جن میں آوارہ پھرنے والے جانوروں کو، یا کسی کے جانور کو پھر اس کے مالک سے لے کر قید میں رکھا جاتا تھا۔ یہ لفظ انھیں معنی میں اب بھی اردو میں رائج ہے۔ انگریزی میں اب مستعمل نہیں۔

کتاب اول مضموم یا مفتوح، چہارم مفتوح (''موید الفضلا'' نے اول مفتوح لکھا ہے اور ''نور'' میں مضموم) ''کتبہ (اول مفتوح)'' کے معنی میں یہ لفظ فارسی ہے۔ اردو میں بھی کبھی مستعمل تھا۔ اب کہیں نظر نہیں آتا۔ ''کتبہ (اول مفتوح)'' جو ''غلط'' لفظ ہے، ''صحیح'' لفظ ''کتاب'' پر حاوی ہو گیا ہے۔ زبانوں کا اصول یہی ہے۔ یہاں غلط صحیح کچھ نہیں، جو رائج ہو جائے وہی صحیح ہے۔ دیکھیے، ''کتبہ''۔

کتبہ اول مفتوح، دوم ساکن، کسی عمارت یا مزار پر لکھی ہوئی عبارت کو کہتے ہیں۔ عموماً ایسی عبارت میں عمارت یا صاحب مزار کی تاریخ، یا کچھ کوائف و توصیف درج ہوتے ہیں۔ یہ لفظ اصلاً نہ فارسی ہے نہ عربی ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ یہ لفظ فارسی ہی لفظ کی طرح اردو میں برتا جاتا ہے۔ مثلاً: ''کتبۂ مزار''۔ اسی طرح: ''کتبہ نویس'' بھی مستعمل ہے اور جمع کے طور پر ''کتبات'' بھی بولا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک اس لفظ کو فارسی عربی کے ساتھ مرکب نہیں کرتے تھے۔ جن معنی میں ہم ''کتبہ'' بولتے ہیں ان معنی کے لیے فارسی میں ''کتابہ'' رائج ہے۔ ''کتبہ'' کو آج کل بعض لوگ اول مضموم بولتے ہیں، یہ غلط ہے۔

کترنا اول مضموم، دوم مفتوح کے ساتھ اس کے معنی ہیں: ''دانت سے کاٹنا''۔ خاص کر چوہے یا پرندے کسی چیز کو کاٹتے ہیں تو اسے اول مضموم کے ساتھ ''کترنا'' کہتے ہیں۔ لیکن ''کاٹنا، چھانٹنا، کسی چیز کو کچھ کاٹ کر چھوٹا کرنا'' کے مفہوم میں یہ لفظ اول دوم مفتوح کے ساتھ ''کترنا'' بولا جاتا ہے۔ ''قینچی'' کو اسی لئے ''کترنی'' کہتے ہیں۔

کترنی دیکھئے: ''کترنا''۔

کچھ اس طرح ''حسبِ ذیل'' یا ''اس طرح'' یا محض ''یوں'' کی جگہ بعض کم علم اردو والے اب ''کچھ اس طرح'' لکھنے لگے ہیں۔

غلط اور قبیح: جو لوگ اس محفل میں شریک تھے ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

غلط اور قبیح: وہاں جو باتیں ہوئیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ظاہر ہے کہ ''کچھ اس طرح'' سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ اب جو فہرست یا تفصیل پیش کی جا رہی ہے وہ پوری طرح درست نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کہنے والے کا مدعا یہ نہیں۔ ''کچھ اس طرح'' کا ان مواقع پر کوئی محل نہیں۔

صحیح اور مناسب: جو لوگ اس محفل میں شریک ہوئے ان کی فہرست حسبِ ذیل/ یوں/ اس طرح ہے۔

صحیح اور مناسب: جو باتیں وہاں ہوئیں ان کی تفصیل حسبِ ذیل/ یوں/ اس طرح ہے۔

یہی بد سلوکی ''کچھ یوں'' کے بھی ساتھ روا رکھی جانے لگی ہے، کہ جہاں ''اس طرح/ حسبِ ذیل/ یوں'' وغیرہ کا محل ہے، وہاں ''کچھ یوں'' لکھا جا رہا ہے، مثلاً ''واقعے کی تفصیل کچھ یوں ہے۔'' گویا تفصیل تو کچھ اور ہے، لیکن ہم جو بیان کر رہے ہیں، وہ اصل واقعے کی تفصیل سے مشابہ ہے۔ اس غلط اور بھونڈے استعمال کو بھی ترک ہونا چاہیے۔

کچھوا اس کا مونث ''کچھوی'' سننے میں آتا ہے، لیکن بہت شاذ۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کچھوی ''کچھوا'' کا مونث، لیکن بہت شاذ سننے میں آتا ہے اور وہیں، جہاں تخصیص کرنی ہو کہ مادہ ہی مراد ہے، نر مراد نہیں، جیسے ''کچھوا اور کچھوی دونوں کی پشت پر سخت ہڈی کا خول ہوتا

ہے۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

پکھیوں دیکھئے: ''پکھ اس طرح''۔

کدہ ''کدہ'' لاحقے، والے تقریباً تمام الفاظ مذکر ہیں۔ مثلاً:

مے کدہ، غم کدہ، نشتر کدہ، ماتم کدہ، آتش کدہ، عشرت کدہ، وغیرہ۔

اس سلسلۂ الفاظ میں یہ بات دلچسپ ہے کہ یہ سارے الفاظ مستقل لفظ کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ اضافت مقلوبی نہیں ہیں کہ ان کو پلٹ کر لفظ کی ''اصل'' شکل حاصل ہو سکے۔ مثلاً ''مے کدہ'' تو درست ہے، لیکن ''کدہ مے'' مع اضافت ہو یا بے اضافت، دونوں طرح مہمل ہے۔ یہی عالم اس قبیل کے اور الفاظ کا ہے۔

کرانہ اول مفتوح۔ ''کراں'' اور ''بے کراں'' کی طرح ''کرانہ'' اور ''بیکرانہ'' اردو فارسی دونوں میں ہیں۔ ان الفاظ میں بھی ہائے ہوز زائد ہے۔

ادیب صابر ؎

دریا کرانہ دارد و دریائے فضل تو نمود ہیچ وقت کے را کران خویش

اقبال ؎

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

کردار انگریزی لفظ Role کے لئے یہ لفظ ہر طرح مناسب ہے۔ اسے مزید رائج ہونا چاہئے۔

کرگدن اول، سوم، اور چہارم مفتوح، بمعنی ''گینڈا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ بعض جگہ چہارم مشدد بھی آیا ہے۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کرگس یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کشتی بمعنی ''ناؤ، جہاز''، حرف اول مکسور اور مفتوح دونوں طرح ٹھیک ہے۔

کلاس دیکھئے: ''جنس، غیر زبانوں کے الفاظ کی''۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ''کلاس'' بمعنی ''اسکول کا درجہ'' (مثلاً: درجۂ چہارم: چوتھی/چوتھا کلاس) فارسی میں مستعمل ہے لیکن اردو

میں ابھی عام نہیں ہوا۔

کلیات کسی شخص کے تمام کلام (خواہ نظم خواہ نثر) کے مجموعے کے معنی میں یہ لفظ عام طور پر مذکر بولا جاتا ہے لیکن پلیٹس (Platts) اور ''آصفیہ'' نے اسے مونث لکھا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اسے مذکر اور مونث دونوں لکھا ہے لیکن مونث کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ ''نور'' میں اسے مذکر لکھا گیا ہے اور یہی مرجح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض لوگ اسے مونث بھی لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا فی الحال اسے مختلف فیہ کہنا چاہئے۔ بہادر شاہ ظفر ؎

لکھیں کہاں تلک تری ہم کلیات کو دیواں ظفر کا دیکھ کے کاتب ہیں کہہ رہے

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ظفر نے ''تری کلیات'' لکھا ہو، اس زمانے میں ''ترے/تری'' میں فرق لکھنے کی حد تک نہ تھا۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ تمام کلام (خواہ نظم خواہ نثر) کے مجموعے کے معنی میں یہ لفظ پرانی فارسی میں کہیں استعمال نہیں ہوا اور پرانے لغات میں ملتا بھی نہیں ہے۔ ''دہخدا'' میں ضرور درج ہے لیکن کوئی سند مذکور نہیں۔

کلیدی لفظ بمعنی Head Word، دیکھئے: ''لغت''۔

کلیسا اول مکسور، یائے معروف۔ ''کلیسا'' اور ''کلیسیا'' ایک ہی لفظ ہیں۔ دیکھئے، ''گرجا''۔

کلیسیا اول مکسور، یائے معروف۔ دیکھئے ''کلیسا''؛ ''گرجا''۔

کلین چٹ یہ ہندوستانی انگریزی کا عامیانہ روزمرہ ہے: To give a clean chit to someone، بمعنی الزام سے بری یا شک سے بالاتر قرار دینا۔ ہندوستانی انگریزی اخبار اس کے موجد ہیں۔ انگریزی کے جدید و قدیم لغات اس سے بے خبر ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اردو والے بھی اس سے بے خبر نہ رہیں، خصوصاً جب اس کے اردو مرادف موجود ہیں۔ سب سے آسان تو یہ ہے کہ clean chit کی جگہ ''صاف نامہ'' کہیں، لیکن اور بھی فقرے ممکن ہیں:

غلط اور قبیح: کھلاڑیوں کو کلین چٹ دے دی گئی۔

صحیح: کھلاڑیوں کو شک/الزام سے بری کر دیا گیا/بری قرار دیا گیا/صاف نامہ دے دیا گیا/کھلاڑیوں کے عمل کو غیر مشکوک بتایا گیا۔

غلط اور قبیح: پارلیمنٹ کی کمیٹی نے وزیر کو کلین چٹ دے دی۔
صحیح: ۔۔۔ کو شک سے بالا تر گردانا / صاف نامہ دے دیا۔۔۔ کے کردار کو غیر مشکوک بتایا۔
غلط اور قبیح: جانچ کمیشن نے حکومت کو کلین چٹ دے دی۔
صحیح: ۔۔۔ کو شبہات سے بری قرار دیا / صاف نامہ دے دیا۔
صحیح: حکومت کا کردار مشکوک نہیں، جانچ کمیشن کی رائے / جانچ کمیشن کی طرف سے حکومت کو صاف نامہ۔

ملحوظ رہے کہ انگریزی میں انھیں معنی میں To give a clean bill ضرور ایک محاورہ ہے، ہندوستانی اخبار نویسوں نے غلطی سے اسے clean chit سمجھ لیا اور اردو والے ان کی نقل میں چل پڑے۔ چونکہ chit اور bill دونوں کے معنی میں ''نامہ'' کا عنصر ہے، بلکہ انگریزی chit دراصل اردو ''چٹھی'' کا انگریزی روپ ہے، لہٰذا ہم نے clean chit/clean bill کا اردو مرادف ''صاف نامہ'' تجویز کیا ہے۔

حال ہی میں ایک اخبار میں سرخی نظر پڑی:

بگ بی کو کلین چٹ

اس کی قباحت، بلکہ غلاظت سے قطع نظر، یہ دیکھیے کہ کوئی اردو والا اس سرخی کے معنی نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ ہندوستانی انگریزی اخبار نہ پڑھتا ہو اور ہندوستانی ٹی وی نہ دیکھتا ہو۔ پھر ایسی اردو سے کیا فائدہ جسے اردو والے سمجھ ہی نہ سکیں۔

کمری وہ گھوڑا جس کی کمر میں طاقت کم ہو اور جو تنومند سوار کو نہ اٹھا سکے، یا جو زوردار سوار کی ران کا دباؤ نہ برداشت کر سکے۔ دیکھیے: ''گھوڑے کے پانچ عیب''۔

کناڈا شمالی امریکہ کا ایک مشہور ملک۔ انگریزی میں اس کا نام Canada ہے اور تلفظ کینڈا (اول مفتوح اور سوم پر بہت ہلکا سا کسرہ)۔ اردو میں اسے ''کناڈا'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن وہاں پر مقیم اہل اردو اب ''کینڈا'' کہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ تلفظ اور املا ابھی اردو میں رائج نہیں ہوئے۔

کنگنی اول مفتوح۔ بہت سی دانہ خور چڑیاں ایک بہت مہین، ہلکا دانہ کھاتی ہیں۔ لکھنؤ اور اس کے قریبی اضلاع میں اس دانے کو ''کاکن'' کہتے ہیں۔ دلی اور بہار میں یہ ''کنگنی'' کہلاتا ہے۔ دونوں الفاظ درست ہیں اور علاقائی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔

کنھیں بعض لوگ یوں لکھتے ہیں:

(۱) مندرجۂ ذیل میں کسی پانچ سوالوں کا جواب لکھیے۔

(۲) مندرجۂ ذیل میں کنھیں پانچ سوالوں کا جواب لکھیے۔

یہ دونوں ہی غلط ہیں۔ ''کسی'' واحد ہے، لہٰذا اسے جمع کے لیے نہیں استعمال کر سکتے۔ اور ''کن ہی / کھی / کنھیں / کنہی / کنھیں'' آج کی اردو میں نہیں ہیں۔ جملہ یوں صحیح ہوگا:

(۳) مندرجۂ ذیل [سوالات] میں سے پانچ سوالوں کے/ کا جواب لکھیے۔

کوا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ کہیں کہیں ''کوی'' سننے میں آیا ہے، لیکن مستند نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کواغذ ''کاغذ'' عربی میں نہیں ہے لیکن اردو فارسی والوں نے عربی کے قیاس پر اس کی جمع ''کواغذ'' بنائی۔ آج کل یہ لفظ کم مستعمل ہے، لیکن غلط بہر حال نہیں ہے۔ عربی میں غلط ہو سکتا ہے، لیکن اردو فارسی میں بالکل درست ہے۔ جو لوگ ''کواغذ'' کو غلط سمجھتے ہیں انھیں خیال کرنا چاہیے کہ پھر تو ''کاغذات'' بھی غلط ہونا چاہیے۔ لیکن اردو میں سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔ فارسی میں اصل لفظ ''کاغد'' تھا، لیکن اب ''کاغذ'' ہی رائج ہے۔ ''فرہنگ آنندراج'' میں ''کاغد'' درج ہے، لیکن سارے مرکبات ''کاغذ'' کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مثلاً ''کاغذ اطفال'' اور ''کاغذ باد'' بمعنی ''پتنگ''؛ ''کاغذ بری''، بمعنی ''حساب میں کمی یا خیانت کرنا''، وغیرہ۔ ''کاغد'' کے قدیم اور صحیح ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پورب کی بولی میں ''کاغذ'' کی جگہ ''کاگد'' اب بھی رائج ہے۔

کوٹ کرنا آج کل بعض لوگ ''اقتباس کرنا، مقتبس کرنا، حوالہ دینا'' کے معنی میں انگریزی مصدر To quote کی مٹی پلید کر کے یہ محاورہ لکھنے لگے ہیں۔ مٹی پلید کرنا میں نے اس لیے کہا کہ Quote کا صحیح انگریزی تلفظ بروزن ''کوٹ'' نہیں ہے، بلکہ ''کووٹ'' ہے۔ بہر حال،

ہمارے یہاں کئی مناسب لفظوں کے ہوتے ہوئے ''کوٹ کرنا'' لکھنا زبان اردو کی توہین کرنا ہے۔

غلط اور قبیح: انھوں نے مجھے غلط کوٹ کیا ہے۔

مناسب اور درست: انھوں نے میرے الفاظ غلط نقل کیے ہیں۔

غلط اور قبیح: مصنف نے اقبال کے تین شعر کوٹ کیے۔

مناسب اور درست: ۔۔۔نقل کیے۔

غلط اور قبیح: آپ نے اقبال کو صحیح کوٹ نہیں کیا ہے۔

مناسب اور درست: ۔۔۔کا صحیح حوالہ نہیں دیا ہے: ۔۔۔اقتباس صحیح نہیں لکھا ہے۔

بعض لوگ تو ''کوڈ کرنا'' لکھنے لگے ہیں، مقام عبرت ہے۔ خدا رحم کرے۔

کوڈ کرنا دیکھیے: ''کوٹ کرنا''۔

کورنش بمعنی ایک طرح کا درباری سلام۔ ترکی میں واؤ معدول اور چہارم مضموم کے ساتھ ہے، لیکن اردو میں واؤ ملفوظ اور چہارم مکسور کے ساتھ بروزن فاعلن مستعمل ہے۔

کوڑی سب سے چھوٹے، اور کبھی کبھی سب سے چھوٹے نہیں بھی، سکے کی حیثیت سے کوڑی قدیم الایام میں مدت تک رائج رہی۔ آج درجنوں محاوروں اور کہاوتوں کے سبب اس لفظ سے ہم سب واقف ہیں ؎

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

(نظیر اکبرآبادی)

ہے جب سے دست یار میں ساغر گلاب کا کوڑی کا ہو گیا ہے کٹورا گلاب کا

(آتش)

لیکن کوڑی کی مالی قیمت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، سو یہاں درج کرتا ہوں:

چار کوڑیاں = ایک گنڈا

تین گنڈے = ایک پان

چار پان = ایک آنہ

چار آنے = ایک کا بن، یا چونی

چار چونیاں، سولہ آنے، یا چونسٹھ پیسے = ایک روپیہ

پانچ ہزار ایک سو بیس کوڑیاں = ایک روپیہ

کوکھ دیکھئے، ''بچھن''۔

کوئل سوئم مکسور مجہول۔ یہ لفظ دلچسپ ہے کہ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں، لیکن صرف نر کوئل بولتی ہے، مادہ کوئل بے آواز ہے۔ پھر بھی ہم کہتے ہیں، ''کوئل کوک / بول رہی ہے۔'' دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔ بعض لوگ ہندی کے اثر سے اس لفظ کا تلفظ ''کویل'' مع سوئم مفتوح کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط اور نامناسب ہے۔

کہانی پوربی اردو میں اول مکسور بولا جاتا ہے۔ اسے علاقۂ پورب کا مقامی تلفظ سمجھنا چاہئے۔ پورب میں کئی لفظوں کے ساتھ ایسا ہے کہ ان کا پہلا حرف مکسور بولتے ہیں چاہے وہ اصل میں مفتوح ہی کیوں نہ ہو۔ دیکھئے، ''نماز''۔

کھٹمل یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کھڑکی دیکھئے، ''مچھر''۔

کھلیانا بمعنی ''کھال اتارنا''۔ دیکھئے، ''گہرانا''۔

کہنہ لنگ وہ گھوڑا جس کے پاؤں میں لاعلاج لنگ ہو۔ دیکھئے، ''گھوڑے کے پانچ عیب''۔

کھیل یائے مجہول۔ دہلی میں یہ لفظ چھوٹے حوض یا بڑی ناند کے لئے بولتے ہیں، خاص کر وہ جسے جانوروں کو پانی پلانے کے کام میں لاتے ہیں۔ ان معنی میں یہ لفظ دہلی کی علاقائی زبان کہنا چاہئے۔ دیکھئے، ''ہودہ''، ''ہودی''۔

کی بجائے / کے بجائے زیادہ تر ''کے بجائے'' لکھا دیکھا گیا ہے۔ مستند لوگوں میں صرف محمد حسن عسکری التزاماً ''کی بجائے'' لکھتے تھے۔ اس باعث ''کی بجائے'' کو غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن ''کے بجائے'' کو ترجیح ہوگی۔

کیجیے ''ڈھونڈیے''، ''سنایے'' کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق ''کیجیے'' بمعنی ''میں کروں/ہم کریں'' کی مثال میں سید انشا کا شعر ہے؂

کلیسا میں بہت کی بت پرستی سالکو اٹھو چلو تک بستر اکا ندھے پہ کس طوف حرم کیجیے

مزید دیکھیے، ''منگوایے''۔

کیچوا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

کیفیت بہت سے لوگ اس لفظ کو بروزن مفعولن کرتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگوں کی زبان پر یہ بروزن فاعلن ہے۔ فی الحال یہ لفظ دونوں طرح درست ہے۔

کینڈا دیکھیے ''کناڈا''۔

کیوں کر دیکھیے، ''کیونکہ''۔

کیونکہ ''کیوں کے''، ''کیوں کر''، ''کیونکہ'' سبھی درست ہیں۔ ''کیوں کے'' اب بہت کم نظر آتا ہے۔

مومن؂

کیونکہ امید وفا سے ہو تسلی دل کو فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

میر؂

چہرہ کتابی اس کا مجموعہ میر کا ہے اک حرف اس دہن کا ہوتا کتاب کیوں کر

میر اثر؂

کس طرح دل اداس رہتا ہے کیوں کے جی بے حواس رہتا ہے

عبدالولی عزلت؂

ہے ہجر کی رات سنسناتی ناگن سوں پھنکار کیوں کے جاوے

بر تکمیل تذکرہ، یہ زمین ولی کی ہے، مطلع؂

دل چھوڑ کے یار کیوں کے جاوے زخمی ہے شکار کیوں کے جاوے

کیوں کے دیکھیے، ''کیونکہ''۔

گادر سوم مضموم، بمعنی ''چمگادڑ''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گاؤمیش یائے مجہول، بمعنی ''بھینس''۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ پلیٹس نے اسے مختلف فیہ لکھا ہے۔ ''آصفیہ'' اور ''نور'' نے اس کو مونث مانا ہے۔ دیکھیے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گاہ ''جگہ'' کے معنی میں بطور لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح جو مرکب حاصل ہوتا ہے اس میں کبھی کبھی صفاتی کیفیت کا شائبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً ''زیر گاہ = نیچے والی جگہ''؛ ''شرم گاہ = شرم والی جگہ''؛ ''فرودگاہ = وہ جگہ جہاں قیام کیا جائے، یا سواری سے اترا جائے''، وغیرہ۔

گدا بمعنی ''بھکاری'' جدید ایرانی لہجے میں اول مکسور ہے۔ اردو میں اول مفتوح ہی درست ہے۔

گدھ اول مکسور، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ اسے بعض لوگ ''گد'' بھی بولتے ہیں، لیکن اب یہ بہت کم مستعمل ہے۔

گذارش یہ لفظ یوں تو ''گزاردن'' بمعنی ''پیش کرنا، ادا کرنا'' سے مشتق ہے، لیکن اردو میں اسے عام طور پر ذال سے لکھتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔ لیکن اگر کوئی زائے ہوز سے لکھے تو کوئی ہرج نہیں۔ اس وقت ہمارے یہاں دونوں املا درست ہیں۔ (خود ''گزاردن'' کے بارے میں اہل ایران متفق نہیں کہ اسے ذال سے لکھیں یا زائے ہوز سے)۔

گذارنا دیکھیے، ''گذرنا''۔

گذرنا فارسی مصادر ''گذشتن'' اور ''گذاشتن'' کے بہت سے مشتقات، اور ان کے قیاس پر بنائے ہوئے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں:

رفت و گذشت؛ گذشتہ؛ گذرنا؛ گذارنا؛ گذارو؛ راہ گذر؛ گذر اوقات؛ واگذاشت؛ واگذار؛ دشوار گذار؛ سرگذشت؛ اوقات گذاری؛ گذران؛ وغیرہ۔

ان سب الفاظ کو اردو میں عموماً ذال سے لکھا جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ انھیں ذال سے لکھنا غلط قرار دیتے ہیں۔ ''نوراللغات'' میں ان اور ان کی طرح کے سب الفاظ کے بارے میں صاف

لکھا ہے کہ انھیں ذال سے لکھنا ''غلط'' ہے۔ دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ یہ الفاظ فارسی کے ہیں، اور فارسی میں ذال نہیں ہے۔ لہٰذا انھیں ذال سے لکھنا غلط ہے۔ اس دلیل میں کئی عیب ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ ''گذشتن''، اور ''گذاشتن'' سے بنائے ہوئے بہت سے الفاظ فارسی میں ہیں ہی نہیں، خالص اردو ہیں۔ مثلاً حسب ذیل الفاظ فارسی میں نہیں ہیں:

گذارہ، بمعنی زندگی کا بسر ہونا، (اتنے میں گذارہ نہ ہوگا، بس یوں ہی گذارہ کرتا ہے)؛ بمعنی بسر اوقات کے لئے رقم، یا عطیہ، (ان کو گذارہ بہت کم ملتا تھا)؛ گذر اوقات؛ گذران، بمعنی گذر جانا (وقت کے گذران کے ساتھ تبدیلی آتی ہے)؛ اوقات گذاری؛ وغیرہ۔

لہٰذا ان اور ان کی طرح کے دوسرے الفاظ پر فارسی کے قاعدے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اردو اپنی جگہ پر مستقل زبان ہے، اس کے اپنے طور طریقے ہیں، اپنا روزمرہ اور اپنا صرف و نحو ہے۔ اس پر کسی اور زبان کے قاعدوں کو جاری کرنا اردو کی توہین اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہ علم لسان کا مانا ہوا اصول ہے کہ کوئی زبان جب کسی غیر زبان سے لفظ حاصل کرتی ہے تو غیر زبان کے لفظ پر اپنے قاعدے قوانین جاری کرتی ہے۔ یہ اصول ہمارے یہاں سید انشا نے اب سے کوئی دو سو برس پہلے ''دریائے لطافت'' میں بہت صراحت اور قوت سے بیان کیا تھا۔

(۳) تیسری بات یہ کہ یہ دلیل ہی غلط ہے کہ فارسی میں ذال نہیں ہے۔ شوکت سبزواری، سید قدرت نقوی، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ نے، اور ان سب کے بہت پہلے خان آرزو نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کر دی ہے کہ فارسی میں ذال ہے۔ بلکہ فارسی میں تو یہ حال ہے کہ ''گزاردن'' بمعنی ''پیش کرنا، ادا کرنا'' کو بھی پہلے ذال سے لکھتے تھے، حالانکہ یہاں اصلاً زائے ہوز تھی۔ چنانچہ ''فرہنگ آنند راج'' مطبوعہ تہران میں ''گذشتن''، ''گذاشتن''، اور ''گذاردن''، سب ذال سے لکھے گئے ہیں۔ بہر حال، ''گزارنا'' بمعنی ''پیش کرنا، ادا کرنا''، مثلاً ''نماز گزارنا''، ''عرض گزار ہونا''، وغیرہ، اردو میں زائے ہوز سے مستعمل ہے۔ لہٰذا یہی درست مانا جائے گا۔ اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ زبان میں ہر چیز کا دار و مدار رواج عام پر ہے۔ اگر ''گذشتن'' اور

''گزاشتن'' کو، یا ان سے بنائے ہوئے الفاظ کو اردو میں ذال سے لکھنے کا رواج ہے تو وہی ٹھیک مانا جائے گا، فارسی والے کچھ بھی کہیں۔

(۵) مندرجہ بالا اصول کو ثبوت کی حاجت نہیں، پھر بھی یہ بات عرض کرتا ہوں کہ یونانی زبان میں بہت سے الفاظ ہیں جن میں کاف کی آواز K سے لکھی جاتی ہے۔ انگریزی کا حرف K اپنی شکل اور آواز کے لحاظ سے بالکل وہی ہے جو یونانی کا K ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انگریزی میں K کو kay کہتے ہیں، اور یونانی میں kappa کہتے ہیں۔ یونانی کے بہت سے لفظ اور اسما، جن میں K ہے، انگریزی میں C سے لکھے جاتے ہیں، اور انگریزی والے اس C کو K ہی کی طرح ادا کرتے ہیں۔ ان سے تو کوئی نہیں کہتا کہ جناب یہ لفظ یونانی ہے، اور وہاں K سے لکھا جاتا ہے، اور آپ کے یہاں بھی K موجود ہے، پھر آپ بلا وجہ یہ جھنجھٹ کیوں پالتے ہیں کہ اسے C سے لکھتے ہیں اور C کا تلفظ K کی طرح کرتے ہیں۔ وجہ یہی ہے، کہ ہر زبان کو حق ہے کہ اپنے املا اور رسم الخط کو اپنی مرضی، سہولت، اور رسم کے مطابق قائم کرے۔ خدا معلوم کیوں ہم لوگ اردو کو اس بنیادی حق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال، انگریزی سے بعض مثالیں یونانی لفظوں کی ملاحظہ ہوں:

انگریزی	یونانی
Academy	Akademeia
Architectonics	Architektonics
Arcadia	Arkadia
Icon	Eikon
Hercules, Heracles	Herakles
Camera	Kamara

گر دیکھیے: ''اگر''۔

گراوٹ یہ لغت نسبۃً نیا ہے، ''نور اللغات'' میں اس کا وجود نہیں۔ اسے ''پستی''، خاص کر معیار یا اخلاق کی پستی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ اب اسے ''اتار'' یا ''تخفیف''

کے معنی میں لکھنے لگے ہیں۔ یہ بالکل نامناسب ہے:

نامناسب اور لائق ترک: قیمتوں میں گراوٹ آئی ہے۔

مناسب: قیمتوں میں کمی آئی ہے/ گراو آیا ہے۔

نامناسب اور لائق ترک: درجۂ حرارت کی گراوٹ کے باعث فصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

مناسب:۔۔۔ کی/تخفیف/اتار۔۔۔/گراو۔۔۔

گر بطور لاحقہ لاحقہ ''گر'' کے معنی ہمیشہ فاعلی ہوتے ہیں، یعنی بنانے والا، کرنے والا۔ مثلاً ''آہن گر'' [لوہے کا کام کرنے والا]؛ ''داد گر'' [انصاف کرنے والا]؛ ''کاری گر'' [کاموں یا کسی خاص کام کا کرنے والا]؛ ''کیمیا گر'' [کیمیا بنانے والا]، وغیرہ۔ یہ لاحقہ ''گرد'' سے مختلف ہے۔

گرجا یہ لفظ پرتگالی Igreja سے بنا ہے۔ خود پرتگالی لفظ کی اصل یونانی ecclesia ہے، جہاں سے ''گرجا'' کے معنی میں ہمارا دوسرا لفظ ''کلیسا/کلیسیا'' برآمد کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ برابر کے مستعمل ہیں۔ انشا؎

کلیسا میں بہت کی بت پرستی سالکو اٹھو چلو تک بستر اکاندھے پہ کس طرف حرم کیجے

اقبال نے ''کلیسیا'' باندھا ہے؎

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

''گرجا'' کے ''معنی'' یا ''توصیف'' کے طور پر شاہ عبدالعزیز صاحب کا مصرع مشہور ہے ع

الٰہی خانۂ انگریز گرجا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بار انگریز حاکم نے کہیں گرجا گھر بنوایا۔ لوگوں نے مقامی مولوی صاحب سے کہا کہ اس پر لعنت کرو۔ مولوی صاحب نے دونوں طرف کا لحاظ رکھتے ہوئے فرمایا: ''گرجا گھر، گرجا گھر، گرجا۔''

گرچہ دیکھیے: ''اگر''۔

گرد بطور لاحقہ ''گر'' اور ''گرد'' ایک نہیں ہیں۔ ''گرد'' جو ''دہشت گرد'' جیسے الفاظ میں ہے،

وہ ''گر'' سے مختلف لاحقہ ہے ''گرد'' کے معنی ہیں ''گھومنے پھرنے والا''، لہٰذا '' آزادی سے، ورانہ عمل کرنے والا۔'' لہٰذا '' آوارہ گرد'' ؛ '' دشت گرد''، وغیرہ۔ جب ''گرد'' پر ''ی'' کا اضافہ کریں تو یہ ہمیشہ برے مفہوم کو ادا کرتا ہے، مثلاً '' نادر گردی'' ؛ '' مرہٹہ گردی'' ؛ '' غنڈہ گردی'' وغیرہ۔ دیکھئے '' دہشت گردی''۔

گرگٹ اول سوم مکسور، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے '' تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ مشرقی علاقوں کی بولی میں اسے ''گرگٹان'' کہتے ہیں، لیکن یہ محض مقامی روزمرہ ہے۔

گرم مصالحہ دیکھئے '' مصالحہ''۔

گری اول مفتوح۔ اس لاحقے کے دو معنی ہیں: (۱) کوئی پیشہ یا کام کرنے کا عمل، مثلاً '' میانجی گری'' بمعنی '' دو لوگوں کے درمیان ربط پیدا کرنے یا ان کے مابین کاروباری گفت وشنید کرنے کا پیشہ یا عمل''۔ یا '' سپہگری'' یعنی '' سپاہی کا پیشہ''۔ یا '' زرگری'' بمعنی '' سونے [سنار] کا پیشہ''۔ یا '' ایلچی گری'' یعنی '' ایلچی کا کام یا پیشہ''۔ میر نے اسی مفہوم میں '' آدمی گری'' لکھا ہے، دیوان چہارم ؎

شب سن کے شور میرا کچھ کی نہ بے دماغی اس کی گلی کے سگ نے کیا آدمی گری کی

اور (۲) '' بنانے کا کام''، جیسے '' کوزہ گری، بادشاہ گری، شیشہ گری''۔ دونوں مفہوم ''گار'' کے مخفف ''گر'' کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں۔ ''گار'' کا لاحقہ فاعلیت کے معنی دیتا ہے، جیسے، '' آمرز گار [بمعنی '' بخشنے والا، یعنی خدا''] ، کردگار [بمعنی '' کرنے والا، یعنی خدا'']، '' وغیرہ۔ ''گیر'' اور ''گیری'' جب لاحقے میں آئیں تو وہ بھی فاعلی معنی دیتے ہیں، جیسے '' کشتی گیر/ کشتی گیری، باورچی گیر/ باورچی گیری''، وغیرہ۔

گزارنا بمعنی '' پیش کرنا، ادا کرنا''، مثلاً '' نماز گزارنا'' ؛ '' عرض گزار ہونا''، وغیرہ، اردو میں زائے ہوز سے مستعمل ہے۔ لہٰذا یہی درست مانا جائے گا۔ مزید دیکھئے '' گذارنا''۔

گزارش دیکھئے '' گذارش''۔

گزرنا بعض لوگ اس لفظ کو بالکل بے ضرورت زائے ہوز سے لکھتے ہیں۔ اسے ذال سے

لکھنا بہتر ہے۔ مفصل بحث کے لئے دیکھئے ''گذارنا''۔

گفتگو عام طور پر ت کو بالکل ساکن بولا جاتا ہے لیکن بہار میں ت کو صاف مفتوح کر کے ''گفت گو'' بولتے ہیں۔ اسے علاقہ بہار کا مقامی تلفظ سمجھنا چاہئے۔

گلوبل/گلوبلائزیشن یہ اصطلاحیں ان دنوں بہت عام ہیں۔ ہندی والوں نے ان کے لئے اچھے، اگرچہ مشکل، لفظ بنا لئے ہیں، لیکن ہم اردو والے کاہلی کی بنا پر انگریزی ہی لکھ رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اب مقبول ہو رہے ہیں اور بہت مناسب ہیں:

Global	عالم کار
Globalization	عالم کاری

گمز ی دیکھئے ''گنبد''۔

گنبد کسی عمارت کے بلند گول حصے کے علاوہ یہ لفظ ''مقبرہ'' کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ پرانی فارسی میں ''گنبذ'' مع ذال تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پورب میں ''گنبد'' کی جگہ ''گمج'' (اول مضموم، دوم مشدد مفتوح) اب بھی عام لوگ بولتے ہیں۔ ''گمزی'' اسی کا مخفف ہے اور عام اردو میں بھی ہے۔

گنتیوں کے جوڑے حسن کلام اور خاص کر زور کلام کے لئے، یا ان حالات میں جب گنتی یقینی نہ ہو، ہمارے یہاں گنتیوں کو جوڑے کی شکل میں بولنے کا طریقہ عام ہے۔ یہ جوڑے دو طرح کے ہوتے ہیں:۔

(۱) اسی گنتی کو دہرا دیا جائے۔

(۲) دو گنتیاں ایک ساتھ استعمال کی جائیں۔

اول الذکر کی بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) چار چار پانچ پانچ کوس پر سرائیں ہوائیں۔

(۲) یہ بات میں نے سو سو بار کہی۔

(۳) دو دو کپڑے پہننے پر بھی سردی نہیں گئی۔

(۴) ہزار ہزار کے نوٹوں کو شمار کرلو۔

ملحوظ رہے کہ گنتیوں کے تکراری جوڑے صرف سو تک کی گنتیوں میں آتے ہیں۔ یعنی ''سو سو'' تو کہہ سکتے ہیں، لیکن ''دو سو دو سو'' نہیں کہہ سکتے۔ سو کے اوپر کی تکرار کے لیے پہلی گنتی ایک بار بولتے ہیں اور دوسری گنتی کے اعداد پورے بولتے ہیں، مثلاً:

(۱) مراسیوں کو ایک سو ایک ایک روپے دیے گئے۔

(۲) بیک وقت دو دو سو آدمیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

(۳) ایک ایک ہزار کے نوٹوں کو شمار کرلو۔

یہ بھی خیال رہے کہ ''ہزار'' اگر اکیلا بولا جائے تو اس کو بھی سو ہی کی طرح برتتے ہیں:

(۱) ہزار ہزار کے نوٹ شمار کرلو۔

موخر الذکر (دو گنتیوں کا بیک وقت استعمال) کی بعض مثالیں یوں ہیں:

(۱) میں یہاں چار پانچ برس سے آتا جاتا ہوں۔

(۲) ان کا مکان بس دس بارہ قدم کی دوری پر ہے۔

(۳) آٹھ دس آدمی بھی جنازے میں نہ تھے۔

(۴) دو چار کیا، یہ بات ستر بہتر لوگوں میں بھی کہہ دوں گا۔

(۵) سو دو سو، چار پانچ سو، لاکھ سوا لاکھ، دس بارہ ہزار، گیارہ ساڑھے گیارہ، پانچ سات لاکھ، وغیرہ۔

گنتیوں کی یہ تکرار اور جوڑے صرف اردو کی شان ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی، سب اس حسن سے محروم ہیں۔

گورخر واو مجہول، بمعنی ''ایک طرح کا جنگلی گدھا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گوریا یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گوزن اول مکسور، دوم مفتوح، سوم ساکن، بمعنی ''جنگلی گدھا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گوسفند بمعنی ''بھیڑ، بھیڑا''۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گولی باری اردو میں ''گولہ باری'' ہے، ''گولی باری'' ہندی والوں کی بھونڈی اختراع ہے۔

غلط: کل شام شہر میں گولی باری ہوئی، پانچ لوگ مارے گئے۔

صحیح: کل شام شہر میں گولیاں چلیں/ گولی چلی۔ گولیوں سے پانچ لوگوں کی جانیں گئیں/ پانچ اشخاص کی موت ہوگئی۔

غلط: میدان میں دو گھنٹے تک گولی باری ہوئی۔

صحیح: میدان میں دو گھنٹے گولیاں چلیں/ گولیوں کی بارش ہوئی۔

گوہ واو مجہول، یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گہرانا اول مضموم مجہول، ''پکارنا، پکار لگانا'' کے معنی میں یہ لفظ غالباً ''گہار/ گوہار'' سے ہے۔ بھوجپوری میں دونوں اب بھی مستعمل ہیں، اردو میں ''گہرانا'' اب نہیں دکھائی یا سنائی دیتا۔ ''گہار/ گوہار'' بھی اب صرف ''کوا گہار'' (بمعنی ''شور غل''، ''پریشانی کی جگہ'') کے روپ میں ملتا ہے۔ یہ بات لائق ذکر ہے کہ ''نور اللغات'' میں ''گہار'' اور ''گہرانا'' دونوں درج ہیں۔ اول مفتوح کے ساتھ ''گہرا ہو جانا'' کے معنی میں مصدر ''گہرانا'' اہل ہندی نے اختراع کیا ہے۔ اردو میں یہ غلط ہے۔ پہلے زمانے کی اردو میں اسم یا صفت سے مصدر بنانے کا تھوڑا بہت رواج تھا، جیسے ''پیڑی/ پیڑانا''؛ ''سانولا/ سنولانا''؛ ''دوہرا/ دہرانا''؛ ''کجلا/ کجلانا؛ گہار/ گہرانا''۔ ''چپت'' سے ''چپتیانا'' اور ''جوتا/ جوتی'' سے ''جتیانا'' بھی بنائے گئے ہیں، لیکن یہ الفاظ محض خوش طبعی یا مزاح کے انداز میں بولے اور کبھی کبھی لکھے جاتے ہیں۔ ''کھلیانا'' بمعنی ''کھال اتارنا'' البتہ قصابی اصطلاح ہے جو کبھی کبھی عام بول چال میں سنائی دے جاتی ہے۔

کسی غیر زبان کے لفظ کو اردو طرز پر استعمال کیا جائے تو اسے ''اردوانا'' کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ عربی کے طرز پر ''تارید'' کہتے ہیں، جو عربی میں نہیں ہے، اردو والوں نے ایجاد کر

لیا ہے۔ بعض لوگ ''تہبند'' کہتے ہیں۔ یہ بھی عربی میں نہیں ہے، لیکن ''ہند'' سے بن سکتا ہے۔ یعنی ''اردو نا'' وہی چیز ہے جس کے لئے ''تاریدہ'' اور ''تہبند'' بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسم یا صفت سے مصدر بنانے کا رواج اب اردو میں بہت کم ہے، اور جو لفظ اس طرح بن کر رائج ہوئے ہیں ان میں ''گبرانا'' بمعنی ''گبرا ہونا/ ہوجانا'' شامل نہیں۔ اسے ترک ہونا چاہئے۔

گھڑیال جانور کے نام کے طور پر ہو، یا ''بڑی گھڑی، گھنٹہ'' کے معنی میں، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گھس پیٹھیا ہندی والوں نے یہ نامناسب اور بھونڈا لفظ Infiltrator کا متبادل قرار دیا ہے۔ ہم اردو والے بھی ان کے پیرو ہو کر اس لفظ کو دھڑلے سے لکھتے ہیں۔ اردو میں ''مداخل'' جیسا سبک لفظ موجود ہے تو پھر ''گھس پیٹھیا'' کو کیوں گھس پیٹھ کرنے دی جائے؟

Infiltrate مداخل ہونا/ کرنا

Infiltrator مداخل

بعض لوگ ''در انداز''، ''در انداز کرنا''، اور ''در اندازہونا/ در اندازی کرنا'' لکھتے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوب متبادل ہیں۔

غلط اور قبیح: بارہ مولہ میں دس گھس پیٹھیوں نے سات شہریوں کو ماردیا۔

غلط اور قبیح: ہمارے بہادر سپاہی گھس پیٹھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔

اس طرح کے تمام جملوں میں ''مداخل/ در انداز'' نہایت خوبی سے آسکتا ہے۔

گھن اول مضموم، چیونٹی کی طرح کا ننھا جانور، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ ''دیکھئے، تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ ''گھن'' مع اول مفتوح، بمعنی ''بادل''، یا ''بہت بڑا ہتھوڑا'' وغیرہ، بھی ہمیشہ مذکر ہے۔

گھوٹالہ بدعنوانی، خاص کر مالی بدعنوانی کے معنی میں ہندی والوں کی دیکھا دیکھی بعض اردو اخبارات بھی اس قبیح لفظ کو لکھنے لگے ہیں۔ ''بدعنوانی''، یا ''بے ایمانی''، ''گڑبڑ'' کے ہوتے ہوئے ''گھوٹالہ/ گھوٹالا'' قطعی غیر ضروری ہے۔

غلط اور قبیح: چارہ گھوٹالے کے بارے میں وزیر اعلیٰ بہار کا بیان ہے۔۔۔

درست اور فصیح: چارہ فراہمی میں بدعنوانی / بے ایمانی۔۔۔

غلط اور قبیح: حزب مخالف کے رہنما نے کئی گھوٹالوں کا ذکر کیا۔

درست اور فصیح: ۔۔۔کئی بدعنوانیوں۔۔۔

گھوڑے کے پانچ عیب گھوڑے میں حسب ذیل پانچ عیب ایسے ہیں جن میں سے ایک کا بھی ہونا گھوڑے کی قیمت کم کر دیتا ہے، اور جس میں یہ پانچوں عیب ہوں، وہ کسی کام کا نہیں ہوتا:

حشری، کمری، شب کور، منھ زور، کہنہ لنگ۔

گھونگا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گئے ''جا رہے''، ''ہو رہے''، اور ''ہوئے'' کی طرح کے فعل مجہول کا ایک اور استعمال جو نہایت قبیح ہے اور اکثر غیر ضروری بھی ہوتا ہے، ہندی کے اثر سے ہمارے یہاں رائج ہو رہا ہے۔ اسے یک قلم ترک ہونا چاہیے۔

غلط اور قبیح: الٰہ آباد میں منعقد کیے گئے ایک جلسے میں۔۔۔

صحیح: ایک جلسہ جو الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔۔۔

صحیح: الٰہ آباد میں منعقد ایک جلسے میں۔۔۔

غلط اور قبیح: دہلی میں کھیلے گئے میچ کا حال۔۔۔

صحیح: ایک میچ جو دہلی میں کھیلا گیا، اس کا حال۔۔۔

صحیح: دہلی کے میچ کا حال۔۔۔

بعض لوگ ''گئے'' کا املا ''گیے'' کرتے ہیں، یہ نہایت قبیح اور بالکل غلط ہے۔

گیدڑ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

گیر دیکھیے ''گری''۔

گیری دیکھئے ''گری''۔

گینڈا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

لاپروا بمعنی ''بے پروا'' بالکل درست ہے۔ اسی طرح ''لاپروائی'' بھی درست ہے۔ یہ اردو کے لفظ ہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں کہ عربی یا فارسی میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ دیکھئے، ''لاپرواہی''۔

لاپرواہی پہلے زمانے میں ''پرواہ'' بولتے تھے، اب یہ مستعمل نہیں، صرف ''پروا/بے پروا/لاپروا'' رائج ہیں۔ زبان کا عام قاعدہ ہے کہ جو رائج ہو جائے وہی درست ہے۔ ''لاپرواہی'' البتہ ایک نئی چیز ہے جو بعض لوگوں نے اختیار کرنی چاہی ہے۔ ''بے پروائی/لاپروائی'' کے ہوتے ہوئے ''لاپرواہی'' غیر ضروری اور غلط ہے۔

لاچار بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح ''لاپروا'' غلط ہے اسی طرح ''لاچار'' بھی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں لفظ اردو کے ہیں، ان کو عربی یا فارسی قاعدے سے جانچنا غلط ہے۔ یہ درست کہ ''لا'' عربی ہے اور ''چار'' دیسی، لہٰذا عربی کی رو سے ''لاچار'' درست نہیں، لیکن ہماری بحث اردو سے ہے، عربی سے نہیں۔ ملحوظ رہے کہ ''ناچار'' بھی درست ہے۔ لیکن آج کل ''لاچار/لاچاری'' زیادہ رائج معلوم ہوتے ہیں۔

لاسلکی مع سین مکسور، ''ریڈیو'' کے لئے ''لاسلکی'' بنایا گیا لیکن بالکل نہ چلا۔ اب اس لفظ کو شاید کوئی پہچانے گا بھی نہیں اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ اب یہ لفظ صد درجہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔

لاش اس لفظ کی اصل اور اس کے معنی دونوں بحث طلب ہیں۔ فارسی میں اس لفظ کے قدیمی، یا اصل معنی ہیں: (۱) تاراج، غارت (۲) زبوں، فرومایہ، لاغر، ضعیف (۳) ہیچ [یعنی کچھ بھی نہیں]، بہت ذرا سی چیز۔ ''لاشہ'' کے بھی اصل معنی کم و بیش یہی ہیں۔ اغلب ہے کہ ''جسد مردہ'' کے معنی تیسرے معنی، یا تمام تینوں معنی کو شدت دے کر بنا لئے گئے ہوں۔

''نور اللغات'' نے اس لفظ کو ترکی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی میں ''لاشہ'' ہے۔ اسٹائنگاس (Freidrich Steingass) جو ترکی کا بھی ماہر تھا، اپنے فارسی لغت میں

اس لفظ کو (اور ''لاشہ'' کو بھی) فارسی لکھتا ہے۔ ''موید الفضلا'' میں ہر تقطیع کے عربی، فارسی، ترکی الفاظ الگ الگ درج ہیں۔ وہاں یہ دونوں لفظ فارسی فہرست میں لکھے ہوئے ہیں۔ ''فرہنگ آنند راج'' میں انھیں فارسی لکھا ہے، اور ''بہار عجم'' میں کوئی تصریح ان الفاظ کے غیر فارسی ہونے کی نہیں ہے۔

''آنندراج'' میں ہے کہ بعض لغات میں اس لفظ کے معنی ''جسد مردہ، خواہ انسان کا، خواہ حیوان کا'' درج ہیں، لہٰذا ان معنی میں اس لفظ کا استعمال صحیح ہے۔ لیکن صاحب ''آنندراج'' نے کوئی سند درج نہیں کی ہے، اور نہ ان لغات کا نام دیا ہے۔ ''غیاث اللغات'' میں بھی کم وبیش یہی بات ہے، سند وہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ لیکن ''غیاث'' میں سند کا رواج نہیں، لہٰذا یہاں سند کا نہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ''غیاث'' نے کئی لغات کے نام یہاں لکھے ہیں، لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ ''جسد مردہ'' معنی کن لغات میں ہیں۔ جو لغات میں دیکھ سکا ان میں سے ''موید الفضلا'' اور ''جہانگیری'' نے نہ ''لاش'' کے معنی ''جسد مردہ'' لکھے ہیں اور نہ ''لاشہ'' کے۔ وہاں صرف وہی معنی درج ہیں، یعنی ''زبوں، ضعیف، لاغر'' وغیرہ جو کہ ان لفظوں کے قدیمی معنی ہیں۔ ''برہان قاطع'' میں البتہ لکھا ہے کہ حیوان مردہ، یعنی کسی جانور یا انسان کے جسد مردہ کو ''لاشہ'' کہتے ہیں۔ ''جہانگیری'' اور ''بہار'' اور ''آنندراج'' نے ''لاشہ'' کے ایک معنی ''تن، بدن'' بھی بتائے ہیں۔ تینوں نے سعدی کا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے اور ''آنندراج'' میں صراحت ہے کہ ''پیر لاشہ'' وہاں بے اضافت ہے ؎

آں پیر لاشہ را کہ سپردند زیر خاک خاکش چناں بخورد کزو استخواں نہ ماند

یہ بات ابھی تک تصفیہ طلب ہے کہ ''جسد مردہ'' کے معنی میں لفظ ''لاش'' پہلے اردو میں برتا گیا یا فارسی میں۔ اسٹائنگاس تو قیاس کرتا ہے کہ یہ لفظ (لاش) دراصل عربی کی فلسفیانہ اصطلاح **لاشي** کو بگاڑ کر بنا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ''جسد مردہ'' والے معنی پہلے فارسی والوں نے اپنائے ہوں گے۔ ''آنندراج'' نے ''لاشی'' کو عربی کا باقاعدہ لفظ بتایا ہے، بمعنی ''معدوم''۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ ''تن مردہ، جسد مردہ'' کے معنی میں فارسی میں ''لاشہ'' ہی سب سے زیادہ مستعمل ہے، پھر ''نعش''، اور سب سے کم بس آمد

(frequency) ''لاش'' کی ہے۔ اردو میں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ یہاں بس آمد کے لحاظ سے ''لاش'' ہے، پھر ''نعش''، پھر ''لاشہ''۔ موخرالذکر تو عام بول میں بالکل ہی نہیں ہے۔ دیکھیے، ''لاشہ''؛ ''لاشی پاشی''؛ ''نعش''۔

لاشہ اس لفظ میں ہائے ہوز اغلباً اصلی ہے، لیکن یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ معنی اور اصل کی بحث کے لئے دیکھیے، ''لاش''؛ ''لاشی پاشی''؛ ''نعش''۔

لاشی پاشی ''ہیچ، حقیر، ذلیل'' کے معنی میں یہ فقرہ داستان امیر حمزہ میں ملتا ہے۔ یہ فارسی میں نہیں ہے، اور اغلب ہے کہ ''لاش/لاشہ'' کے اصل معنی کی بنا پر یہ اردو والوں کی اختراع ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ عربی ''لاشی'' بمعنی ''معدوم'' کے ساتھ ''پاشی'' تابع مہمل ہو۔ معنی بہر حال وہی رہتے ہیں، یعنی ''ہیچ، حقیر، ذلیل'' وغیرہ:

> اس نے نعرہ مارا کہ کیا تم لوگ لاشی پاشی میرے سامنے آتے ہو۔ کسی آہن تن کوہ پیکر سنگ بدن کو بھیجو کہ مزا مجھ کو شمشیر زنی کا آئے۔ (محمد حسین جاہ، ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم، ص ۵۹۴)۔

> ان کو لاشی پاشی و بزدل جان کر یوں گھیر گھیر کر قتل کریں گے کہ ماہیان دریا اور مرغان ہوا کو ان کے حال پر رحم آئے گا (''ہرمزنامہ''، از شیخ تصدق حسین، ص ۱۵۸)۔

> چند سردار چھوٹے جن کو لاشی پاشی کہنا چاہیے ان کو تم نے قتل اور زخمی کیا ہے (''ہرمزنامہ''، ص ۲۲۳)۔

دیکھیے، ''لاش''؛ ''لاشہ''؛ ''نعش''۔

لال یہ لفظ اردو اور فارسی میں مشترک ہے۔ لیکن اردو میں اس کے تین معنی ہیں: (۱) ''سرخ''، (۲) ''پیارا''، اور (۳) ''قیمتی پتھر، جسے یاقوت اور مانک [سوم مفتوح، بروزن ''ناتک''] بھی کہتے ہیں۔'' فارسی میں اول اور سوم معنی ہیں، دوم معنی صرف اردو سے مختص ہیں۔ فارسی میں اس لفظ کے ایک معنی ''گونگا'' بھی ہیں۔ اردو میں یہ معنی ناپید نہیں، لیکن ان معنی میں یہ لفظ صرف ترکیبی حالت میں برتا جاتا ہے۔ مثلاً یوں نہیں کہتے کہ ''فلاں شخص لال ہے،'' بلکہ کہتے ہیں، ''فلاں شخص گونگا ہے'' یا ''فلاں شخص کی زبان رہ گئی ہے۔'' یعنی ''زبان رہ جانا'' محاورہ

ہے بمعنی ''زبان کا بیکار ہو جانا، گونگا ہو جانا۔'' میر کا شعر ہے ؎

اسیر میر نہ ہوتے اگر زباں رہتی ہوئی ہماری یہ خوش خوانی سحر صیاد

''لال'' بمعنی ''گونگا'' کے لیے غالب کا شعر ملاحظہ ہو ؎

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ دل فرد جمع و خرج زباں ہائے لال ہے

فارسی میں ''لال'' کے اسناد حسب ذیل ہیں۔ فرخی کے اس شعر میں ''لال'' بمعنی ''یاقوت'' ہے ؎

از تازگی گل لالہ کہ در باغ بخندد در باغ گوہر گہری چشم شود لال

علی قلی سلیم کے مندرجہ ذیل شعر میں ''لال'' بمعنی ''سرخ'' ہے ؎

پیچیدگی زلف سخن حسن کلام است دانم قلم از ہند سے لال کشاید

دیکھیے ''لعل''۔

لام الف کوئی نصف صدی پہلے تک لام الف [یعنی لا] اردو کے حروف تہجی میں شمار ہوتا تھا۔ غالب نے بھی اس وقت کے رواج عام کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اردو کا حرف تہجی مانا ہے، لیکن لکھا ہے کہ یہ حروف مفردہ میں نہیں۔ ملاحظہ ہو، ''اردو کے حروف تہجی کی جنس''۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لام الف کو حرف ماننے سے انکار کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے زمانے (۱۷۰۸) میں کسی بزرگ امان اللہ نے فارسی میں ایک چھوٹی سی منظوم فرہنگ ''دافع الاغلاط'' نام کی لکھی تھی۔ اس میں لام الف کے بارے میں انھوں نے عجب دلچسپ بات کہی ہے ؎

لام الف دو حرف باشد اے شہ رنگیں کلام چوں الف ساکن بود مانند لا و ما مدام

زاں سبب حرکت نہ باشد بر سرش اے ذوفنوں لام را لاحق باو کردند از بہر سکوں

گر کسے گوید چرا کردند لاحق خاص لام بشنوی از جاں جوابش اے مہ فرخندہ فام

[illegible] در دل لام است ہم حرف الف اے نکتہ داں

زاں سبب پیوند کردند ایں دو را باہم بہ بیں صورت ہمزہ بود چوں الف اے نازنیں

اس دلچسپ لیکن ذرا الجھی بحث کا حاصل یہ ہے کہ الف تو کبھی متحرک ہوتا نہیں ہے اور ابتدا بسکون محال ہے، لہٰذا الف کو متحرک لکھیں تو کیسے لکھیں؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے الف کے سر

پر لام لکھ دیا۔ الف تو اب بھی ساکن رہا، لیکن اب وہ لام کا دل (وسطی حرف) ہے اور الف کے اندر بھی لام ہے اور اصلیت یہ ہے کہ ہمزہ کی صورت الف کی سی ہوتی ہے [لہٰذا یہ ''لام الف = لا'' نہیں بلکہ لام اور ہمزہ ہے]۔

یہ سب گڑبڑ گھوٹالے دلچسپ ہیں، لیکن اردو میں الف اور ہمزہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت بس اس بنیادی بات کو ظاہر کرنے سے غرض ہے کہ لام الف [لا] کو حرف تہجی نہ ماننے کی روایت بہت پرانی ہے۔ ۲۷۴۔۲۷۵

لانڈگا دیکھیے: ''بھیڑیا''۔

لاوے واؤ مفتوح۔ دیکھیے: ''ریگنا''۔

لاویں واؤ مفتوح۔ دیکھیے: ''ریگنا''۔

لعل
بمعنی ''یاقوت، مانک، لال'' اردو فارسی اور عربی میں ہے۔ ''پیارا، بیٹا'' کے معنی میں صرف اردو ہے۔ بعض (مثلاً ''آنند راج'') کا قول ہے کہ ''لعل'' معرب ہے ''لال'' کا۔ بعض (مثلاً ''جہانگیری'') کا کہنا ہے کہ ''لعل'' فارسی ہے، اور چونکہ یہ پتھر سرخ ہوتا ہے، اس لیے اسے ''لال'' بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی ناموں کے ساتھ ''لعل'' نہیں لکھنا چاہیے، کیوں کہ وہ لفظ عربی ہے۔ یہاں اول بات تو یہ ہے کہ نام سے زیادہ ذاتی کوئی چیز نہیں، اور ہر شخص کو اپنے نام کا املا اور تلفظ خود طے کرنے کا حق ہے۔ کنھیا لعل کپور اور ہیرا لعل چوپڑہ ''لعل'' لکھتے تھے اور رام لال، دونوں طرح لکھتے تھے، یعنی ''لال'' بھی، اور ''لعل'' بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ''لعل'' عربی ہے (جو مشکوک بات ہے) تو ''لال'' بھی فارسی ہے، لہٰذا وہ بھی ہندوستانی نام کے طور پر غیر ملکی ہوگا۔ تو اب جن بے شمار لوگوں کے نام میں ''لال'' یا ''لعل'' تھا، یا ہے، وہ اپنا نام تو بدلنے سے رہے۔ جو اپنا نام جس طرح لکھتا ہے، یا جو جس طرح رائج ہے وہی صحیح ہے۔ ''جواہر لعل'' اور ''جواہر لال'' دونوں صحیح ہیں، لیکن جہاں تک معلوم ہے، پنڈت موتی لعل نہرو اپنا اور جواہر لعل نہرو کا نام ''لعل'' ہی کے ساتھ لکھتے تھے۔ تیسری بات یہ کہ ہمارے یہاں اس طرح کے مخلوط ناموں کی کمی نہیں: جوہری مل، راج بہادر، رام غلام، بصورت داس، وغیرہ۔ لہٰذا ہندوستانی ناموں میں ''لعل'' لکھنا بالکل درست ہے، بشرطیکہ صاحب نام بھی یوں ہی لکھتا

ہو۔ دیکھئے ''لال''۔

لکھاری یہ عجیب وغریب اور بدصورت لفظ بعض لوگوں نے ''لکھنے والا'' کے معنی میں برتنا شروع کر دیا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ایک فرانسیسی مصنف رولاں بارت (Roland Barthes) نے ''مصنف'' کے لئے فرانسیسی لفظ Ecrivain کے علم الرقم ایک لفظ Ecrivant (بمعنی ''لکھنے والا'') وضع کیا تھا۔ اول تو بارت کی تفریق کچھ بہت زیادہ معنی خیز نہیں، لیکن اگر اس کو اصطلاحی طور پر استعمال ہی کرنا ہے تو ہمارے یہاں ''قلمکار'' جیسا سبک اور مناسب لفظ موجود ہے۔ اس کو چھوڑ کر ایک مضحکہ خیز لفظ ''لکھاری'' کیوں بنایا جائے؟ دیکھئے، ''قلمکار''۔

لغت اس لفظ کو ''لفظ'' کے معنی میں بولتے ہیں، اور ''فرہنگ یا ڈکشنری'' کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ دونوں معنی میں اسے مذکر یا مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے، لیکن اب زیادہ تر رجحان اس طرف ہے کہ ''لفظ'' کے معنی میں اسے محض مذکر اور ''فرہنگ یا ڈکشنری'' کے معنی میں مونث یا مذکر بولا جائے، یعنی ''فرہنگ'' کے معنی میں اس کی بس آمد (Frequency) بطور مذکر یا مونث کم و بیش برابر ہی برابر ہے۔

''لغت'' کے اصطلاحی معنی ہیں ''وہ لفظ جو کسی لغت میں درج ہو''، مثلاً:

کس لفظ کو لغت بنایا جائے (مولوی عبدالحق)۔

ان معنی میں بھی یہ لفظ مذکر ہے۔ معنی بیان کرنے کے لئے کسی لغت میں کوئی لفظ درج کیا جائے تو اس کو ''سرلفظ'' کہتے ہیں۔ یہ انگریزی اصطلاح Head word کا راست ترجمہ ہے اور خوب ہے۔ اس کے لئے ایک اصطلاح ''کلیدی لفظ'' بھی ہے۔ یہ بھی درست اور قابل قبول ہے۔ فارسی میں ''سرلفظ'' کو ''سرواژہ'' یا ''مدخل'' کہتے ہیں۔ اردو میں یہ رائج نہیں ہو سکے۔

لفاف علاقۂ بہار میں ''لفافہ'' نہ کہہ کر ''لفاف'' کہتے ہیں۔ اسے پوربی اردو کا علاقائی تلفظ سمجھنا چاہئے۔

لفظ یہ لفظ آج کل تقریباً ہمیشہ مذکر بولا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں لکھنؤ والے اسے پہلے مونث قرار دیتے تھے۔ علی اوسط رشک ؎

وصل کی رات بنا نامۂ شوقِ گیسو شام لفظیں ہیں سپیدی ہے سحر کاغذ کی

لکھنؤ میں آج بھی یہ لفظ بعض لوگوں کی زبان پر مونث سنا جاتا ہے۔ مولانا علی نقی نقوی عرف نقن صاحب طاب ثراہ کی تفسیر قرآن میں یہ لفظ ہر جگہ مونث استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقر کی تفسیر میں ہے:

(۱) یہاں قرآن نے صرف تین لفظیں صرف کی ہیں۔

(۲) آخر میں جو دو لفظیں ہیں، **واتقوا اللّٰہ، ویعلمکم اللّٰہ**، یہ ہمارے خیال میں دونوں قسم کے احکام کے لحاظ سے ہیں۔

''لفظ'' کی تانیث اہلِ لکھنؤ کے یہاں کوئی نئی بات نہیں، اور نہ شاذ ہے۔ غالب نے اپنے خط مورخہ ۱۸۵۶ میں یوسف علی خاں عزیز کو لکھا ہے:

''لفظ'' اس ملک [= دہلی] کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہلِ پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔

لکڑ بگھا یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے، ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

لگام کسنا ''شکنجہ کسنا'' کی طرح اور تقریباً انھیں معنی میں بعض لوگ ''لگام کسنا'' لکھنے لگے ہیں۔ اس محاورے کی بھی کوئی سند نہیں۔ اردو میں اس موقعے پر ''لگام دینا''، ''لگام چڑھانا'' مستعمل ہیں اور بہت خوب ہیں۔ ''لگام کسنا'' کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔

للہ ''للہ'' کا یہ املا ''للہ'' اردو میں شروع سے رائج ہے۔ بعض لوگ اسے بگاڑ کر ''للّٰہ'' لکھتے ہیں۔ بعض لوگ اسے اور بھی بگاڑ کر ''لللہ'' لکھتے ہیں جو اور بھی برا اور غلط ہے۔ اس سے مکمل پرہیز لازم ہے۔

للّٰہ دیکھیے، ''للہ''۔

لللہ دیکھیے، ''للہ''۔

لوٹ پاٹ اردو میں ''لوٹ مار'' جیسا بامعنی اور محاکاتی روزمرہ ہوتے ہوئے بھی ہندی والوں نے اپنی طرف سے ''لوٹ پاٹ'' گڑھ لیا، اور لطف یہ کہ اردو والے بھی اسے برتنے لگے

ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔ "لوٹ پاٹ" کے لئے اردو میں کوئی جگہ نہیں۔

لومڑی یہ لفظ ہمیشہ مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔

لے دیکھئے "ریگنا"۔

لیبوریٹری انگریزی لفظ Laboratory کے لئے لفظ "معمل" بنایا گیا تھا لیکن مقبول نہ سکا۔ پھر بھی، تحریری زبان کی حد تک میں اسے Laboratory پر ہر جگہ ترجیح دوں گا۔

لے کر ہندی میں یہ فقرہ "بارے میں، موضوع بنا کر، موضوع بحث بنا کر، معاملے پر" وغیرہ کے مفہوم میں بولا جانے لگا ہے، شاید اس لئے کہ اردو کے منقولہ بالا روزمرے وہاں ٹھیک سے کھپتے نہیں نہیں۔ وجہ جو بھی ہو، اردو میں اس طرح کا صرف بے معنی ہے:

غلط اور قبیح: بڑھتی ہوئی مہنگائی کو لے کر ایوان میں بہت شور غل ہوا۔
صحیح: ۔۔۔ کے معاملے پر/کو موضوع بنا کر/کے بارے میں ۔۔۔
غلط اور قبیح: طالب علموں نے داخلہ امتحان کو لے کر احتجاج کیے۔
صحیح: ۔۔۔ کے معاملے پر/کے بارے میں/کو موضوع بنا کر ۔۔۔
غلط اور قبیح: آج کل سب اسی بات کو لے کر پریشان ہیں۔
صحیح: ۔۔۔ اسی معاملے پر/بات کے بارے میں ۔۔۔
غلط اور قبیح: انھوں نے افسانے کے کرداروں کو لے کر بہت آزردگی کا اظہار کیا۔
صحیح: ۔۔۔ کے بارے میں/کو موضوع بنا کر ۔۔۔

لینا انگریزی میں بعض حالت میں to take کو "کھانا" یا "پینا" کے معنی میں بولتے ہیں:

چائے پینا = to take tea

میں نے دن کا کھانا ایک مقامی ریستوراں میں کھایا = I took my lunch in a local restaurant.

اب ہندی والوں کی دیکھا دیکھی اہل اردو نے بھی "لینا" بمعنی "کھانا/پینا" برتنا شروع کر دیا ہے۔ یہ نہایت قبیح اور غیر ضروری ہے۔

غلط او رفصیح: میں ناشتے میں صرف ایک انڈا لیتا ہوں۔

صحیح: میں ناشتے میں صرف ایک انڈا کھاتا ہوں۔

غلط اور فصیح: کیا آپ نے صبح کی دوا لے لی؟

صحیح: کیا آپ نے صبح کی دوا پی/ کھالی؟

غلط اور فصیح: آپ چائے میں چینی لیتے ہیں؟

صحیح: آپ چائے میں چینی پیتے ہیں؟

اردو میں بعض حالات میں ''لینا'' کے معنی ''خریدنا'' بھی ہوتے ہیں۔ مجھ سے جب کوئی پوچھتا ہے کہ ''کیا آپ [مثلاً] کچھ پھل/ٹوسٹ [وغیرہ] لیں گے؟'' تو میں جواب میں پوچھتا ہوں، ''کیا برائے فروخت ہے؟''

مابعد الطبیعیات جب ارسطو کی تصانیف کی فہرست بنائی جانے لگی تو Physics تک تمام تصنیفات کے نام درج کیے گئے، پھر باقی کے لیے ایک لفظ استعمال کرلیا گیا، Metaphysics، یعنی ''باقی وہ سب جو Physics کے بعد ہے۔'' ممکن ہے یہ کسی نے اپنی آسانی کے لیے کیا ہو، بہر حال اس فہرست کی بنا پر ارسطو کی وہ تحریریں جن کا تعلق ماورائی موضوعات، مثلاً الٰہیات، عقل، روح، وجود وغیرہ سے تھا، انھیں Metaphysics کہا جانے لگا۔ جب مغربی فلسفے کی یہ شاخ اردو میں آئی تو ہم لوگوں نے بھی Metaphysics کا سیدھا سیدھا ترجمہ ''مابعد الطبیعیات'' کردیا اور یہی رائج ہوگیا۔ اردو میں اس کا تلفظ بروزن مفعولن مفاعلان ہے۔ اصل میں مفعولن مفاعیلان ہونا چاہیے تھا، لیکن مفعولن مفاعلان رائج ہے اور یہی درست ہے۔ بعض جگہ ''مابعد الطبیعات'' بروزن مفعولن فعولان لکھا ملتا ہے۔ اس کا کوئی جواز نہیں۔

ماتحت جو شخص کسی کے حکم کا پابند ہو، یا کسی کی نگرانی میں کام کرے، اسے اس شخص کا ''ماتحت'' کہا جاتا ہے جس کے حکم کا وہ پابند ہے۔ علاوہ ازیں، ''محکوم، زیر نگیں، زیر اختیار'' کے معنی میں بھی ''ماتحت'' اردو میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ عربی میں ہے نہ فارسی میں۔ لہٰذا عربی فارسی میں یہ غلط کہا جائے گا۔ اردو کے لیے بالکل صحیح ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی، ''ماتحت'' عربی کے لحاظ سے بے معنی ہے، مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح و بامعنی لفظ ہے۔

ماتم خانہ ''خانہ'' کے لاحقے کے ساتھ جتنے لفظ ہیں کم و بیش سب مذکر ہیں، مثلاً:

مے خانہ، غم خانہ، ماتم خانہ، عبادت خانہ، خدا خانہ، بت خانہ، وغیرہ۔

''کدہ'' کے لاحقے والے لفظوں کی طرح ان لفظوں کی بھی شکل مقرر ہے، یعنی ''غم خانہ'' کو ''خانۂ غم'' اور ''عبادت خانہ'' کو ''خانۂ عبادت'' نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں، جیسے ''خانۂ خدا'' اور ''خانۂ ماتم''۔ میر درد کا شعر ہے

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

مار بمعنی ''سانپ''، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

مار پٹنا ''مار پڑنا'' کے معنی میں یہ محاورہ کچھ دن پہلے اسکولی بچوں تک محدود تھا۔ افسوس کہ اب یہ بڑوں کی زبان پر بھی آنے لگا ہے۔ اس سے احتراز واجب ہے۔

مارنا ''کرنا، لگانا'' کے معنی میں ''مارنا'' کا استعمال اردو میں کثرت سے ہے۔ فارسی میں بھی ''زدن'' ان سب معنی میں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ فارسی کے بعض استعمالات اردو سے لئے گئے ہوں، اور اردو کے بعض استعمالات فارسی سے۔ اس سے زیادہ کہنا مشکل ہے، سوائے اس کے کہ یہ مماثلت حیرت انگیز ہے:

تالا مارنا/قفل زدن = تالا لگانا: ٹھپا مارنا/سکہ زدن = ٹھپا لگانا: چانٹا مارنا، تھپڑ مارنا/سیلی زدن، لطمہ زدن = چانٹا/تھپڑ لگانا: ڈینگ مارنا/لاف زدن: غوطہ مارنا/غوطہ زدن = غوطہ لگانا: مہر مارنا/مہر زدن = مہر کرنا، مہر لگانا: نعرہ مارنا/نعرہ زدن = نعرہ کرنا، لگانا وغیرہ۔

یہ بات ضرور ہے کہ ''زدن'' کے ساتھ فارسی کے بعض استعمالات اردو میں نہیں ہیں:

بانگ زدن، بوسہ زدن، حرف زدن، لقمہ زدن، ہیضہ زدن، وغیرہ۔

اردو میں ان کے متبادل حسب ذیل ہیں:

بانگ دینا، بوسہ دینا، گفتگو کرنا، لقمہ دینا، ہیضہ کرنا

مارے گئے ہندی میں آج کل ''مارے گئے'' کو ''مرے'' کے مفہوم میں برتا جارہا ہے۔ افسوس کہ اردو والے بھی اس بین فرق کو نہیں ملحوظ رکھتے:

حادثے میں بارہ آدمی مارے گئے۔

یہاں ''بارہ آدمیوں کی موت ہوئی/ کی جانیں گئیں/ بارہ آدمی مرے/ حادثے کا شکار ہوئے'' کا محل ہے۔ ''مارے گئے'' کا مطلب ہی کچھ نہیں جب تک فاعل مذکور نہ ہو اور ''حادثہ'' یہاں فاعل کا مفہوم نہیں دے سکتا۔ یہی اصول صیغۂ حال پر بھی جاری ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۲) روزانہ تین بچے مارے جاتے ہیں۔

یہاں ''مرتے ہیں'' کا محل ہے، اور وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔

▪ حسب ذیل جملہ دونوں عیوب (فعل ناقص اور صیغۂ ماضی کے غلط استعمال) کے باعث حد درجہ قبیح و غلیظ ہے:

براتیوں کو لے جارہی جیپ بس سے ٹکرائی۔

یہاں اور کچھ نہیں تو ''جاتی ہوئی'' اور ''ٹکرا گئی'' لکھنا چاہئے تھا۔ افسوس ہے کہ اردو جیسے سڈول اور مکمل زبان کے ذمہ دار حضرات ایک چھوٹے سے جملے میں ایسی غلطیاں کریں۔

ماضی کی بعض شکلیں ہندی میں ماضی مطلق کی بعض شکلیں ایسے مفہوم میں استعمال ہو رہی ہیں جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وہ وضع نہیں ہوئی تھیں۔ ہندی میں ''گئے'' اور ''تھے'' اور ''لیا''، ''دیا'' کے ساتھ ماضی بنانے کا رواج اب کم ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہندی میں اکثر اس جگہ ماضی مطلق لکھ دیا جاتا ہے جہاں ماضی مطلق مخلوط کا محل ہوتا ہے۔ حسب ذیل مثالوں پر غور کریں:

(۱) آسٹریلیا نے تیسرا ٹسٹ جیتا۔

یہاں ''جیتا'' کی جگہ ''جیت لیا'' کا محل ہے۔ ''جیتا'' اس وقت ٹھیک ہوتا جب ایک سے زیادہ مقابلوں کا ذکر ہوتا۔ مثلاً:

(۲) چار ٹسٹ میچ ہوئے۔ آسٹریلیا نے تیسرا ٹسٹ جیتا اور ہندوستان نے چوتھا۔

(۳) ڈاکوؤں نے تین آدمی مارے۔

یہاں ''مارے'' کی جگہ ''مار دیئے/ مار ڈالے'' کا محل ہے۔ ''مارے'' اس وقت درست ہوتا جب

کچھ اور حادثوں یا اموات کا ذکر ہوتا۔ مثلاً:

(۴) ڈاکوؤں نے تین آدمی مارے تو بیماری نے پانچ۔ یا

(۵) آج آٹھ لوگوں کی موت ہوئی۔ ڈاکوؤں نے تین آدمی مارے اور شدت پسندوں نے پانچ۔

(۶) وزیراعظم آج لندن پہنچے۔

یہاں ''پہنچ گئے'' کا محل تھا۔ ''پہنچے'' اس وقت ٹھیک ہوتا جب وہ کہیں اور جا رہے تھے اور پہنچے کہیں اور، یا پھر کچھ اور لوگوں کے مختلف جگہوں پر پہنچنے کا ذکر ہوتا۔ مثلاً:

(۷) وزیراعظم کو آج ماسکو پہنچنا تھا لیکن وہ لندن پہنچے۔ یا

(۸) وزیراعظم آج لندن پہنچے اور وزیر خارجہ ماسکو۔

(۹) یہودیوں نے بیت اللحم چھوڑا۔

یہاں ''چھوڑ دیا'' کا محل تھا۔ ''چھوڑا'' تب ٹھیک ہوتا جب اس طرح کے کئی واقعات کا ذکر ہوتا۔ مثلاً:

(۱۰) یہودیوں نے بیت اللحم چھوڑا اور عربوں نے تل ابیب۔ یا

(۱۱) یہودیوں نے بیت اللحم چھوڑا لیکن حبران میں جا گھسے۔

(۱۲) کئی آدمی ڈوب کر مرے۔

یہاں ''ڈوب کر مر گئے'' کا محل تھا۔ ''مرے'' تب درست ہوتا جب کسی اور طرح کی موت کا بھی ذکر ہوتا۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، حسب ذیل جملہ دونوں عیوب (فعل ناقص اور صیغۂ ماضی کے غلط استعمال) کے باعث حد درجہ قبیح و غلط ہے:

براتیوں کو لے جا رہی جیپ بس سے ٹکرائی۔

یہاں اور کچھ نہیں تو ''جاتی ہوئی'' اور ''ٹکرا گئی'' لکھنا چاہئے تھا۔ افسوس ہے کہ اردو جیسے سڈول اور سجل زبان کے ذمہ دار حضرات ایک چھوٹے سے جملے ایسی غلطیاں کریں۔

مالا نسیم دہلوی نے اسے مذکر باندھا ہے اور بعض لوگوں نے اسے نسیم کا عجز نظم قرار دیا ہے کہ انھوں نے ایک مونث لفظ کو مجبوراً مذکر لکھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں عجز نظم کا سوال نہیں۔ دہلی میں

''مالا'' مذکر ہے۔ اور لکھنؤ والے بھی ہمیشہ نہیں تو اکثر اسے مذکر لکھتے رہے ہیں۔ ''طلسم فتنۂ نور افشاں'' جلد سوم مصنف احمد حسین قمر میں محض ایک صفحہ ۲۰۶ پر چار جگہ ''مالا'' ہے اور چاروں جگہ مذکر۔ دلی والے انیسویں صدی کے بعد ''مالا'' کو مونث بولنے لگے۔ مصحفی نے اسے مذکر ہی لکھا ہے ؎

سینے پہ تو بناتا اک موتیوں کا مالا نقاش کھینچتا یوں تصویر اشک جاناں

یہ شعر ''فرہنگ آصفیہ'' میں ہے۔ وہیں نسیم دہلوی کا بھی شعر درج ہے ؎

ابر نیساں کی پڑیں بوندیں جو تیری زلف پر موتیوں کا گردن افعی میں مالا ہو گیا

یہ شعر ''کلیات نسیم''، مرتبہ کلب علی خاں فائق، (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶) کے صفحہ ۱۹۰ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

آج اکثر اسناد ''مالا'' کی تذکیر کے حق میں ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دلی میں بھی آج اکثر لوگ ''مالا'' کو مونث بولتے ہیں۔ میں بھی مونث بولتا ہوں، لیکن چونکہ محاورۂ جمہور کا ایک حصہ آج بھی ''مالا'' کی تذکیر کے حق میں ہے، اس لئے میں اسے مذکر بولنا غلط نہیں سمجھتا۔ اثر لکھنوی نے ''فرہنگ اثر'' میں لکھا ہے کہ ''مالا'' مختلف فیہ ہے، اور لکھنؤ میں بقید نظم ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ ''بقید نظم'' کی شرط تو ''طلسم فتنۂ نور افشاں'' کے حوالے سے رفع ہو گئی جو میں نے اوپر درج کیا ہے۔ لہٰذا اب یہی طے رہا کہ ''مالا'' دونوں طرح درست ہے، اور لکھنؤ والے اسے بیش از بیش مذکر بولتے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ مصحفی یا نسیم کو کوئی مجبوری تھی جس بنا پر انھوں نے ''مالا'' کو مذکر لکھا۔

مان دان ''رسم رواج'' کے معنی میں یہ فقرہ عورتوں کی زبان پر بھی تھا۔ اب عورتوں کا کوئی مخصوص روزمرہ نہیں رہ گیا، بعض بعض لغات مخصوص بہ زناں اب عام زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ ''مان دان'' ان میں سے نہیں ہے۔ ''تعظیم و احترام، آؤ بھگت، خاطر لحاظ'' وغیرہ کے معنی میں یہ فقرہ ہندی والوں کے یہاں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ اردو والے اس بھونڈے فقرے کو ان معنی میں قبول کرنے پر کیوں مائل ہیں۔ ہندی میں بھی یہ نو خاستہ اور نو ساختہ ہے۔ نہ ''شبد ساگر'' میں اس کا پتہ ہے نہ میک گریگر (Mc Gregor) کے آکسفورڈ

ہندی لغت میں۔ اس لفظ سے مکمل پرہیز لازم ہے۔

ماننا ''کسی رائے کا حامل ہونا'' کے مفہوم میں ہندی والے (خاص کر ٹی وی کے لوگ) خدا جانے کہاں سے ''ماننا'' کا لفظ لے آئے ہیں۔ اس غیر مناسب صرف کے سبب سے اس لفظ کے اصل معنی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔

غلط اور قبیح: حکومت کا ماننا ہے کہ باڑھ سے بچاؤ کا جو انتظام ہو رہا ہے وہ کافی ہے۔

صحیح و فصیح: حکومت کی رائے ہے/ کا خیال ہے/ کا موقف یہ ہے کہ۔۔۔

غلط اور قبیح: سکریٹری داخلہ کا ماننا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد اتنی نہیں جتنی اخباروں میں بیان کی جا رہی ہے۔

صحیح و فصیح: سکریٹری داخلہ کا بیان ہے/ کہنا ہے/ اس رائے کے ہیں کہ۔۔۔

غلط اور قبیح: بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ دھوپ میں گرم کیا ہوا پانی نقصان دہ ہے۔

صحیح و فصیح: ۔۔۔ اس رائے کے ہیں۔۔۔

غلط اور قبیح: میرا ماننا ہے کہ یہاں آپ کا آنا اچھا ہو۔

صحیح و فصیح: میرا خیال ہے کہ۔۔۔

مانو ''گویا، جیسے'' کے معنی میں یہ لفظ جدید ہندی میں مقبول ہے۔ اب بعض جگہ یہ اردو میں بھی دیکھا جانے لگا ہے۔ اردو میں اسے درآمد کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اردو میں ''مانو'' کے اپنے معنی ہیں، اس پر کوئی اور معنی لادنا، اور وہ بھی نامناسب معنی، کسی طرح درست نہیں۔

غلط اور قبیح: میں وہاں پہنچا تو مجھے ایسا لگا مانو میں جنت میں آ گیا ہوں۔

صحیح و فصیح: ۔۔۔ گویا ۔۔۔/ ۔۔۔ جیسے ۔۔۔

ماوا عربی میں الف مقصورہ سے ہے۔ اردو میں الف ہی سے صحیح ہے۔ ''جنت الماویٰ'' البتہ ابھی الف مقصورہ ہی سے درست ہے۔

ماہیت عربی میں اس کا تلفظ بروزن مفعولن (ما + ہی + یت) ہے۔ لیکن اردو میں بروزن فاعلن رائج ہو گیا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ اگر کوئی اس لفظ کو بروزن مفعولن لکھے تو اسے غلط نہ کہا جائے گا۔ لیکن بروزن مفعولن پر اصرار کرنا، اور بروزن فاعلن کو غلط کہنا، دھاندلی اور بے عقلی ہے۔

ماؤں ''ماں'' کا ندائیہ اردو میں ''ماؤ/اے ماؤ'' کے سوا کچھ اور دیکھا نہیں گیا اور نہ سنا گیا۔ ہندی میں البتہ ''اے ماؤں''، اور ''اے بہنوں'' لکھا جانے لگا ہے (اور ہندی استعمالات کے اثرات پاکستانی اردو پر بھی ہیں) لیکن ''ماں'' کا ندائیہ ''ماؤں/اے ماؤں'' ابھی پاکستان میں بھی عام نہیں۔ اردو میں تو ابھی اسے کوئی استناد حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

مترجم ''ترجمہ کرنے والے'' کے معنی میں اس لفظ کا تلفظ بروزن ''مقابل'' ہے، یعنی اول مضموم، دوم مفتوح اور چہارم مکسور۔ بعض لوگ حرف سوم بھی مفتوح اور چہارم کو مکسور مشدد بولتے ہیں، لیکن یہ تلفظ عام نہیں ہوا ہے۔ اس سے احتراز انسب ہے۔

مترجمہ ''ترجمہ کیا ہوا'' کے معنی میں اس لفظ کا حرف اول مضموم، اور حرف دوم اور چہارم و پنجم مفتوح ہیں۔ بعض لوگ حرف چہارم کو مکسور مشدد بولتے ہیں۔ یہ تلفظ ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ اس سے احتراز انسب ہے۔

متلاشی ''متقابل، متعارف'' وغیرہ کے وزن پر اردو میں یہ لفظ ''تلاش'' سے بنایا گیا ہے۔ عربی میں اس کا وجود نہیں، اور نہ ''تلاش'' ہی عربی میں ہے۔ لیکن اردو کی حد تک ''متلاشی'' بالکل درست ہے۔

مجتبائی دیکھئے، ''الف''۔

مجمع
یہ ان چند لفظوں میں سے ہے جن کے تلفظ میں حرف عین غائب ہو جاتا ہے، اگر وہ حالت جمع میں ہوں، یا حرف جار کے تحت ہوں۔ یعنی ''مجمع'' کی جمع ''مجمعوں'' کا تلفظ بروزن فع لن ہے، لیکن ''مجمعوں/مجمعے'' کے تلفظ میں عین غائب ہو جاتا ہے اور ان لفظوں کو ''مجمے/مجموں'' بروزن فع لن بولتے ہیں۔ جو لوگ بہت احتیاط کرتے ہیں، وہ ''مجمعوں/مجمعے'' کو شعر میں اس طرح باندھتے ہیں کہ عین پوری طرح ملفوظ ہو۔ مثلاً خواجہ میر درد ؎

آئے تھے اس مجمعے میں قصد کر کے دور سے ہم تماشے کے لئے آپ ہی تماشا ہو گئے

یہاں ''مجمعے'' بروزن اچھا نہیں لگتا، اگرچہ قاعدے کے اعتبار سے ''صحیح'' ہے۔ اگر کوئی ''مجمعے/مجمعوں'' کو بروزن فع لن باندھے تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ ''موقع'' بھی ''مجمع'' کی قسم کا لفظ ہے۔ اس کی جمع ''موقعوں'' میں عین ظاہر نہیں کیا جاتا۔

مچرب
بمعنی "چربی دار، موٹا تازہ"۔ دیکھئے "مرغن"۔

مچھر
یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دلی والے "مچھڑ" بولتے ہیں۔ الٰہ آباد اور اس کے ذرا پورب کے خطے میں بھی "مچھڑ" سنائی دیتا ہے۔ یہ ان علاقوں کا مقامی تلفظ ہے۔ زیادہ تر لوگ رائے مہملہ ہی سے بولتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید دہلوی نے لکھا ہے کہ "مچھڑ" (مع رائے ہندی) دہلی میں نہیں سنا گیا۔ اس سلسلے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک نہایت ثقہ دلی والے بزرگ کے سامنے میں نے یہی بات کہی کہ دلی والے "مچھر" کو "مچھڑ" بولتے ہیں تو وہ آشفتہ ہو کر بولے کہ ہرگز نہیں۔ لیکن چند ہی منٹ بعد ان صاحب نے از خود "مچھڑ" کہا۔ یعنی غیر شعوری طور پر وہ مع رائے ہندی ہی بولتے تھے، لیکن شعوری طور پر اس سے منکر تھے۔ بیدار بخت بھی دلی والے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دلی والے "مچھر" اور "مچھڑ" (یعنی مع رائے ہندی) دونوں طرح بولتے ہیں۔

رائے مہملہ اور رائے ہندی کا یہ تبادل اور بھی لفظوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً مشرقی علاقوں میں "کھری" مع رائے مہملہ بولتے ہیں، لیکن دوسرے علاقوں میں عام تلفظ "کھڑی" مع رائے ہندی ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں، مثلاً "بڑی" (دال کی بنی ہوئی ایک طرح کی چیز جسے کھاتے ہیں) کو پورب میں عموماً "بری" مع رائے مہملہ کہا جاتا ہے۔ دیکھئے، "تانیث سے عاری نام، جانوروں کے"۔

مچھلی
یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، "تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔ یہ لفظ دلچسپ ہے کہ خود تو ہمیشہ مونث ہے لیکن دریائی مچھلیوں کے تمام اقسام کے نام مذکر ہیں۔

مخففات
بہت سی مغربی زبانوں میں لفظ کی جگہ اس کے مخفف کے طور پر اس کا پہلا حرف رکھ دیتے ہیں۔ یہ صورت ناموں کے لئے اکثر دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ:

George Bernard Shaw بجائے G.B.Shaw

William Butler Yeats بجائے W.B.Yeats

مستعمل ہیں۔ یا پھر: U.N.O. بجائے United Nations Organization وغیرہ۔

ہماری زبانوں میں یہ رسم نہیں ہے۔ ہندی والوں نے اخبار میں اسے رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہندی میں حرف کا تصور اس پر حرکت کے بغیر نہیں، لہٰذا وہ لوگ جب مخفف بناتے ہیں تو حرف کے ساتھ اس کی حرکت بھی لکھتے ہیں۔ اس طرح بعض مضحک صورت حالات پیدا ہوتی ہیں، اور ہندی والے بھی وہاں مخفف بناتے ڈرتے ہیں۔ مثلاً ''مدھیہ ریلوے'' کا ہندی مخفف ہو گا: ''مرے''۔ اس سے بھاگ کر وہ لوگ ''م دھیہ'' لکھ کر کام چلاتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے ناموں کے ساتھ اور بھی بھونڈی شکلیں ہندی میں بنائی جاتی ہیں:

بھارتیہ جنتا پارٹی = بھاجپا؛ سماج وادی پارٹی = سپا؛ مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی = ماکپا؛ بہوجن سماج پارٹی = بسپا؛ وہپ = وشو ہندو پریشد

یہ شکلیں کتنی بھونڈی اور زبان کے مزاج سے کس قدر متغائر ہیں، یہ کہنے کی ضرورت شاید نہیں۔ لیکن افسوس کہ بعض اردو اخباروں میں بھی یہ مخففات دھڑلے سے برتے جا رہے ہیں۔ ان کو ترک کرنا چاہئے۔ ہمارے بعض جدید شعرا نے انگریزی کے تتبع میں اپنا نام مخففات کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا، مثلاً نذر محمد راشد کی جگہ ن م راشد۔ لیکن راشد صاحب کے سوا کسی کا نام مقبول نہ ہوا۔ اور اب یہ رسم کم و بیش ترک ہے۔ ناموں کی حد تک تو شاید کچھ جواز بھی ہو، لیکن سیاسی پارٹیوں، ریلوں، دفتروں، وغیرہ کے نام کو مخفف استعمال کرنا ہندی کی بھونڈی نقل، اردو کے مزاج کے خلاف، اور ہر طرح واجب الترک ہے۔

جاننا چاہئے کہ ہر زبان کے مزاج میں ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اسے تیز بولا جائے گا یا آہستہ آہستہ ادا کیا جائے گا۔ مثلاً فرانسیسی بہت تیز بولی جاتی ہے۔ اردو آہستہ آہستہ بولی جاتی ہے۔ انگریزی کی رفتار ادائگی فرانسیسی سے کم لیکن اردو سے زیادہ ہے۔ ملیالم اور تمل فرانسیسی سے بھی زیادہ تیزی سے ادا کی جاتی ہیں۔ تو جو زبان کہ تیزی سے ادا نہ ہوتی ہو، وہ پورے لفظ لکھنے یا بولنے کے بجائے ماکپا، بھاجپا، سپا جیسے اینڈے بینڈے مخففات کیوں کر پسند کرے گی؟

مدا یہ انتہائی بدصورت لفظ ہندی والوں نے ''مدعا'' کو بگاڑ کر issue, point of discussion, matter of dispute, وغیرہ کے معنی میں برتنا شروع کیا ہے۔ افسوس کہ اردو والے بھی ان کی نقل کرنے لگے ہیں۔ ہمارے یہاں حسب ذیل الفاظ اس مطلب کو ادا

کرتے ہیں:

مسئلہ، سوال، معاملہ

اتنے اچھے لفظوں کے ہوتے ہوئے ''مدا'' جیسا لفظ برتنا مقام افسوس ہے۔ بعض لوگ تو ''مدعا'' اور ''مدا'' کو ایک سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا: ''انھوں نے جتنے مدے اٹھائے۔۔۔'' خدا اردو کو ایسے اردو والوں سے بچائے۔

مدخل اول مضموم، سوم مفتوح، دیکھیے: ''لغت''۔

مدنظر آج کل کچھ لوگ یہ کلمہ ''پیش نظر'' کی طرح بولتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''مدنظر'' کے پہلے حرف جار ''کو''، اور اس کے بعد فعل ناقص ''رکھتے ہوئے'' آتا ہے۔ ''پیش نظر'' کے پہلے حرف جار ''کے'' آتا ہے اور اس کے بعد فعل ناقص ''رکھتے ہوئے'' عموماً نہیں آتا۔

غلط: غیر ملکی سیاحوں کی آمد کے مدنظر ہوائی اڈے پر انتظامات بڑھا دیے گئے ہیں۔

صحیح: ۔۔۔کو مدنظر رکھتے ہوئے۔۔۔

غلط: اس شہر میں پھیلی ہوئی وبا کے مدنظر لوگوں نے باہر نکلنا کم کر دیا ہے۔

صحیح: ۔۔۔کو مدنظر رکھتے ہوئے۔۔۔

دیکھیے: ''پیش نظر''۔

مذکر اور مونث الفاظ کی پہچان، اردو میں اردو میں تذکیر اور تانیث کے لیے قاعدے بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی تو ان کے مستثنیات بے شمار ہیں۔ بعض قاعدے ایسے ہیں کہ شاید ایک ہی دو لفظوں پر ان کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ اس کے باوجود اردو والوں کو فکر رہی ہے، یا شاید بھرم رہا ہے، کہ ہمارے یہاں تذکیر تانیث کی پہچان یا تعین کے قاعدے مرتب ہو سکتے ہیں۔ غالب نے دو مختلف خطوں میں بالکل صحیح اصول بیان کیا تھا:

> تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ نہیں۔۔۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا، ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔

(بنام مرزا یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۶)

> تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر عمل کیا جائے۔ جو جس کے

کانوں کو لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے، اس طرح کہے۔

(بنام میر مہدی مجروح، ۱۸۶۳)

غالب کو معلوم نہ رہا ہو گا کہ انشا اور قتیل نے ''دریائے لطافت'' میں ایک سرسری کوشش کی تھی کہ تذکیر و تانیث کے کچھ قاعدے مرتب کر دیے جائیں۔ یہ کوشش ادھوری رہی، اس معنی میں کہ ایسے قاعدے ممکن ہی نہیں ہیں جن میں مذکر مونث کی تمام صورتوں کا احاطہ ہو جائے۔ غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے اپنی کتاب ''رشحات صفیر'' میں قاعدہ سازی کی ذرا مفصل کوشش کی۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مجھے معلوم سب ہے، لیکن میں اپنا کلام صرف اقوال اساتذہ پر مبنی رکھوں گا۔ اس کے باوجود وہ حروف تہجی کی جنس بیان کرنے میں غالب کے بیانات کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ صفیر کے بیانات و اصول اگرچہ سید انشا اور مرزا قتیل سے زیادہ مشرح اور منضبط ہیں، لیکن پھر بھی ادھورے اور الجھن میں ڈالنے والے ہیں۔

حسرت موہانی نے اپنے ''تذکرۂ شعرا'' میں اپنے استاد تسلیم لکھنوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ تسلیم کے استاد (یعنی حسرت کے دادا استاد) نسیم دہلوی نے ایک بار تسلیم کو مذکر مونث کی تعیین کے قاعدے بتائے تھے لیکن وہ بے بہا کاغذ ان سے گم ہو گیا۔ مجھے بہر حال شک ہے کہ نسیم دہلوی نے ایسے قاعدے دریافت یا وضع کر لیے ہوں گے جن پر سب کا اتفاق ہو اور جن کا اطلاق ہر جگہ ہو سکتا ہو۔ جلال لکھنوی نے اپنے رسالہ تذکیر و تانیث میں قاعدہ سازی کی ہے لیکن وہ بھی غیر تشفی بخش رہی۔ ہمارے زمانے میں علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی مرحوم نے اپنی کتاب ''کیفیہ'' میں کچھ آسان قاعدے تذکیر و تانیث کے لکھے ہیں۔ یہ قاعدے نسبتاً زیادہ قابل قبول لگتے ہیں، لیکن ہیں وہ بھی نہایت محدود۔ احسان دانش نے بھی کچھ قاعدے لکھے ہیں جو در اصل جلال اور کیفی سے ماخوذ ہیں۔ احسان دانش نے تین قاعدے لکھے ہیں:

(۱) جو لفظ اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے کرخت، رعب دار، پرشکوہ ہو، اسے مذکر قرار دیا جائے۔

محاکمہ: ـ یہ قاعدہ احسان دانش کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس کے واضع پنڈت کیفی ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ قاعدہ بہت معتبر معلوم ہوتا ہے، لیکن قدیم و جدید دونوں استعمالات اس کے خلاف ہیں۔ مرقوم الذیل مثالیں ملاحظہ ہوں۔ یہ سب الفاظ اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے ''کرخت،

رعب دار، پرشکوہ' وغیرہ ہیں، لیکن مونث ہیں:

بلا، بندوق، توپ، چنگھاڑ، ڈانٹ، رائفل، زبردستی، سزا، عقوبت، کڑک، گڑگڑاہٹ، مردانگی، وجاہت، ہیبت

کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ تو زبان میں عرصے سے رائج ہیں۔ ہمارا اصول تو نئے لفظوں کے لئے ہے۔ تو مندرجہ ذیل مثالیں ایسے الفاظ کی ہیں جو پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں داخل ہوئے ہیں۔ بعض تو ابھی پوری طرح رائج بھی نہیں ہوئے۔ یہ سب مونث ہیں:

بربریت، بم باری، بہیمیت، تاب کاری، مشین گن، ہائی جیکنگ۔ (ان میں سے کوئی بھی لفظ نہ "آصفیہ" میں ہے نہ "نور اللغات" میں۔)

(۲) جس اسم کی تذکیر و تانیث میں شک ہو اسے مذکر بولنا صحیح ہوگا۔

محاکمہ:۔ قاعدۂ اول اور قاعدۂ دوم دونوں میں مذکر کو مونث پر فوقیت دی گئی ہے۔ یہ اصول زبردستی پر مبنی ہے۔ علاوہ بریں، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ غیر زبان کا لفظ جب زبان میں داخل ہوتا ہے تو لوگ اس کے ہم معنی دیسی لفظ کی جنس کا اطلاق باہری لفظ پر بھی کر لیتے ہیں۔ جب اس سے کام نہ چلے تو قیاس لگاتے ہیں۔ اگر لفظ غیر زبان کا نہیں ہے، تو بھی لوگ عموماً یہی کرتے ہیں کہ اس کے قریب ترین دیسی لفظ کی جنس کا اطلاق اس پر بھی کر لیا جاتا ہے۔ غیر زبان کے لفظ کی جنس متعین کرنے کے لئے یہ اصول (جسے علامہ کیفی نے بیان کیا ہے) بہت عمدہ ہے کہ اس کے ہم معنی، یا قریبی معنی رکھنے والے دیسی لفظ کی جو جنس ہوگی وہی جنس غیر زبان کے لفظ کی بھی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی سے کسی لفظ کی جنس کے بارے میں پوچھتے ہیں، اور سند نہیں موجود ہوتی تو جواب دینے والا کہتا ہے کہ "میں نے یوں ہی سنا ہے"، یا "میں/ہم یوں ہی بولتا ہوں/بولتے ہیں"، یا "چونکہ اس کا ہم معنی فلاں لفظ مذکر یا مونث ہے، اس لئے یہ لفظ بھی مذکر یا مونث ہوگا۔" ایسا نہیں ہے کہ مجہول الجنس لفظ کو اوبدا کر مذکر کہہ دیا جاتا ہے۔ انگریزی کے جو لفظ اردو کی عام بول چال میں مستعمل ہو گئے ہیں، ان کی جنس پر غور کیجیے تو یہ بات فوراً کھل جائے گی کہ ہمارے یہاں مذکر کو کوئی خاص ترجیح نہیں ہے۔

(۳) جس لفظ کی تذکیر و تانیث فصحا کے عدم استعمال کی وجہ سے مبہم ہو، اور قیاس بھی کام نہ

کرے، اسے مذکر لکھنا چاہیے۔

محاکمہ: یہ اصول جلال کا بنایا ہوا ہے، اور اصول نمبر ۲ سے کچھ مختلف نہیں۔ لہٰذا اس پر مزید محاکمہ ضروری نہیں۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو غلطی یا انتشار، یا دونوں کا امکان بڑھ جائے گا۔ بہتر اصول یہی ہے کہ اپنے ماحول اور معاشرے سے کسی لفظ کی جنس کے بارے میں جو تاثر حاصل کیا گیا ہو اس پر ہی عمل کیا جائے۔ غالب کی رائے کم و بیش صحیح تھی۔ اس پر بس اتنا اضافہ ضروری ہے کہ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی لفظ کی جنس من مانے طور پر، یا دھاندلی کے ذریعہ طے کرتا ہے۔ الفاظ کی جنس متعین کرنے میں قیاس بہت کم، اور سماع بیش از بیش کام کرتا ہے۔

دیکھیے: ''اتلا''؛ دیکھیے: ''اردو کے حروف تہجی کی جنس''۔

مذکر حقیقی دیکھیے: ''حاملہ''۔

مربہ اول مضموم، چہارم مفتوح مشدد، عربی میں الف مقصورہ سے ''مربیٰ'' ہے۔ اردو میں ہائے ہوزی سے صحیح ہے۔

مرچ مسالہ/ مسالا لگانا دیکھیے: ''مصالحہ''۔

مرحوم دیکھیے: ''آنجہانی''۔

مرز بوم اول مفتوح، واو معروف، بمعنی ''زمین''، مذکر۔ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی ''زمین''، لیکن اردو میں نہ ''مرز'' تنہا بولا جاتا ہے نہ ''بوم''۔ دونوں کو ملا کر جوڑے کی طرح بولتے ہیں۔ پلیٹس اور ''نور اللغات'' میں ''مرز بوم'' کو مذکر لکھا ہے، لیکن آج کل یہ مونث سنا جاتا ہے۔ دیکھیے: ''الفاظ کے جوڑے''۔

مرطوب بمعنی ''نم دار، رطوبت دار'' وغیرہ (جیسے ''مرطوب آب و ہوا'') عربی میں نہیں ہے لیکن فارسی میں ہے۔ اردو میں بھی یہ مندرجہ بالا معنی میں بالکل صحیح ہے۔

مرغن بمعنی ''روغن دار، بہت زیادہ گھی یا تیل میں پکائی ہوئی چیز''۔ دیکھیے: ''مزیب''۔

مرغابی اول مضموم، بمعنی ''پانی کا ایک پرند'' اور ''پانی میں رہنے والا کوئی پرند''۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

مرغی دیکھیے: ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

مزاج بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پرسش حال کے محل پر یہ لفظ صرف واحد بولا جانا چاہیے۔ جوش صاحب اس پر سختی سے کاربند تھے اور کہتے تھے کہ کسی شخص کا مزاج تو ایک ہی ہوتا ہے، پھر ''آپ کے مزاج کیسے ہیں؟'' کہنا بے معنی ہے، ''آپ کا مزاج کیسا ہے؟'' بولنا چاہیے۔ جوش صاحب کا اصرار اصول زبان سے بے خبری ہی پر دال کہا جائے گا، کیوں کہ زبان میں منطق یا قیاس سے زیادہ سماع کی کارفرمائی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں کہ جوش صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ محاورے کو منطق پر فوقیت ہے۔ یہ بات یقیناً سو فی صدی درست ہے، لیکن پھر جوش صاحب کے لئے اس اعتراض کا محل نہیں تھا کہ مزاج تو ایک ہی ہوتا ہے، اسے جمع کیوں بولا جائے؟ محاورے کے اعتبار سے ''آپ کا مزاج کیسا ہے؟'' بھی ٹھیک ہے، اور ''آپ کے مزاج کیسے ہیں؟'' بھی ٹھیک ہے۔ اب کچھ مزید تفصیل ملاحظہ ہو:

احترام کے لئے بہت سے لوگوں کے ساتھ ہم جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے: ''آپ کے ابا اب کیسے ہیں؟'' یا ''یا آپ کی اماں اب کیسی ہیں؟'' تو کیا اس پر اعتراض کیا جائے کہ ابا اور اماں تو ایک ہی ہیں، پھر انھیں جمع کیوں بولا جاتا ہے؟ اصولی بات یہی ہے کہ اردو میں (بلکہ عربی فارسی میں بھی) اکثر احترام ظاہر کرنے کے لئے جمع استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے ''ابا/اماں'' بھی جمع ہیں، ''مزاج'' بھی موقعے کے لحاظ سے جمع بولا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ حسب ذیل قسم کے فقرے: ''اللہ میاں فرماتے ہیں''؛ ''اللہ میاں گناہ کو ناپسند کرتے ہیں''، اسی اصول کے تحت بولتے ہیں۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ ان فقروں میں شرک کا شائبہ ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان کے اصول کا مذہب کے اصول سے کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ ہم لوگ ''صلواۃ'' اور ''صلواتیں سنانا'' کو دو بالکل الگ معنی میں کیوں بولتے، ور حالے کہ ''صلواتیں سنانا'' بمعنی ''برا بھلا کہنا، گالیاں دینا'' میں اسلام کے عظیم الشان رکن صلواۃ کی تحقیر کا اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض غلط ہے۔ اس طرح اعتراض لگائے جائیں گے تو ''مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے'' اور ''ریش قاضی'' جیسے محاورے اور فقرے زبان باہر کرنے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ زبان کا بھلا چاہنے والا کوئی یہ نہ چاہے گا۔ ناسخ نے ''ریش قاضی'' کیا خوب استعمال کیا ہے اور

''مزاج'' کے واحد یا جمع ہونے کے بارے میں ایک سند بھی مہیا کر دی ہے ؂

نہ پائی ریش قاضی تو لیا عمامۂ مفتی

مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے

ناسخ کے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ'' مزاج'' اگر'' طینت'' کے معنی میں بولا جائے تو واحد البتہ ہوگا۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کی مزید تائید کرتے ہیں، داغ (۱) اور ذوق (۲) ؂

دل لگی کیجیے رقیبوں سے اس طرح کا مرا مزاج نہیں

آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج تا زبان خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا

اقبال نے نظم'' ایک گائے اور بکری'' میں بکری اور گائے دونوں کی زبان سے'' مزاج'' کو جمع کہلایا ہے، اور داغ کے یہاں یہ واحد ہے (۱) اقبال (۲) داغ ؂

بڑی بی مزاج کیسے ہیں گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

نہیں معلوم ایک مدت سے قاصد حال کچھ ان کا

مزاج اچھا تو ہے یا دشمن بخیر اس آفت جاں کا

لیکن اب بعض محاوروں میں'' مزاج'' کو جمع بھی بولنے کا رجحان ہو گیا ہے، مثلاً'' ایک ڈانٹ ہی میں اس کے مزاج درست ہو گئے''، یا'' وہ ہم لوگوں سے نہیں ملتے، ان کے مزاج بہت ہیں''، وغیرہ۔ ایک حد تک یہ رجحان پہلے بھی تھا، چنانچہ قائم چاند پوری کا شعر ہے ؂

کچھ لگ چلا تھا رات میں بولا کہ خیر ہے حضرت مزاج آپ کے کیدھر بہک گئے

ملحوظ رہے کہ'' مزاج'' کو'' صحت'' کے معنی میں بولتے تو ہیں، لیکن صرف استفسار کی حد تک۔ یعنی'' ان کا مزاج اب کیسا ہے؟'' کے معنی'' ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' بالکل درست ہیں، لیکن '' ان کا مزاج ٹھیک نہیں'' کے معنی'' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں'' یا'' وہ بیمار ہیں'' نہیں ہو سکتے۔'' ان کا مزاج ٹھیک نہیں'' کے معنی ہیں:'' وہ اس وقت غصے میں ہیں''، یا:'' ان کا مزاج برہم ہے''۔

مزدور ''مزدور'' کو پہلے زمانے میں'' مزور'' (یعنی دال مہملہ کے بغیر) بھی بولتے اور لکھتے تھے۔ اسی طرح،'' مزدوری'' کو'' مزوری'' بھی لکھتے اور بولتے تھے۔ بعد والوں نے دال کو ساقط کرنا ترک کر دیا۔ اور اب'' مزدور'' مع دال ہی صحیح ہے۔ فارسی میں یہ لفظ مع اول مضموم یعنی

''مزدور'' بروزن ''پرنور'' ہے۔ لیکن اردو والوں نے فارسی تلفظ چھوڑ کر میم پر زبر لگا لیا۔

مزلف بمعنی ''زلفوں والا''، شاہ مبارک آبرو ؎

کھسیان پت کے مارے عاشق جو ہم میں الجھا
آیا تھا اے مزلف تو کس سے پیچ کھا کر

دیکھیے، ''مزیب''۔

مزیب بروزن ''مقرر'' بمعنی ''زیب دیا ہوا'' فارسی اور اردو میں عربی ''زیب'' سے بنا لیا گیا ہے۔ ایک زمانے میں زیادہ رائج تھا، اب کم نظر آتا ہے۔ عربی میں نہ سہی، اردو میں بہر حال درست ہے، عزیز لکھنوی ؎

مزیب جس کی قامت پر لباس **بضعۃٌ مِنّی** مزین چادر تطہیر جس کے دوش اقدس پر

فعلّل کے وزن پر اردو فارسی میں کئی لفظ عربی قاعدے سے بنا لیے گئے ہیں۔ اردو کے لیے سب صحیح ہیں، عربی میں ایسے سب لفظ غلط ہیں، لیکن فارسی عربی کے قاعدے اردو کے لیے سند نہیں۔ بعض مثالیں حسب ذیل ہیں: مرغن (روغن دار)؛ مزلف (زلفوں والا)؛ ملبب (لبالب) اور مچرب (چربی دار، خوب فربہ)، اسی قسم کے لفظ ہیں۔ موخر الذکر دو الفاظ اردو ''چربی'' اور اردو ''لب'' سے بنائے گئے ہیں۔ ''مچرب'' ان دنوں عموماً غیر رسمی اور مزاحیہ انداز ہی میں بولا جاتا ہے لیکن انیسویں صدی میں یہ تحدید نہ تھی۔

مسالہ/مسالا دیکھیے، ''مصالحہ''۔

مسلمانی بمعنی ''ختنہ'' اور بمعنی ''عضو تناسل''، دونوں صورتوں میں مونث ہے۔ دلی میں ''ختنہ'' کے معنی میں ''مسلمانیاں'' بھی کہتے ہیں اور واحد مراد لیتے ہیں۔ بعض دوسرے علاقوں، مثلاً بھوپال میں بھی ''مسلمانیاں'' کہتے ہیں اور واحد مراد لیتے ہیں۔ یعنی دونوں جگہ یوں کہتے ہیں: ''اس کی مسلمانیاں ہو چکی ہیں'' بمعنی ''اس کا ختنہ ہو چکا ہے۔'' دیکھیے، ''ختنہ''۔

مسودہ بمعنی ''کوئی تحریر جس کو ابھی قطعی شکل نہ دی گئی ہو، جس میں اصلاح اور تبدیلی کی گنجائش ہو۔'' انگریزی میں اسے Draft کہتے ہیں۔ عربی ''تسوید'' کے اسم مفعول مونث کی حیثیت سے اسے اول مضموم، دوم مفتوح، سوم مفتوح مشدد، اور چہارم مفتوح کے ساتھ بروزن مقاتلن بولنا

چاہیے اور عام طور پر یوں ہی رائج بھی ہے لیکن سوم مکسور بھی سننے میں آتا ہے۔ یہ دونوں تلفظ درست ہیں۔ لیکن بعض لوگ اسے بروزن تفعلہ (اول مفتوح، دوم ساکن، سوم مکسور) بھی بولتے ہیں۔ اس کی کوئی سند نہیں۔ ہندی میں ''مسودا'' لکھتے ہیں (اول دوم مفتوح، سوم ساکن)۔ پرانے زمانے میں اردو میں بھی یہ تلفظ تھا، اب بالکل نہیں سننے میں آتا۔ ملحوظ رہے کہ عربی کے اعتبار سے ''مسودہ'' مونث ہے لیکن اردو میں یہ بالاتفاق مذکر ہے۔

مشاعرہ عربی میں لفظ ''شعر'' کو باب مفاعلہ میں لے جاتے ہیں اور ''مُشاعرہ'' (اول مضموم، چہارم مفتوح) حاصل کرتے ہیں۔ لیکن وہاں اس کے معنی ہیں، ''مقابلے کی غرض سے باہم شعر پڑھنا یا کہنا''۔ یعنی اس میں کسی باقاعدہ طور پر ترتیب دی ہوئی محفل شعر خوانی اور سامعین کی موجودگی کا کوئی تصور نہیں۔ اردو میں اول مضموم اور چہارم مکسور (مُشاعِرہ) بمعنی ''شعر سنانے کی محفل، جس میں سامعین بھی ہوں اور کئی شعرا شعر سنائیں'' عام طور پر مستعمل ہے اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ میم اور عین پر زبر بولتے تھے۔ اب یہ تلفظ رائج نہیں، ''مشاعرہ'' (اول مضموم، چہارم مکسور) بروزن ''مقابلہ'' ہی صحیح ہے۔

مشکلاہٹ ''مشکل صورت حال'' کے معنی میں یہ لفظ مشرقی علاقوں کے اہل ہندی کے یہاں مستعمل ہے۔ اردو میں اس کا استعمال سراسر روا ہے۔

مشکوک دیکھیے، ''شبہ''۔

مصالحہ بمعنی Spice, Spices، اول، چہارم، پنجم، سب مفتوح۔ اردو میں یوں تلفظ کرتے ہیں گویا اس لفظ کے آخر میں ہائے ہوز نہیں ہے اور حائے حطی کا تلفظ ہائے ہوز کی طرح (بروزن ''پیالہ'') کیا جاتا ہے۔ ضامن علی جلال لکھتے ہیں کہ یہ لفظ عربی ''مصالح'' پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تتبع میں ''نور'' اور دیگر کئی لغات نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ بظاہر ان لوگوں کا خیال ہے کہ عربی لفظ ''مصلحت'' کی جمع ''مصالح'' کو اردو میں لے لیا گیا ہے اور معنی بدل دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا بھی یہی خیال تھا۔ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ اردو میں ''مسالا'' لکھنا چاہیے۔ یہ بات کہیں صاف نہیں ہوتی کہ عربی ''مصالح'' جو بالکل مختلف لفظ ہے اور جس

میں لام مکسور ہے، اردو کا ''مصالح'' مع لام مفتوح کیسے بن گیا اور اس کے معنی اس قدر مختلف کیوں کر ہوئے؟ اور یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ اگر یہ لفظ عربی ''مصالح'' ہے اگرچہ اردو میں اس کے معنی بدلے ہوئے ہیں تو پھر اسے ''مسالا'' کیوں لکھا جائے؟

جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے، اردو کے جدید علما نے اس معاملے میں بہت الجھن پیدا کر دی ہے۔ جھگڑے کی بنا یہ ہے کہ اگر Spices کے معنی میں ''مصالہ'' عربی میں نہیں ہے تو پھر اردو میں کیونکر ہو؟ اسی لئے کئی لوگوں نے ''مصالہ'' کی جگہ ''مسالہ'' تجویز کیا۔ لیکن اب جھگڑا یہ پڑا کہ ''مسالہ'' میں ''ہائے مختفی'' ہے اور ''ہندی'' میں ہائے مختفی ہے نہیں، لہٰذا اسے ''مسالا'' لکھنا چاہئے۔ ''نور'' میں تو ''مصالح/مصالہ'' درج ہی نہیں کیا گیا۔ صاحب ''نور'' نے لکھا ہے کہ دلی میں ''مصالح'' رائج ہے لیکن چونکہ تلفظ اور املا میں مطابقت نہیں لہٰذا تلفظ کی مطابقت کرتے ہوئے لکھنؤ والوں کی طرح ''مسالا'' لکھنا چاہئے۔ صاحب ''نور'' نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ تلفظ کی حد تک تو ''ص/س'' اور ''ہ/الف'' ایک ہی ہیں، پھر یہ کیونکر طے ہو کہ صحیح املا ''مسالا'' ہے، ''مصالا/مصالہ/مسالہ'' نہیں؟ دوسری بات یہ بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ہائے مختفی کیا ہے اور کہاں ہے، اس کے بارے میں بھی ہمارے ماہرین کا ذہن صاف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''مسالہ'' جیسے لفظوں میں ہائے مختفی ہے ہی نہیں۔ تفصیل کے لئے اس کتاب میں اندراج ''ہائے مختفی'' ملاحظہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ''مصالح'' ہی رائج تھا۔ ''مصالہ'' بعد کی صورت ہے۔ اور ''مسالا/مسالہ'' تھا ہی نہیں۔ چنانچہ شیکسپیئر کے لغت میں نہ ''مصالہ'' ہے اور نہ ''مسالہ/مسالا''، صرف ''مصالح'' درج ہے۔ ٹامسن نے بھی صرف ''مصالح'' لکھا ہے اور لام پر زبر دکھایا ہے۔ پلیٹس کے یہاں بنیادی اندراج ''مصالح'' ہے، لیکن اس نے ''مسالا'' اور ''مصالا'' بھی لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ ''مصالح'' کی تصحیف ہیں۔ بہر حال، بعد میں کسی بنا پر ''مصالح'' سے ''مصالہ'' بن گیا اور یہی اردو کا روز مرہ ٹھہرا۔ لیکن ''مصالہ'' کے معنی وہی رہے جو ''مصالح'' کے تھے۔

یہ خیال غلط ہے کہ اردو ''مصالح/مصالہ'' کی اصل عربی لفظ ''مصلحت'' کی جمع ہے۔ اصل

یہ ہے کہ یہ لفظ عربی "مصلح" (بمعنی "سدھارنے والا") کی جمع ہے۔ "مصالح" (میم اول مفتوح، چہارم مکسور) کے معنی ہیں: "چیزہا کہ بداں اصلاح چیز بار دہند، ضد مفاسدہ" ("منتخب اللغات")۔ یعنی عربی میں "مصالح" وہ چیزیں ہیں جن سے دوسری چیزوں کو درست کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا مصالحہ بھی کام کرتا ہے کہ وہ کھانے کی چیزوں کو درست بناتا ہے۔ فارسی میں لفظ "مصالح" (میم مفتوح، لام مکسور) دو معنی میں موجود ہے: اول، وہ چیزیں جو عمارت بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، اور دوم، وہ چیزیں جو کھانے کو لذیذ بناتی ہیں۔ انھیں "مصالح گرم" کہتے ہیں ("بہار عجم"، "فرہنگ آنند راج")۔ یہاں سے ہمارے روزمرہ "گرم مصالحہ" کی بھی اصل معلوم ہوئی، کہ مصالحہ وہ چیز ہے جس سے کھانا "گرم" یعنی لذیذ ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، شروع شروع میں اردو کا لفظ "مصالح" تھا، بعد میں "مصالحہ" ہو گیا۔ دلی میں اکثر لوگ، اور دلی کے باہر بھی بہت سے لوگ "مصالحہ" ہی لکھتے ہیں۔ لیکن "مسالا/مسالہ" کے ذریعہ غلط بحث پیدا ہونے کی وجہ سے اب "مسالا/مسالہ" بھی لکھا جانے لگا۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں جو شواہد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام معنی میں (اور کئی دوسرے معنی میں بھی) "مصالحہ" زیادہ مقبول املا تھا اور آج بھی اسے نامقبول نہیں کہہ سکتے۔

آج کل زیادہ تر لوگ Spices کے معنی میں "مصالحہ" اور "مصالحہ جات" لکھتے ہیں اور کپڑوں وغیرہ پر جو سونا، چاندی، گوٹا، بادلہ، ستارہ وغیرہ لگایا جاتا ہے، اس کے لئے "مسالہ/مسالا" لکھتے ہیں۔ عمارت بنانے میں جو چونا، گارا، سیمنٹ استعمال ہوتا ہے اسے بھی "مسالہ/مسالا" لکھتے ہیں۔ اسی طرح، محاورہ "مرچ مسالہ لگانا" ہے (بمعنی کسی بات کو بڑھانا چڑھانا)۔ اسے عام طور پر برے معنی میں برتتے ہیں:

انھوں نے میری باتیں خوب مرچ مسالہ لگا کر سب سے کہیں۔

کسی معاملے کے نکات وغیرہ، یعنی Matter کے معنی میں صرف "مسالہ" لکھتے ہیں، مثلاً:

مجھے ان کے خلاف بہت کچھ مسالہ مل گیا ہے۔

مندرجہ بالا سب استعمالات اور محاورے آج بالکل درست ہیں۔

ملحوظ رہے کہ ''مصالحٰ'' کے اور بھی بہت سے معنی ہیں، مثلاً کوئی بھی کیمیائی مرکب، پاوڈر، دھنیا وغیرہ جو محرم میں بانٹتے ہیں۔ ان سب معنی میں ''مصالحٰ'' لکھنا بہتر ہے لیکن ''مسالہ'' کو غلط نہ کہیں گے۔ ''مسالہ/مسالا'' میں ہائے مختفی کی بحث کے لئے دیکھئے ''ہائے مختفی''۔

مصراع ''مصرع'' کے معنی میں عربی لفظ ''مصراع'' بھی مروج ہے۔ ''منتخب اللغات''، ''بہار عجم''، ''غیاث اللغات''، ''آنندراج''، سب میں درج ہے کہ ''مصراع'' اور ''مصرع'' ایک ہی ہیں۔ متقبول عربی لغات میں ''مصراع'' کا اندراج مجھے نہیں ملا، لیکن جب ''منتخب'' اور ''غیاث'' جیسے محتاط لغات میں ''مصراع'' کو عربی بتایا گیا ہے تو یقین ہے کہ بڑے لغات میں یہ لفظ ہوگا۔ انیسویں صدی تک اردو والے ''مصراع'' بھی لکھتے تھے، غالب ؎

موزونی دو عالم قربان ساز یک درد مصراع نالہ نے سکتہ ہزار جا ہے

''مصراع'' اب بھی استعمال کیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔

مصرع دیکھئے ''مصرعہ''۔

مصرعہ ''مصرع'' اور ''مصرعہ'' ہم معنی ہیں۔ ''مصرع'' کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ عربی ہے۔ لیکن ''مصرعہ'' کہاں سے آیا، یہ نہیں کھلتا۔ بظاہر اسے ''مصرع'' کی تانیث ہونا چاہئے، لیکن تانیث کی ضرورت کوئی معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ یہاں تائے وحدت ہو، لیکن یہ بھی ہے کہ عربی کے متقبول لغات، اور فارسی کے کسی مستند لغت میں ''مصرعہ'' کسی بھی معنی میں نہیں ملتا۔ غالب نے لکھا ہے: ''تقدیم و تاخیر مصرعتین کر کے رہنے دو'' (بنام جنون بریلوی، مورخہ ۲۴ اگست، ۱۸۶۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مصرعہ'' کو غالب درست سمجھتے تھے اور اسے عربی قرار دیتے تھے، کیونکہ انھوں نے اس کی جمع عربی تثنیہ کے قاعدے سے ''مصرعتین'' بنائی ہے۔ ''آنندراج'' کے ایرانی ایڈیشن میں خان آرزو کا مندرجہ ذیل شعر ''مصرع'' کی سند میں دیا ہے، اور ''مصرع'' کو ''مصرعہ'' لکھا ہے ؎

گر شود فوارۂ نخل مصرعہ ما دور نیست تخم اشکے در زمین شعر می کاریم ما

اس سے گمان گذرتا ہے کہ ''مصرع'' اور ''مصرعہ'' دونوں کے تلفظ میں خان آرزو نے کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ لیکن یہی شعر ''بہار عجم'' میں بھی ہے اور وہاں ''مصرعہ'' نہیں بلکہ محض ''مصرع'' لکھا

ہے۔ شیکسپیر کے لغت میں ''مصرعہ'' موجود ہے، اور اسے عربی بتایا گیا ہے۔ اسٹائنگاس (Steingass) نے بھی اسے درج کیا ہے، لیکن اسے ''عربی سے ماخوذ'' (یعنی ٹکسالی عربی میں نہیں) لکھا ہے۔ ٹامپسن نے صرف 'مصراع' لکھا ہے، گویا وہ ''مصرع/مصرعہ'' کے وجود سے بے خبر ہے۔ ''نور اللغات'' اور ''غیاث'' اور ''آنند راج'' کسی میں ''مصرعہ'' درج نہیں، ہاں ان لغات کی عبارت کے اندر لفظ ''مصراع'' کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ پلیٹس (Platts) نے ''مصرعہ'' درج کیا ہے اور اسے فارسی بتایا ہے۔ یہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ فارسی والوں نے ''مصرع'' پر ہائے ہوز کا اضافہ کر لیا ہے لیکن معنی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

دوسرا مسئلہ تلفظ کا ہے۔ ''مصرع'' ہو یا ''مصرعہ''، اردو میں دونوں کا تلفظ عین کے بغیر (مصرہ) ہے۔ یعنی عین کی جگہ چھوٹی ہ بولتے ہیں، اور چھوٹی ہ کا تلفظ ہائے مختفی کی طرح کرتے ہیں۔ جمع، امالہ، اور مجرور حالت میں بھی عین سنائی نہیں دیتا۔ پرانے لوگ شعر میں اسے بغیر اظہار عین باندھ لیتے تھے، سودا ؎

مصرعوں میں اگر پشۂ معنی ہو قلم بند زعم اپنے میں کھینچے ہیں کیا پیل کو زنجیر

یہاں ''مصرعوں'' کا وزن فعلن یا بروزن ''مصروں'' ہے۔ اگر بعض دیگر نسخوں کی قرأت اختیار کر کے پہلا لفظ ''مصرع'' لکھیں تو اور بات ہے، کہ اس طرح عین کا اظہار ہو جاتا ہے، لیکن روانی بے طرح مجروح ہوتی ہے، یا پھر یہاں ''مصرعے'' لکھا جائے تو بات وہی رہتی ہے جو ''مصرعوں'' لکھنے میں تھی، کہ عین ساقط ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بعض حالتوں میں ''مصرع'' بفتح سوم کی جگہ ''مصرع'' یعنی ''مصرے'' بکسر عین بولا جاتا ہے۔ مثلاً:

اس مصرع میں ایک حرف زائد ہے۔

ان کے مصرع کی خوبی میں کلام نہیں۔

میرے مصرع میں کوئی عیب نہیں۔

مصرع کی ساخت بگڑ گئی۔

وغیرہ۔ ایسے تمام حالات میں لفظ ''مصرع'' کا تلفظ ''مصرے'' ہوگا۔ یعنی اردو والوں نے ''مصرع'' کے عین کو ہائے ہوز فرض کیا اور اس پر امالہ جاری کر دیا، جیسے پردا، پردے؛

کپڑا اکیز ہے، کرو اکرے

کہ ہے زبان کسی کی پابند نہیں، صرف اپنی محکوم ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ''مصرعہ'' غالباً فارسی والوں کا بنایا ہوا لفظ ہے۔ اردو میں اس کا استعمال اب بہت کم ہے۔ لیکن ''مصرع'' ہو یا ''مصرعہ''، ان کے تلفظ میں عین کا اظہار ہمارے یہاں نہیں ہوتا، اور یہی ٹھیک بھی ہے۔

مصطفائی دیکھئے ''الف''۔

مطبل اول سوم مفتوح۔ دلی سے لے کر دور کے پوربی علاقوں تک ''مطلب'' کا عوامی تلفظ ''مطبل'' ہے لیکن یہ پڑھے لکھوں کی زبان پر رائج نہیں۔ دیکھئے ''تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں''۔

مطلع اس لفظ کو بھی ''جمع / مجمعوں؛ موقع / موقعوں'' پر قیاس کر لیجئے، یعنی حالت جمع میں عین کا اظہار نہیں ہوتا۔

معائنہ دیکھئے ''معاینہ''۔

معاینہ عربی قاعدے سے ''عین'' کو باب مفاعلہ میں لے جاتے ہیں اور ''معاینہ'' بفتح تحتانی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اردو میں لوگ بیش از بیش ''معائنہ'' مع ہمزہ اور مع کسرۂ ہمزہ لکھتے ہیں اور یہی درست ہے۔ ''معاینہ'' پہلے بھی بہت کم رائج تھا، اب کئی دہائیوں سے بالکل رائج نہیں ہے۔ اردو کے عمل کے لحاظ سے ''معاینہ'' اب غلط ہے۔

معراج اول مکسور، پہلے زمانے میں مذکر بھی لکھا گیا ہے۔ شیکسپیئر اور پلیٹس نے اسے مذکر و مونث دونوں بتایا ہے۔ ناسخ ؎

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

شیکسپیئر اور پلیٹس کے بیانات کی روشنی میں بعض لوگوں کا یہ قول غلط ثابت ہوتا ہے کہ ناسخ نے جمہور کے خلاف جا کر ''معراج'' کو مذکر باندھا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اب یہ لفظ تقریباً ہمیشہ مونث سنا جاتا ہے۔ میر انیس ؎

کیا عرش الٰہی پہ جگہ آج ملی ہے   کاندھے پہ نبی کے تمھیں معراج ملی ہے

آج کے عمل کے لحاظ سے ''معراج'' کو مذکر برتنا غلط ہے۔

معرکہ آرا دیکھیے: ''معرکۃ الآرا''۔

معرکۃ الآرا بعض لوگ کہتے ہیں کہ عربی کے لحاظ سے یہ مرکب (بمعنی ''نہایت اہم، نہایت اعلیٰ مرتبہ'') غلط ہے، بلکہ بے معنی ہے، کیوں کہ ''رایوں کا معرکہ'' کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بات صحیح ہے، لیکن یہ عربی کا مرکب نہیں، اردو ہے۔ اردو میں عربی فارسی الفاظ پر مشتمل بہت سے مرکبات مع ال لام یا بغیر الف لام بنا لیے گئے ہیں۔ اسی طرح، بہت سے الفاظ بھی ہیں جنھیں عربی قیاس پر فارسی یا دیسی لفظ سے مشتق کر لیا گیا ہے۔ یہ سب اردو ہیں اور اردو میں رواج عام کی سند انھیں حاصل ہے۔ ان کو غلط قرار دینا، یا انھیں ترک کرنا، غیر مناسب ہے۔ بعض لوگ ''معرکہ آرا'' کو درست اور ''معرکۃ الآرا'' کو غلط قرار دیتے ہیں، حالانکہ لغوی معنی کے اعتبار سے دونوں ہی غلط ہیں۔ بہر حال، اس وقت دونوں ہی لفظ رائج ہیں اور دونوں کو صحیح سمجھنا چاہیے۔

معلوم چلنا یہ محاورہ آج کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی زبان پر کثرت سے ہے، حالانکہ یہ نہ اردو ہے نہ ہندی۔ ''معلوم ہونا، پتہ لگنا، خبر لگنا'' وغیرہ بہت سے مناسب محاوروں کے ہوتے ہوئے ''معلوم چلنا'' کی کوئی ضرورت نہیں۔

معمل انگریزی لفظ Laboratory کے لیے لفظ ''معمل'' بنایا گیا تھا لیکن مقبول نہ ہو سکا۔ پھر بھی تحریری زبان کی حد تک میں اسے Laboratory پر ہر جگہ ترجیح دوں گا۔

معنی
یہ لفظ واحد ہے، لیکن اسے استعمال مثل جمع کرتے ہیں:

غلط: مجھے اس لفظ کا معنی نہیں معلوم۔

صحیح: مجھے اس لفظ کے معنی نہیں معلوم۔

غلط: معنی وہی ٹھیک ہے جو غالب نے لکھا ہے۔

صحیح: معنی وہی ٹھیک ہیں جو غالب نے لکھے ہیں۔

صحیح: اس لفظ کے جو معنی آپ نے بیان کیے ان کو میرے معنی پر تفوق ہے۔

لیکن اب اسم اشارہ ''اِس'' اور ''اُس'' کے ساتھ ''معنی'' کو واحد بولنا بہتر ہے:

مناسب: یہ بات اس معنی میں غلط ہے کہ۔۔۔

مناسب: جو معنی آپ بتا رہے ہیں اس سے مجھے اختلاف ہے۔

ملحوظ رہے کہ اصل کے اعتبار سے اس لفظ میں الف مقصورہ ہے [معنیٰ] لیکن اب یہ تقریباً ہمیشہ اس طرح بولا جاتا ہے گویا آخری حرف الف مقصورہ نہیں، چھوٹی ی ہو۔ دلی میں البتہ ''معنی'' بروزن ''مانا'' بھی بولتے ہیں۔ بعض لوگ یائے مجہول کے ساتھ ''معنے'' بولتے ہیں۔ اس تلفظ کی کوئی سند نہیں۔ ہندی میں یہی لفظ ''مانے'' بن گیا ہے۔ ہندی کے اثر سے بعض اردو والے بھی ''مانے'' بولنے لگے ہیں۔ اسے فوراً ترک ہونا چاہئے۔ بعض لوگ جمع ظاہر کرنے کے لئے ''معانی'' بولتے ہیں۔ یہ غیر ضروری ہے۔ جب تک کہ کوئی خاص بات نہ ظاہر کرنی ہو، ''معانی'' کے استعمال سے محترز رہنا چاہئے۔ جیسے اقبال کے ان شعروں میں ''معانی'' نہایت خوبی سے برتا گیا ہے ؎

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت   جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا   اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی

دیکھئے: ''الف''۔

معنیٰ کر   بمعنی ''معنی میں، مطلب سے'' یہ دہلوی اور پوربی اردو کا روزمرہ ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس فقرے میں ''معنی'' مع الف مقصورہ بروزن ''مانا'' بولتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں ''کر'' کے خاص معنی ہیں۔ دیکھئے: ''وجہ کر''۔

مفلوک الحال   اردو والوں نے ''فلک'' کے استعاراتی معنی (''ظالم ہستی، انسانوں کو دکھ دینے والی اور انصاف نہ کرنے والی ہستی'') کو لغوی معنی قرار دیا، پھر ''جماعۃ، شہادۃ، اشارۃ'' وغیرہ سے قیاس کر کے ایک مصدر ایجاد کیا، ''فلاکۃ/فلاکت''۔ اسے اردو میں ''مصیبت، پریشانی'' کے معنی دیئے گئے اور پھر ''فلاکت زدہ'' جیسے الفاظ بنائے گئے۔ اس پر بھی بس نہ کر کے ملک/مملوک وغیرہ سے غلط قیاس کر کے ہم لوگوں نے **فلک/مفلوک** بنایا۔ پھر لطف یہ کہ ''مفلوک'' کو تنہا کبھی استعمال نہیں کیا، لیکن اس فرضی عربی لفظ کو مع الف لام مرکب کر کے ''مفلوک الحال'' بنا لیا، بمعنی ''جس کا حال [مالی یا سماجی اعتبار سے] بہت پست یا تحت ہو۔''

آفریں ہے اس قوت ایجاد و ابداع پر۔ جو لوگ ''فلاکت'' اور ''مفلوک الحال'' کو اس بنا پر مسترد کرتے ہیں کہ یہ عربی میں نہیں ہیں، وہ اردو پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ یہ لفظ اردو ہیں اور نہایت پاکیزہ اردو ہیں، عربی میں ہیں یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

مکھوٹا بمعنی ''نقلی چہرہ''۔ یہ لفظ ''شیکسپیئر'' میں نہیں ہے، نہ پلیٹس میں اور نہ ''نور اللغات'' میں، حتیٰ کہ ہندی کے وسیع و عریض لغت ''شبد ساگر'' میں بھی اس کا پتہ نہیں۔ مجھے یہ صرف اسٹوارٹ میک گریگر (Stuart McGregor) کی (Oxford Hindi-English Dictionary) میں ملا۔ یہ لفظ اب ہندی میں رائج ہو رہا ہے، اور افسوس کہ بعض اردو والے بھی اسے اختیار کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ جس معنی میں یہ لفظ ہندی میں بولا جانے لگا ہے، اسے ظاہر کرنے کے لیے اردو میں حسب ذیل لفظ موجود ہیں:

نقاب، چہرہ، نقلی چہرہ، بیجا (یائے معروف، خاص کر ذراونے چہرے کے معنی میں)۔

اتنے بہت سے عمدہ الفاظ کے ہوتے ہوئے اردو والے اگر ''مکھوٹا'' بولیں تو اپنی زبان کے ساتھ زیادتی کریں گے۔

مکھی یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ بچوں کی زبان سے کبھی کبھی ''مکھا'' بمعنی ''بڑی مکھی'') سننے میں آیا ہے، لیکن عام زبانوں پر نہیں ہے۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

مکین ''رہنے والا'' کے معنی میں یہ لفظ اردو والوں کا گھڑا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ فارسی میں ''مکین'' زمانہ قدیم سے ''رہنے والا'' کے معنی مستعمل ہے۔ ''دہخدا'' میں کئی شواہد فرخی سیستانی کے درج ہیں جن میں سے پہلا یہ ہے ۔

نہ ہر کس کو بہ ملک اندر مکیں باشد ملک باشد نہ نیلوفر بود ہر گل کہ اندر آبداں باشد

یہی معنی اردو میں بھی ہیں۔ ''منتخب'' کے بقول عربی میں اس کے معنی ہیں ''بلند منزلت''، وغیرہ۔ اردو میں یہ معنی کہیں نہیں نظر آئے۔ اردو میں ''مکان و مکیں''، ''مکین و مکاں'' وغیرہ عام ہیں۔

مگرمچھ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تانیث سے عاری نام،

جانوروں کے''۔

مگس اول دوم مفتوح، بمعنی ''مکھی''۔ فارسی میں یہ ہر طرح کی مکھی کے لئے آتا ہے، مثلاً شہد کی مکھی کو بھی وہاں ''مگس'' کہتے ہیں۔ اردو شعر میں ''مگس'' کو بھی ''شہد کی مکھی'' کے معنی میں بکار لاتے تھے، اب نہیں دیکھا گیا۔ یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھئے، ''تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ملازمت عربی میں چہارم مفتوح ہے، لیکن اردو میں چہارم مکسور رائج ہے۔ پرانی اردو میں اس لفظ کے ایک معنی 'ملاقات' بھی تھے اور اسے اس موقعے کے لئے برتتے تھے جب کوئی چھوٹا کسی بڑے کی خدمت میں رسومیاتی طور پر حاضر ہو۔ ''ملازم'' کے اصل معنی ہیں: ''کسی کے ساتھ پیوستہ رہنے والا''۔ چونکہ نوکر ہمیشہ اپنے مالک کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتا ہے، لہٰذا اردو والوں نے ''ملازم'' کو ''نوکر'' کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا اور پھر اس کی تانیث ''ملازمہ'' بھی بنالی۔ اسی طرح، ''نوکری'' کے معنی میں ''ملازمت'' رائج ہوا۔ یہ سب معنی عربی میں نہیں ہیں۔ ''ملازمہ'' کی جمع ''ملازمیں/ملازمائیں'' دونوں سنی گئی ہیں۔

ملبب بمعنی ''لبالب''۔ میر حسن ؎

ملبب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر پڑے چشمۂ ماہ میں جس سے لہر

دیکھئے، ''مریب''۔

ملجا اول مفتوح، بمعنی ''گھر، جائے پناہ''۔ عربی میں الف مقصورہ سے ''ملجیٰ'' ہے۔ اردو میں الف ہی سے صحیح ہے۔ ''ملجا و ماوا'' کا فقرہ اردو میں یوں بھی الف سے لکھا جاتا ہے۔ ''مسدس حالی'' کی مشہور نعتیہ بیت ہے ؎

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا یتیموں کا والی غلاموں کا مولا

ملکۂ عالیہ دیکھئے، ''مہارانی''۔

ملہم اول سوم مفتوح، بمعنی ''مرہم''، فارسی میں ہے۔ مشرقی علاقوں میں بھی یہ لفظ (یا ''مرہم'' کا یہ تلفظ) عام ہے۔ مشرقی علاقوں میں رائے مہملہ کو لام سے بدلنے کا کچھ رجحان ہے، لہٰذا عام خیال ہے کہ ''ملہم'' میں بھی یہی ہوا ہوگا۔ لیکن چونکہ فارسی میں ''مرہم'' کے علاوہ ''ملہم'' اور

''ملغم'' بھی تھی، اس لئے ممکن ہے اہل مشرق نے یہ لفظ سیدھا فارسی سے اٹھایا ہو۔ فارسی کے بعض قدیم لغات، مثلاً ''قواس''، ''زفان گویا''، اور ''سرمۂ سلیمانی'' میں ''ملغم'' بروزن ''بلغم'' بمعنی ''مرہم'' درج ہے۔ ''موید الفضلا'' میں ''ملغم'' اور ''ملہم'' اسی تلفظ کے ساتھ بمعنی ''مرہم'' لکھے ہوئے ہیں۔ ''بہار عجم'' اور ''غیاث'' میں بھی ''ملہم'' بمعنی ''مرہم'' موجود ہے۔ ایسی صورت میں ''نور اللغات'' کی یہ رائے کہ ''ملہم'' غیر فصیح یعنی ''عوامی (= عامیانہ)'' ہے، درست نہیں معلوم ہوتی۔

ملین انگریزی میں اوسط درجے کی بڑی گنتی کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ ان کے یہاں بڑی گنتی کا پہلا لفظ Million ہے جو ''دس لاکھ'' کے معنی دیتا ہے۔ اس کے بعد Billion ہے، جس کے معنی ''ہزار ملین، یا دس ہزار لاکھ'' (امریکہ) یا (شاذ، لیکن برٹش انگریزی میں) ''دس لاکھ دس لاکھ'' ہیں۔ ان کے برخلاف، متوسط بڑی گنتیوں کے لئے ہمارے یہاں ''لاکھ'' (سو ہزار) اور ''کروڑ'' (سو لاکھ) ہیں۔ بڑی گنتی کے لئے ہمارے یہاں پہلا لفظ ''ارب'' (سو کروڑ) ہے۔ ظاہر ہے کہ (مثلاً) ''ستاون لاکھ سرسٹھ ہزار'' کہنا اور سمجھنا آسان ہے، بہ نسبت ''پانچ اعشاریہ سات چھ سات ملین'' (5.767 Million) کہنے کے۔ لیکن نہ معلوم کس وجہ سے پاکستان میں لاکھ اور کروڑ کی جگہ ''ملین'' رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بعض اہل ہند بھی اس معاملے میں پاکستان کی نقل کرتے ہیں۔ ''ملین'' غیر زبان کا لفظ ہے، اور ہمارے یہاں اس کے معنی کو بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر وسائل موجود ہیں۔ پھر ''ملین'' کو ٹھونسنے اور تین اچھے خاصے لفظوں کو جلا وطن کرنے میں کس کا فائدہ ہے؟

منتہا اول مضموم، سوم مکسور، بمعنی ''انتہا کی جگہ، یا نقطہ''۔ عربی میں الف مقصورہ سے ''منتہیٰ'' ہے، لیکن اردو میں سیدھے الف ہی سے درست ہے۔ ہاں ''سدرۃ المنتہیٰ'' میں الف مقصورہ ہی درست ہے۔

منڈراتا اردو میں ''منڈلاتا'' ہے۔ ہندی والے ''منڈراتا'' بولتے ہیں، لیکن اردو میں اس طرح بولنے کا کوئی جواز نہیں۔

منش اول مفتوح، دوم مکسور، بمعنی ''مزاج، طینت، خو''۔ یہ لفظ پرانی فارسی کا ہے اور اب

ہمارے یہاں صرف لاحقے کے طور پر برتا جاتا ہے، یعنی اکیلا ''منش'' آج کل بھی نہیں بولا جاتا۔ عبدالرشید نے کئی پرانی مثالیں فراہم کی ہیں جن میں تنہا ''منش'' وارد ہوا ہے۔ لہٰذا صحیح صورت حال یہ ہے کہ پہلے ''منش'' تنہا بھی بولتے تھے لیکن اب تنہا نظر نہیں آتا۔ ہر چند کہ لاحقے کی حیثیت سے اس کے پہلے کوئی لفظ آسکتا ہے جس کے ساتھ ''منش'' معنوی اعتبار سے درست ہو، لیکن اردو میں اس لاحقے کے ساتھ سب سے زیادہ مستعمل لفظ ''صوفی منش'' ہے، پھر ''آزاد منش۔'' ان کے علاوہ حسب ذیل بھی مانوس و مستعمل ہیں:

آوارہ منش، بیگانہ منش، فرشتہ منش، فقیر منش، نیک منش، وغیرہ۔

بیدار بخت کہتے ہیں کہ اختر الایمان ہمیشہ ''منش'' بفتحِ سین بولتے تھے۔ بیدار بخت مزید کہتے ہیں کہ انھوں نے بھی یہ لفظ یوں ہی سنا ہے۔ ایسی صورت میں بفتحِ سین تلفظ کو دہلی اور مغربی یو پی سے مخصوص سمجھا جائے گا۔

منع کرنا ''انکار کرنا'' اور ''منع کرنا'' الگ الگ عمل ہیں۔ ''انکار کرنا'' کے معنی ہیں ''کسی کام کو کرنے پر رضامند نہ ہونا، کسی چیز کو ماننے یا قبول کرنے پر راضی نہ ہونا۔''

صحیح: حامد نے صبح کو آنے سے انکار کر دیا۔

صحیح: حامد نے اس بات سے انکار کیا کہ اس نے روپے لیے تھے۔

صحیح: حامد کا انکار اور دوسروں کا اقرار ایک ہیں۔

صحیح: حامد نے فی الحال شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا جملوں میں ''انکار'' جن معنی میں برتا گیا ہے، آج کل بعض لوگ ان معنی کو بیان کرنے کے لیے ''منع'' استعمال کرتے ہیں:

غلط: حامد نے صبح کو آنے سے منع کر دیا۔

غلط: حامد نے اس بات سے منع کیا کہ اس نے روپے لیے تھے۔

غلط: حامد کا منع کرنا اور دوسروں کا اقرار ایک ہیں۔

غلط: حامد نے فی الحال شادی کرنے سے منع کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا تمام جملوں میں ''منع'' کو ''انکار'' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔

منگوایے بمعنی ''میں منگواؤں / ہم منگوائیں''۔ مضارع کا یہ استعمال دلی کا روزمرہ ہے۔ قائم چاندپوری ؎

شیخ جی رات اندھیری میں تم آئے ہو یہاں آپ کے واسطے گر امر ہو منگوایے شمع

فعل کی یہ شکل سمجھنے میں اکثر لوگوں کو تردد ہوا ہے۔ دیکھیے ''دکھلایے''؛ ''ڈھونڈیے''؛ ''سنایے''؛ ''کیجے''۔

منھ اس لفظ کو کئی طرح لکھا جاتا رہا ہے، منھ، منہ، موں، مونہہ، مونھ، وغیرہ۔ دلی والے کچھ عرصہ پہلے تک عام طور پر ''مونہہ'' یا ''مونھ'' لکھتے تھے۔ قاعدے کے اعتبار سے ''منہ'' کو صحیح ترین املا کہنا چاہیے۔ لیکن رواج عام کا رجحان ''منھ'' کی طرف ہے۔ ''منہ'' بھی بہت دنوں سے رائج ہے لیکن میں ''منھ'' کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ میرے مشاہدے کے مطابق ''منھ'' لکھنے والے اکثریت میں ہیں۔ لیکن میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ آپ جو املا اختیار کرلیں اسی پر قائم رہیں۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' جیسے عظیم لغت میں ''منہ'' اور ''منھ'' کو بے دریغ خلط ملط کیا گیا ہے۔ یہ عمل گمراہ کن ہے۔

منھ زور ضدی گھوڑا یا ایسا گھوڑا جو سوار کے قابو میں نہ آئے، ''منھ زور'' کہلاتا ہے۔ دیکھیے: ''گھوڑے کے پانچ عیب''۔

موجہ اس لفظ میں ہائے ہوز اصلی ہے۔ اردو فارسی میں یہ اور ''موج'' ہم معنی ہیں۔ لیکن عربی میں دونوں کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اردو میں یہ لفظ مرکب ہی دیکھنے میں آیا ہے، اگرچہ مفرد استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ ظاہر ہے کہ ''آوازہ'' کی طرح ''موجہ'' بھی اردو میں مذکر ہے، لیکن ناصر کاظمی نے اسے مونث لکھا ہے ؎

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

حق یہ ہے کہ ''موجہ'' یہاں مونث اس قدر اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اسے مذکر میں بدلنا ظلم معلوم ہوتا ہے۔

مور بمعنی ''چیونٹی''، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھیے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

مورد اول مفتوح، سوم مکسور۔ اس لفظ کے معنی ہیں: ''وارد ہونے کی جگہ''۔ لہٰذا اردو میں یہ کسی چیز کے لائق ہونے، یا کسی چیز کے لئے مناسب ہونے کے لئے آتا ہے۔ مثلاً: ''الزام کا مورد ہونا''، یا ''التفات کا مورد ہونا''، ''سزا کا مورد ہونا''، وغیرہ۔ بعض لوگ اس کا تلفظ واؤ معروف سے بروزن ''موجب'' کرتے ہیں لیکن صحیح تلفظ اول مفتوح کے ساتھ بروزن ''قوری'' ہے۔ ابھی واؤ معروف کے ساتھ تلفظ عام نہیں ہوا ہے، لہٰذا اول مفتوح ہی کے ساتھ بولنا انسب ہے۔

موسائی بمعنی ''دین موسوی کا ماننے والا''۔ دیکھئے: ''الف''۔

موسیٰ دیکھئے: ''عیسیٰ''۔

موسیقار ایک فرضی چڑیا کا نام۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں ایک ہزار سوراخ ہوتے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

موسیقی اول مضموم معروف، دونوں یائے معروف۔ کچھ لوگ اول مفتوح بولتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔

موقع دیکھئے: ''موقف''۔

موقف اول مفتوح، سوم مکسور۔ اس لفظ کے معنی ہیں: ''ٹھہرنے کی جگہ''۔ لہٰذا اردو میں یہ Position، یعنی کسی بات پر کسی کا مطمح نظر، کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً:

صحیح: اس معاملے میں حکومت کا موقف یہ ہے۔۔۔

صحیح: چاہے کچھ ہو جائے لیکن میں اپنے موقف سے ہٹوں گا نہیں۔

صحیح: زبان کے معاملے میں وہ اپنا موقف بدلتے نہیں تھے۔

اس لفظ کو بعض لوگ سوم مفتوح سے بروزن ''موقع'' ادا کرتے ہیں۔ یہ تلفظ ابھی عام نہیں ہوا ہے، لہٰذا انسب ہے کہ اسے سوم مکسور سے بروزن ''مولد'' ادا کیا جائے۔

موقعہ اس لفظ کو بھی ''مصرعہ'' کی طرح سمجھئے، اس فرق کے ساتھ کہ ''مصرعہ'' فارسی میں ہے لیکن ''موقعہ'' فارسی میں نہیں ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہیں ''جنگ کا مقام، جنگ'' وغیرہ۔ جمع اس کی بھی ''مواقع'' ہے۔ شاید اسی بنا پر اردو میں ''موقعہ'' بھی بمعنی ''موقع'' رائج ہو گیا۔ جمع کی

صورت میں ''موقعے''، ''موقعوں''، امالہ کی صورت میں ''موقعے'' اور مجرور صورت میں علی حالہ لکھتے ہیں، یا ''موقعے'' لکھتے ہیں، مثلاً ''موقعے کی تلاش''، یا ''اس موقعے پر''، وغیرہ۔ ''موقع'' کے معنی میں اس لفظ کی عمر بہت نہیں ہے۔ یہ نہ ''نور اللغات'' میں ہے اور نہ پلیٹس میں۔ ''فیروز اللغات، جامع'' (لاہور، ۱۹۸۸) میں بھی نہیں۔ شان الحق حقی کی ''فرہنگ تلفظ'' (اسلام آباد 1995) میں البتہ درج ہے۔ انھوں نے اس کا تلفظ ''موقعہ'' (اول، سوم، چہارم مفتوح) دیا ہے، جو عوام کی زبان پر نہیں ہے۔ ''موقع'' کی جمع ''موقعوں'' بے اعلان نون مستعمل ہے۔

مولا عربی میں الف مقصورہ سے ہے، لیکن اردو میں سیدھے الف ہی سے درست ہے۔

مولد بمعنی ''پیدا ہونے کی جگہ''، اس لفظ کا صحیح تلفظ اول مفتوح اور سوم مکسور کے ساتھ بروزن ''موقف'' ہے، لیکن اسے سوم مفتوح کے ساتھ بروزن ''موقع'' بھی بولا جانے لگا ہے۔ فی الوقت دونوں تلفظ درست مانے جائیں گے۔

مومیا واو مجہول، بمعنی ''دوا یا مرہم جس سے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ جاتی ہے۔'' ذوق ؎

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر   شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

مومیائی واو مجہول، بمعنی ''مومیا''۔ ''مومیا'' میں چھوٹی ی مزید علیہ کر کے ''مومیائی'' بھی بولتے ہیں، اقبال ؎

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست   مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر

''جسم کی مومیائی نکلنا'' وغیرہ محاوروں میں ''مومیائی'' بمعنی ''چربی'' ہے، مثلاً ''وہاں اس قدر گرمی تھی کہ جسم کی مومیائی نکلی آتی تھی۔''

مونث حقیقی دیکھیے: ''حامل''۔

مونث معنوی دیکھیے: ''حامل''۔

مہارانی اردو میں یہ لفظ ''مہاراجہ کی بیوی'' کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے ''مہارانی پٹیالہ''۔ بعض لوگ اسے انگریزی Empress کا مرادف سمجھ کر ''انگلینڈ کی مہارانی''، ''روس کی مہارانی'' وغیرہ لکھنے لگے ہیں۔ یہ بالکل غلط اور قبیح ہے۔ اردو میں Empress کا ہم معنی کوئی لفظ

نہیں۔ "ملکہ" یہاں دونوں الفاظ Queen اور Empress کے لئے مروج ہے۔ اگر کسی کو بہت شوق ہو تو وہ Empress کے لئے "ملکۂ عالیہ" لکھ سکتا ہے۔

مہلوک "وہ جو ہلاک کیا گیا/ ہوا، ہلاک کئے گئے/ ہلاک ہوئے" کے معنی میں یہ لفظ بعض اخباروں نے رائج کرنا چاہا ہے، لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو میں لفظ "ہلاک" ہی فاعلی اور مفعولی معنی دیتا ہے۔ "مہلوک" غیر ضروری اور موضوعی لفظ ہے۔ "مہلوک" اس سے بھی زیادہ قبیح اور بدصورت ہے۔ اگر عربی بگھارنے کا بہت ہی جی چاہے تو "مستہلک" کہیے، ورنہ "ہلاک" بہت کافی ہے:

غلط: زلزلے میں ہزاروں مہلوک ہوئے۔

صحیح: ۔۔۔ ہلاک ہوئے۔

صحیح لیکن نامناسب: ۔۔۔ مستہلک ہوئے۔

غلط: مہلوکین کی تعداد کا پتہ نہ چل سکا۔

مناسب اور صحیح: ہلاک ہونے والوں۔۔۔

صحیح لیکن نامناسب: مستہلکین۔۔۔

غلط اور قبیح: حادثے میں ایک عورت کی موت ہوگئی، مہلوکہ کا نام نہ معلوم ہو سکا۔

صحیح لیکن نامناسب: ۔۔۔ مستہلکہ کا نام۔۔۔

مناسب اور صحیح: ۔۔۔ مرنے والی کا نام۔۔۔

اسی طرح، "ہلاک" میں "مارنا، مارا جانا" کے معنی خود موجود ہیں، میر ؎

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں یارب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں

بعض لوگوں نے "ہلاکت" ایک غیر ضروری لفظ بنا لیا ہے۔ یہ ابھی ہر جگہ رائج نہیں ہوا ہے، اگر ترک ہو سکے تو بہتر ہے۔

میت اول مفتوح، دوم مفتوح مشدد، بمعنی "لاش"۔ دیکھیے "طیب"۔

میوۂ شباب دیکھیے "شباب"۔

مینا اول مفتوح، ایک مشہور چڑیا، یہ لفظ ہمیشہ مونث ہے، اس کا مذکر کچھ نہیں۔ دیکھیے،

"تذکیر سے عاری نام، جانوروں کے"۔ ملحوظ رہے کہ "مینا" مع اول مکسور اور یاے معروف بمعنی "شراب کی صراحی یا جام" بھی مذکر ہے۔ اقبال نے مونث باندھا ہے اور حق یہ ہے کہ بہت اچھا لگتا ہے۔

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی شیخ کہتا ہے کہ وہ بھی ہے حرام اے ساقی

لیکن اسے "پرہیز" (مونث) کی طرح اقبال کا تصرف کہنا چاہئے۔ سونے کے زیور یا برتن پر جو نیلا سبز کام کرتے ہیں، ان معنی میں بھی "مینا" مذکر ہے۔

ناچار دیکھئے: "لاچار"۔

نادر و نایاب "نادر" کے معنی ہیں: "کمیاب، کم، عجیب"، اور "نایاب" اس چیز کو کہتے ہیں جو ملتی نہ ہو، یا جس کا حصول ممکن نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بیک وقت نادر اور نایاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن افسوس کہ بعض تجربہ کار اہل قلم بھی اب جوش بیان میں "نادر و نایاب" لکھنے لگے ہیں۔

غلط: کلیات نظیری کا ایک نادر و نایاب نسخہ ملا۔

صحیح: ۔۔۔نادر نسخہ۔۔۔

غلط: گذشتہ صدی کے کچھ نادر و نایاب رسالے دیکھے۔

صحیح: ۔۔۔نادر رسالے۔۔۔

صحیح: اس کتاب کا اول ایڈیشن نادر تو تھا ہی، اب مدت سے نایاب ہے [یعنی پہلے تو کہیں مل بھی جاتا تھا، اب کہیں نہیں ملتا]۔

ناراضگی بعض لوگوں کے خیال میں عربی لفظ "ناراض" پر فارسی علامت فاعلی "گی" لگانا ٹھیک نہیں۔ صحیح لفظ "ناراضی" ہے۔ لیکن اس حساب سے تو "ناراض" خود غلط ہے، کہ "نا" فارسی میں علامت نفی ہے، عربی میں نہیں۔ پھر عربی "راض" پر فارسی "نا" کہاں سے آئی؟ اس پر مزید یہ کہ عربی کے لحاظ سے "راض" کوئی لفظ نہیں۔ یا "راضِ" ہوگا، یا "راضی" ہوگا۔ جب یہ معاملہ ہے تو پھر "ناراض" اتنا ہی "غلط" ہے جتنا "ناراضگی" ہے۔ غیر زبان کے قاعدے اپنی زبان پر منطبق کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی لفظ یا استعمال کسی غیر زبان میں غلط ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اردو میں بھی غلط ٹھہرایا جائے۔ غلط سلط یا غیر ضروری الفاظ اور

استعمالات جو لاعلم یا لاپروا لوگ زبان میں ٹھونستے رہتے ہیں ان کی مخالفت جم کر ہونی چاہئے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ جو لفظ یا استعمال زبان میں رائج ہو گیا، وہ رس بس کر ہمارا اور ہم جیسا بن گیا ہے۔ اس کو "غلط" کہہ کر ذلیل نہ کیا جائے۔ "ناراضگی" اردو میں رائج ہو گیا ہے اس لئے بالکل صحیح ہے۔ وحید قریشی کا کہنا ہے کہ "ناراض" کا آخری حرف ہائے مختفی بھی نہیں کہ ہائے ہوز کو قطع کر کے اور گاف و یائے تحتانی بڑھا کر اس کا اسم فاعل بنایا جائے۔ وہ پوچھتے ہیں، کیا "درنگی" بھی صحیح مانا جائے گا؟ لیکن یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ قواعد اور لغت دونوں اعتبار سے "ناراضگی" غلط ہے۔ لیکن رواج عام کو ہر چیز پر تفوق ہے۔ "ناراضگی" بہر حال رائج ہو گیا ہے۔ "درنگی" بعض لوگ لکھتے ضرور ہیں، لیکن وہ ابھی رائج نہیں ہوا، لہٰذا غلط ہے۔

ناموسی قتل دیکھئے: "آنر کلنگ"

ناول دیکھئے: "جنس، غیر زبانوں کے الفاظ کی"۔

نزاکت یہ لفظ عربی میں نہیں ہے، فارسی والوں نے "ہلاکت، لطافت" وغیرہ کے قیاس پر بنالیا ہے اور اب اردو میں بھی رائج ہے۔ عربی میں یہ غلط ہے، لیکن اردو میں بالکل صحیح ہے۔ "تمازت" کی طرح اسے بھی مرکب استعمال کیا جا سکتا ہے، مومن ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں　　اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

میرا خیال تھا کہ "نزاکت" اختراع اردو ہے لیکن جناب عقیل الغروی نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ یہ لفظ فارسی میں موجود ہے۔

نزدیکی بمعنی "ہم بستری"۔ یہ غالباً عربی کے لفظ "مقاربت" کے اصطلاحی معنی ("ہم بستری") سے قیاس کر کے بنایا گیا ہے:

> فرامرز ثانی نے۔۔۔ ملکہ سے مدعائے دلی حاصل کیا۔۔۔ بعد نزدیکی، آب چشمہ سے دونوں نے غسل کیا، پھر نماز شکر پڑھی ("گلستان باختر"، جلد سوم، از شیخ تصدق حسین، ص ۳۲۴)۔

نسبی عزیز جب دو شخصوں کے درمیان کوئی پیدائشی رشتہ داری ہو تو وہ ایک دوسرے کے نسبی عزیز یا نسبی رشتہ دار کہلاتے ہیں۔ مثلاً عم زاد بھائی بہن، خالہ زاد بھائی بہن، یا اس سے بھی دور کی

قرابت رکھنے والے آپس میں نسبی عزیز کہلائیں گے، خواہ ان کی قرابت کی وجہ پیدائش ہو، شادی نہ ہو۔ مثلاً میاں بیوی ایک دوسرے کے نسبی عزیز نہ ہوں گے، بشرطیکہ ان میں نسبی عزیز داری شادی کے پہلے ہی سے نہ ہو (مثلاً عم زاد بھائی بہن کی آپس میں شادی ہو جائے تو ان میں شادی کی رشتہ داری کے علاوہ نسبی رشتہ داری بھی ہو گی۔) ایسی عزیز داری جو شادی کے سبب سے قائم ہو، ''سببی'' عزیز داری کہلاتی ہے۔ مثلاً غالب اور خاندان لوہارو میں سببی عزیز داری تھی، یعنی امراؤ بیگم سے جب غالب کی شادی ہوئی تو وہ خاندان لوہارو کے عزیز دار ٹھہرے، پہلے ان میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ لیکن خاندان لوہارو کی اولاد ہونے کے سبب لوہارو خاندان سے ضیاء الدین خاں نیر کی عزیز داری نسبی تھی۔ نسبی عزیز داری براہ راست ہوتی ہے اور سببی عزیز داری ''نسبتی'' ہوتی ہے۔ اسی لئے بیوی کے بھائی کو ''برادر نسبتی'' یا ''برادر نسبت'' کہتے ہیں۔

نشا خاطر اول مکسور۔ ''مطمئن، تسلی کی کیفیت، خاطر نشیں'' کے معنی میں ''خاطر نشاں'' اور ''نشاں خاطر'' فارسی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی۔ لیکن ان معنی میں ''نشا خاطر'' صرف اردو ہے۔ ''نور اللغات'' میں اس کا اندراج کر کے لکھا ہے، ''عورتوں کا محاورہ''، اور امداد علی بحر کا شعر نقل کیا ہے۔ اثر لکھنوی کہتے ہیں کہ یہاں ''نشاں خاطر'' رہا ہوگا، جسے صاحب ''نور اللغات'' نے ''نشا خاطر'' پڑھ لیا۔ میں نے امداد علی بحر کا دیوان دیکھا تو اثر صاحب کی بات ٹھیک پائی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ''نشا خاطر'' کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ''نور اللغات'' میں تو ہے ہی، ''آصفیہ''، پلیٹس، اور فیلن میں بھی موجود ہے۔ پلیٹس نے لفظ ''نشا'' کا اندراج الگ سے بھی کیا ہے۔ فیلن نے ''نشا خاطر'' کو ''عورتوں اور جہلا'' کی زبان کہا ہے، لیکن استعمال کی ایسی مثالیں بھی لکھی ہیں جنھیں جہلا کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔

نشتر زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ لفظ ''نیشتر'' کا مخفف ہے اور اس کا تلفظ اول مکسور سے ہی ہونا چاہئے۔ شان الحق حقی، ''آنندراج''، ''غیاث'' سب نے اول مکسور لکھا ہے اور کوئی متبادل تلفظ نہیں درج کیا۔ ''نور'' نے البتہ اول مکسور لکھ کر کہا ہے کہ اول مفتوح ''عام'' ہے۔ میں نے اسے زیادہ تر اول مفتوح سنا ہے۔ تقسیم ہند کے پہلے مشہور مسلم لیگی رہنما سردار عبد الرب نشتر کے نام میں ''نشتر'' ہمیشہ اول مکسور بولا جاتا تھا، لیکن جو لوگ [نشتر] نام کو اول مکسور بولتے تھے ان کو

بھی میں نے لفظ ''نشتر'' کو اول مفتوح کے ساتھ بولے سنا ہے۔ میرے بزرگ بھی بفتح اول ''نشتر'' ہی بولتے تھے۔ ''نشتریت'' جو اردو والوں کا بنایا ہوا لفظ ہے، اس میں ہمیشہ اول مفتوح سنا گیا ہے۔ فی الحال ''نشتر'' کو اول مفتوح اور اول مکسور دونوں طرح صحیح کہنا چاہئے۔ ''نشتریت'' میں البتہ اول مفتوح ہی مرجح ہے۔ دیکھئے: ''نیشتر''۔

نشتریت دیکھئے: ''نشتر''۔

نشست فارسی میں اول مکسور اور دوم مفتوح ہے۔ سعدی کے مشہور قطعے کے دو شعر ہیں ؎

بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

امیر خسرو کہتے ہیں ؎

وز پس اسپاں صف پیلان مست ابر و ہوا کردہ بہ صحرا نشست

''نور اللغات'' کے سوا تمام اردو لغات میں بھی ''نشست'' بکسرۂ اول و بفتحۂ دوم لکھا ہے۔ ''نور'' میں اول دوم دونوں مفتوح لکھے ہیں۔ یہ تلفظ اب کہیں سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے لکھنؤ میں ستر اسی برس پہلے بولتے ہوں۔ شان الحق حقی نے ''فرہنگ تلفظ'' میں اول دوم دونوں مکسور لکھے ہیں۔ شاید اہل دہلی کا یہ تلفظ کبھی تھا، اب تو دہلی والے اس سے واقف نہیں۔ دہلی میں اب بھی لوگ اس لفظ کو اول مفتوح اور دوم مکسور کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہی تلفظ اور علاقوں میں بھی لوگوں کی زبان پر ہے اور یہی مرجح ہے۔ کوئی اسے اول مکسور اور دوم مفتوح کے ساتھ بولے تو اسے غلط نہیں کہا جائے گا، لیکن نامناسب، یا غیر مروج تلفظ ضرور کہا جائے گا۔ اس تلفظ پر اصرار کرنا غلط ہے، آج کے اعتبار سے صحیح تلفظ بفتح اول اور بکسر دوم ہی ہے۔

نصیبہ عربی ''نصیب'' پر فارسی کے طرز میں ہائے ہوز کا اضافہ اردو والوں نے کرکے ''نصیبہ'' بنالیا ہے۔ فارسی میں ''نصیبہ'' نہیں ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں اسے الف سے لکھنا چاہئے، لیکن یہ محض زیادتی ہے۔ فارسی اردو میں ایسے کئی لفظ رائج ہیں جن میں فارسی والوں نے ہائے ہوز بڑھائی ہے، مثلاً ''موج/موجہ''؛ ''غرق/غرقہ''۔ پھر ہم لوگ اگر ''نصیب/نصیبہ'' بنالیں تو اس میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ اگر معاملہ ہائے مختفی کا ہے، تو بھی ''نصیبہ'' کو الف سے لکھنے کا کوئی حقیقی جواز

نہیں۔ دیکھئے ''آوازہ'' ؛ دیکھئے ''ہائے مختفی''۔

نعش ''لاش'' کے معنی میں یہ لفظ اردو میں عموماً ادبی اور تحریری ہی زبان تک محدود ہے۔ معنی کے اعتبار سے ''لاش'' اور ''نعش'' میں کوئی فرق نہیں، سعدی ؎

وگر نعشے دو کس بر دوش گیرند لئیم الطبع پندارد کہ خوان است

غالب کا شعر ہے ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

دیکھئے ''لاش'' ؛ ''لاشہ'' ؛ ''لاشی پاشی''۔

نقاط ''نقطہ'' کی جمع۔ یہاں حرف اول مکسور ہے۔ بعض لوگ مضموم بولنے لگے ہیں، لیکن ابھی یہ عام نہیں ہوا ہے۔ اول مضموم کو غلط سمجھنا چاہئے۔

نکات ''نکتہ'' کی جمع۔ یہاں حرف اول مکسور ہے۔ بعض لوگ مضموم بولنے لگے ہیں، لیکن ابھی یہ عام نہیں ہوا ہے۔ اول مضموم کو غلط سمجھنا چاہئے۔

نکھلو اودھ کے علاقے میں کم پڑھے لکھے لوگ، اور کچھ شہری لوگ بھی ''لکھنؤ'' کو ''نکھلو'' کہتے ہیں۔ دیکھئے ''تقدیم و تاخیر حروف، تلفظ میں''۔

نگ اول مفتوح، بمعنی ''سامان، یا کوئی شے جس کی گنتی ہو سکے''۔ اس مفہوم میں ''نگ'' کسی لغت میں نہ ملا، حالانکہ اس معنی میں یہ لفظ ہر جگہ سنا گیا ہے۔ فارسی میں البتہ یہ لفظ نہیں، لیکن وہاں ''نگین/نگینہ'' اسی معنی میں ہے۔ دونوں کی اصل یقیناً ایک ہے، کیوں کہ ہمارا لفظ ''نگ'' پراکرت ''نگو'' (اول دوم مفتوح) اور پھر سنسکرت ''نگ'' (اول دوم مفتوح، سوم ساکن) سے لیا گیا ہے۔ دیکھئے ''رقم'' ؛ ''عدد''۔

نگینہ اول مفتوح، یائے معروف۔ اس لفظ میں بھی ہائے ہوز زائد ہے۔ معنی کے اعتبار سے ''نگین'' اور ''نگینہ'' میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اردو میں ''نگین'' تنہا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ جنس دونوں کی ایک ہے۔

نماز پورب میں اکثر لوگ اول مکسور بولتے ہیں، لیکن دوسرے علاقوں میں عام طور پر یہ لفظ اول مفتوح بولا جاتا ہے۔ یہی تلفظ صحیح ہے۔ اول مکسور کو پورب کا مقامی تلفظ کہہ سکتے ہیں، لیکن

اوروں کو اس طرح نہ بولنا چاہئے۔

تمکین اصل تلفظ تو اول دوم مفتوح اور یاے معروف کے ساتھ ہونا چاہئے، مصحفی ؎

تک دیکھیو تو اس کو ذرا دانتوں میں لے کر شاید کہ کباب دل عاشق تمکیں ہو

لیکن زبانوں پر عام طور پر سکون دوم اور یاے معروف کے ساتھ بروزن مفعول ہے، اور یہی صحیح مانا جائے گا۔

نون پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمعیں دیکھئے ''جمع، نون پر ختم ہونے والے الفاظ کی''۔

نہیں آج کل ''نہ'' اور ''نہیں'' میں امتیاز کا لحاظ کم ہو رہا ہے، یعنی جہاں ''نہ'' کا محل ہے، وہاں ''نہیں'' لکھا جانے لگا ہے۔ اس گڑبڑ کو بند ہونا چاہئے، کیوں کہ ''نہ''، ''نہیں''، اور ''مت''، تینوں کے معنی میں لطیف فرق ہے۔ اگر ہم ان میں سے کسی کو ترک کر دیں گے تو زبان کی ایک نزاکت سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ درست ہے کہ کئی موقعے ایسے ہو سکتے ہیں جہاں ''نہ'' کا محل ہو، لیکن وہاں ''نہیں'' سے کام چل جائے۔ یا ایسا بھی ممکن ہے کہ ''نہ'' اور ''نہیں'' دونوں بالکل ایک ہی حکم رکھتے ہوں۔ اس بنا پر حتمی قاعدے تو بنانا مشکل ہے کہ فلاں جگہ ''نہ'' ٹھیک ہے، اور فلاں جگہ ''نہیں''۔ لیکن بعض مثالوں پر غور کریں تو عمومی طور پر کچھ رہنما اصول ہاتھ آ سکتے ہیں:

(۱) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہاں ''نہ'' کا محل ہے، صحیح جملہ یوں ہوگا:

(۲) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دیا جائے۔

لیکن اگر جملہ یوں ہوتا:

(۳) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

تو کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہاں ''نہیں'' بالکل ضروری ہے:

(۴) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دیا جا سکتا ہے۔

صریحاً غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ جملہ کسی شرطیہ جملے کا حصہ ہوتا تو ''نہ'' ٹھیک تھا:

(۵) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دیا جا سکتا اگر آپ میرے خلوص نیت پر شک نہ کرتے۔

اور جملہ اگر یوں ہوتا:

(۶) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دینا چاہیے۔

یا پھر یوں ہوتا:

(۷) صحیح: ۔۔۔ نہ دینا چاہیے۔

تو ہم تذبذب میں پڑ جاتے ہیں کہ ''نہ'' اچھا ہے کہ ''نہیں''؟ یعنی یہاں دونوں ٹھیک ہیں۔ اگر جملہ یوں ہو:

(۸) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دے کر آپ نے حق پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

یہاں بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''نہ'' کا محل تھا:

(۹) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دے کر آپ نے حق پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

فرض کیجیے کہ یہ جملہ یوں ہوتا:

(۱۰) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دیجیے۔۔۔

اب پھر معاملہ شک سے عاری ہے، کہ یہاں ''نہ'' کا محل تھا:

(۱۱) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دیجیے۔

اب یہ مثال ملاحظہ ہو:

(۱۲) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دے کر آپ نے حق پسندی کا ثبوت نہ دیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس جملے میں ''نہیں'' اور ''نہ'' دونوں بے محل ہیں۔

(۱۳) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دے کر آپ نے حق پسندی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

اب اس جملے کو یوں کر لیں:

(۱۴) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دے کر آپ نے حق پسندی تو نہیں کی۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ درست نہیں ہے۔ اسے یوں ہونا تھا:

(۱۵) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دے کر آپ نے حق پسندی تو نہ کی۔

لیکن اسی جملے کو اس طرح لکھیں تو عبارت بالکل ٹھیک ہوگی:

(۱۶) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دے کر آپ نے حق پسندی تو کی نہیں۔

لیکن اگر جملہ نمبر ۱۴،۱۳ استفہامیہ ہو تو دوسرے "نہیں" کا صرف بالکل درست ہے:

(۱۷) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دے کر آپ نے حق پسندی تو نہیں کی؟

اب اس جملے کو یوں لکھیں:

(۱۸) صحیح: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہ دیا جائے، یہ فیصلہ کر کے آپ نے حق پسند تو نہیں کہلائیں گے۔

مندرجہ بالا جملہ درست تو ہے لیکن "۔۔۔ نہ کہلائیں گے" بہتر ہوتا۔ اور یہی جملہ حسب ذیل شکل میں غلط ٹھہرے گا:

(۱۹) غلط: میری اس بات کو خود بینی کا نام نہیں دیا جائے، یہ فیصلہ کر کے آپ حق پسند نہیں کہلائیں گے۔

اب جملے کو ذرا اور وسعت دیجئے:

(۲۰) غلط: آپ کی رائے غلط نہیں تھی کہ یہ مسئلہ کچھ اہم نہ رہ گیا تھا کہ میری بات کو خود بینی کا نام دیا جائے یا نہ۔ ایسے فیصلے نہیں کر کے آپ باطل پسند نہیں کہلائیں گے۔

(۲۱) صحیح: آپ کی رائے غلط نہ تھی کہ یہ مسئلہ کچھ اہم نہیں رہ گیا تھا کہ میری بات کو خود بینی کا نام دیا جائے یا نہ۔ ایسے فیصلے نہ کر کے آپ باطل پسند نہ کہلائیں گے۔

مندرجہ بالا مثالوں کی روشنی میں موجودہ زمانے کے بعض معتبر نثر نگاروں کے نمونے دیکھیں:

(۱) دانشور کو حکومت کا پرزہ نہیں ہونا چاہئے (آل احمد سرور۔)

یہاں "پرزہ نہ ہونا" بھی بظاہر ٹھیک معلوم ہوتا ہے، لیکن "نہ ہونا" میں استمرار اور قطعیت نہیں ہے۔ اس جگہ "نہیں ہونا" میں انکار کی قوت زیادہ ہے۔

(۲) پوری قوم کے یہاں قدیم وجدید کی ایسی کشمکش نہیں رہے گی جو۔۔۔ (آل احمد سرور۔)

اس جملے میں بھی "نہ رہے گی" بظاہر ٹھیک معلوم ہوتا ہے، لیکن یہاں بھی وہی بات ہے کہ اس طرح کے جملے میں "نہیں" کی قوت زیادہ ہے۔ اب ایک ذرا طویل جملہ دیکھئے جس میں "نہ" کی پوری قوت نظر آتی ہے:

(۳) بڑا نقاد۔۔۔ ہمیں ادب اور زندگی کو اس طرح دیکھنے اور دکھانے پر مائل کرتا ہے

جس طرح پہلے نہ دیکھا گیا تھا۔ (آل احمد سرور)۔

یہاں ''نہ دیکھا گیا تھا'' دونوں معنی کو ادا کر رہا ہے: ''شعور اور ارادہ کر کے دیکھنے کا عمل نہیں کیا گیا تھا''، اور ''دکھائی نہیں دیا تھا۔'' صرف ''نہیں'' لکھتے تو موخر الذکر معنی نہ پیدا ہوتے۔

(۴) جس مقصد کے لئے۔۔۔سفر۔۔۔گوارا کیا تھا اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔۔۔جواب ملا کہ۔۔۔برار کے مسئلے پر کوئی بات چیت نہ کی جائے۔۔۔وہ اپنے مقصد میں اس ناکامی کو نہیں بھولے (مالک رام۔)

یہاں ''حاصل نہ ہوئی'' کا مطلب ہے، ''نہیں ہو سکی''، اور ''نہ کی جائے'' میں امریہ (Imperative) لہجہ ہے۔ ''نہیں بھولے'' میں مجبوری کا شائبہ ہے، کہ ناکامی انھیں یاد رہی لیکن اس کے لئے کچھ کر نہ سکے۔ ''نہ بھولے'' کہا جاتا تو کچھ اس کا حصل بھی مذکور ہوتا، مثلاً ''۔۔۔نہ بھولے اور انھوں نے پھر کوشش کی''، وغیرہ۔

(۵) اگر آخری ٹکڑے میں حسن بیان کی دلکشی نہ ہوتی تو یہ قطعیت کانوں کو بھلی نہ معلوم ہوتی (رشید احمد صدیقی۔)

یہاں ''نہیں ہوتی'' اور ''نہیں معلوم ہوتی'' بے محل ہیں۔ ''نہیں ہوتی'' تو بالکل ہی غلط ہے، اور ''نہیں معلوم ہوتی'' میں وہ قطعیت نہیں ہے جو ''نہ معلوم ہوتی'' میں ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نہ'' اور ''نہیں'' کا فرق اکثر وجدانی ہے، لیکن محمد منصور عالم نے اس موضوع پر ایک طویل اور کار آمد مضمون لکھا ہے جو کچھ مدت ہوئی ''شب خون'' کے شمارہ نمبر ۱۹۷ بابت ماہ اگست ۱۹۹۶ میں شائع ہوا تھا۔ تفصیل کے شائقین وہاں اسے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

نیشتر معنی کے لحاظ سے ''نیشتر'' اور ''نشتر'' بالکل ایک ہیں۔ جھگڑا تلفظ میں ہے۔ جو لوگ ''نشتر'' کو ''نیشتر'' سے مشتق سمجھتے ہیں، وہ ''نیشتر'' میں یائے معروف بولنا بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن میں نے ''نیشتر'' کو (یہ لفظ اب بہت رائج نہیں) ہمیشہ اول مفتوح کے ساتھ سنا ہے۔ میرا خیال ہے ''نشتر'' اور ''نیشتر'' الگ الگ لفظ ہیں اور ''نیشتر'' دراصل نیش + تر ہے، یعنی ''زیادہ تکلیف پہنچانے والا۔'' اگر یہ درست ہے تو ''نیشتر'' میں اول مفتوح بالکل ٹھیک، بلکہ انسب ہے۔

نیم رخ تصویر کسی شخص کی ایسی تصویر جس میں صرف ایک طرف کا چہرہ دکھائی دے۔ انگریزی میں اسے Profile کہتے ہیں۔ میر ؎

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی

جس تصویر میں چہرہ پورا دکھائی دے اسے ''دو چشمی تصویر'' کہتے ہیں۔ مصحفی ؎

مصحفی تا کہ ہو تصویر دو چشمی یہ غزل اور بھی اس کے میں پہلو میں لگایا رخ صبح

واحد کا صیغہ بجائے جمع، زور کلام کے واسطے کبھی کبھی زور کلام کی خاطر جمع کے صیغے کی جگہ واحد لاتے ہیں۔ اس کی مشہورترین مثال آتش کا شعر ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

یہ طرز اردو میں غالباً فارسی سے آیا ہے، لیکن وہاں اب شاذ ہے۔ انگریزی میں اس کا وجود نہیں۔ چونکہ اس کے کوئی قاعدے نہیں ہیں کہ یہ کہاں اچھا لگے گا، کہاں نہیں، اس لئے جدید ہندی اسے سنبھال نہیں پاتی۔

وار بطور لاحقہ ''وار'' دراصل ''بار'' ہے، یعنی ''باری، کسی چیز یا بات کے واقع ہونے کا صحیح موقع''۔ لہٰذا ''نمبر وار'' کے معنی ہوئے ''اپنے نمبر سے، اپنی باری پر'' اور ''سلسلہ وار'' کے معنی ہوئے ''ایک سلسلے میں، یعنی تسلسل سے، ایک کے بعد ایک''۔ اسی طرح اور بھی الفاظ ہیں۔

والا/ والی/ والے بطور صفت اردو میں ''والا/ والی/ والے'' کو کسی اور اسم کے ساتھ ملا کر صفت کے طور استعمال کرتے ہیں، مثلاً:

گوشت کھانے والا جانور

زخمی سر والا آدمی

جھبرے بالوں والی ٹوپی

مشرق کو جانے والی شاہراہ

تناسخ میں عقیدہ رکھنے والے لوگ

مندرجہ بالا مثالیں اپنی حد میں سب صحیح و فصیح ہیں۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں ''والا/ والی/ والے'' کے دائرۂ استعمال کو اس کی بضاعت سے زیادہ پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات

یہ ہے کہ ''والا/والی/والے'' کا استعمال وہاں بہتر ہے جہاں بیان کسی مستقل حقیقت یا صورت حال کا ہو۔ یا پھر زمانہ حال یا زمانہ مستقبل کا ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ فقرے میں کوئی ابہام نہ ہونا چاہئے۔ مندرجہ ذیل پر غور کریں:

(۱) گذشتہ بیس برسوں میں لکھی جانے والی شاعری۔۔۔

یہاں یہ کہنا بہتر ہے: ''وہ شاعری جو گذشتہ بیس برس میں لکھی گئی'' کیوں کہ بیان کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے، موجودہ شکل میں یہ مبہم بھی ہے۔ فقرہ (۱) سے گمان گذرتا ہے کہ کئی طرح کی شاعریوں کا تذکرہ مقصود ہے: ''لکھی جانے والی''؛ ''زبانی موزوں کی جانے والی'' اور ''پڑھی جانے والی''، وغیرہ۔

(۲) گجرات میں بی جے پی کی قیادت والی حکومت کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔

یہاں یہ کہنا بہتر ہے:

(۲) گجرات میں بی جے پی اور اس کے حامیوں کی حکومت۔۔۔

(۲) گجرات میں بی جے پی کی زیر قیادت حکومت۔۔۔

(۲) بی جے پی کی زیر قیادت گجرات کی حکومت۔۔۔

(۲) بی جے پی کی قیادت میں قائم گجرات کی حکومت۔۔۔

''قیادت والی'' سے گمان گذرتا ہے کہ گجرات میں کئی حکومتیں ہیں اور ان میں سے ایک ایسی ہے جو بی جے پی کے زیر قیادت ہے۔

(۳) بے رخی کا شکار ہونے والے ادب۔۔۔

یہاں مفہوم صاف نہیں ہے۔ کہنا چاہئے:

(۳) وہ ادب جو بے رخی کا شکار ہوتا رہا ہے۔۔۔

(۳) وہ ادب جو بے رخی کا شکار رہا ہے۔۔۔

(۳) ادب جو بے رخی کا شکار ہے۔۔۔

(۴) زید کی رہبری والا قافلہ۔۔۔

یہ فقرہ اگر اس بیان میں ہے کہ متعدد قافلے ہیں یا تھے، اور ان میں سے ایک کی رہبری زید کر رہا

تھا تو ٹھیک ہے۔ مثلاً:

اور سب قافلے تو آ گئے لیکن زید کی رہبری والا قافلہ نہیں پہنچا۔

لیکن مندرجہ ذیل استعمال غلط ہے:

(۵) مغرب سے امنڈنے والا طوفان۔۔۔

یہاں بہتر ہے کہ یوں کہا جائے:

(۵) مغرب سے امنڈتے ہوئے طوفان۔۔۔

(۵) وہ طوفان جو مغرب سے امڈا تھا/مغرب سے امڈا ہے۔۔۔

اگر زمانۂ حال کا بیان ہے، اور اسے پوری طرح واضح کرنا ہے (جو کہ ہر لکھنے/بولنے والے کا مقصود ہونا چاہئے) تو یوں لکھئے:

(۵) مغربیت کے امنڈتے ہوئے طوفان۔۔۔

بسا اوقات ادائے مطلب کے لئے ''والا/والی'' وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی، لوگ ہندی کے تتبع میں، یا غور و فکر کی کمی کے باعث لکھ جاتے ہیں۔ ایک اخبار سے عبارت نقل کرتا ہوں:

(۶) چیف جسٹس کی سربراہی والی پانچ ججوں کی بنچ نے وکیلوں کی ہڑتال کے نتیجے میں کام کاج متاثر ہونے کی شکایت سے متعلق دائر کی جانے والی درخواستوں کو نپٹاتے ہوئے کہا کہ جو وکیل بار ایسوسی ایشن کی اپیل پر کی جانے والی ہڑتالوں میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہیں۔۔۔

اس بات سے قطع نظر کہ اس عبارت کو بہ آسانی سدھار کر چست اور پرزور کیا جا سکتا ہے، اس وقت صرف یہ دیکھیں کہ:

(۶) ۔۔۔سربراہی والی پانچ ججوں کی بنچ

نہ کہیں، اور:

(۶) ۔۔۔سربراہی میں پانچ ججوں کی بنچ

کہیں تو عبارت اور معنی دونوں بہتر ہو جاتے ہیں۔ پھر:

(۶) ۔۔۔سے متعلق دائر کی جانے والی درخواستوں

کی جگہ صرف:

(۶)۔۔۔ سے متعلق درخواستوں۔۔۔

لکھیں تو عبارت بہتر ہو جاتی ہے۔ پھر:

(۶) اپیل پر کی جانے والی ہڑتالوں میں حصہ لینے۔۔۔

کے بجائے:

(۶) اپیل پر ہڑتالوں میں حصہ لینے۔۔۔

کہیں، تو عبارت زیادہ سڈول لگتی ہے اور معنی کو ہاتھ سے دیے بغیر اختصار اور جامعیت حاصل ہوتی ہے۔ اختصار اور جامعیت کے ساتھ بامعنی ہونا اچھی زبان کی اولین اور شاید اہم ترین پہچان ہے۔ مزید دیکھیے: ''گئے''۔

واؤ اشمام مع اضافت، اور ''اشمام'' بروزن ''انکار''۔ دیکھیے: ''واو معدولہ''۔

واو عطف اور ''اور'' کا فرق یہ دونوں لفظ عاطف ہیں، یعنی دو یا زیادہ الفاظ کو جوڑنے کے کام آتے ہیں۔ اصولی طور پر کسی بھی دو یا دو سے زیادہ لفظوں کو جوڑنے کے لئے ہمیں آزادی ہونی چاہئے تھی کہ ''اور'' لکھیں یا ''و'' لکھیں۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر رواج عام حسب ذیل قاعدوں کی پابندی کرتا ہے:

(۱) اگر ایک لفظ دیسی یا انگریزی اور ایک لفظ فارسی/ عربی/ ترکی ہے تو انھیں جوڑنے کے لئے ''و'' کا استعمال درست نہیں۔ مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

اسٹیشن و دوکان؛ بازار و گلی؛ پانی و شراب؛ چیز یا و شیر؛ شام و رات؛ کتاب و کاپی؛ مکان و گھر، وغیرہ۔

مندرجہ بالا تمام جوڑوں میں جوڑنے کی علامت ''و'' کی جگہ ''اور'' استعمال ہونا چاہئے۔

(۲) عربی، فارسی، ترکی الفاظ کے مابین ''و'' لگانا ٹھیک ہے۔ مثلاً:

آب و دانہ؛ آرزو و ارمان؛ توپ و تفنگ؛ خواب و خیال؛ رنگ و نسل؛ شام و سحر؛ مہربانی و محبت؛ موت و حیات؛ نقش و نگار، وغیرہ۔

(۳) دیسی الفاظ کے مابین، یا انگریزی/ فرانسیسی وغیرہ مغربی زبانوں کے الفاظ کے مابین

''و''نہیں لگانا چاہئے۔مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

بلی و کتا: بندوق و کارتوس: پانی و بجلی: روٹی و کپڑا: گلاس و کالج: مٹی و پودا، وغیرہ۔

(۴) عربی/فارسی/ترکی لفظ کی جمع اردو قاعدے سے بنی ہو تو ایسے لفظ، اور کسی بھی عربی/فارسی/ترکی/اردو لفظ کے درمیان ''واو'' نہیں لگانا چاہئے اور نہ خود ایسے لفظوں ہی کو جوڑنے کے لئے ''واو'' لانا چاہئے۔مثلاً حسب ذیل استعمالات غلط ہیں:

آسمانوں و ہواؤں: بلبلوں و چیلوں: پردے و بستر: دوائیں و شیشی: صبحیں و شامیں: کتابیں و کاغذ: نظمیں و قصائد، یاقوت و موتی، وغیرہ۔

مندرجہ بالا اصول دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے جوڑ کے لئے ''واو'' کے استعمال پر جاری کئے جاتے ہیں۔لہٰذا حسب ذیل طرح کے بھی استعمالات غلط ہیں:

آنکھوں و ہاتھوں و دل: انسانی و سماجی و سائنسی علوم: خیالوں و خوابوں و تصورات کی دنیا: سیاسی و اسکولی و پہاڑی نقشے: کتابوں و تصویروں و دستاویزوں کی مدد سے: مذہبی و سائنسی و دیہاتی لوگ: ہندوستانی و دیگر اقوام: وغیرہ۔

ملحوظ رہے کہ اشخاص، جگہوں، کتابوں، وغیرہ کے ناموں کے مابین 'واو' لگانا بالکل درست ہے۔

مثلاً حسب ذیل استعمالات بالکل ٹھیک ہیں:

بوطیقا و رامائن: حامد و رمیش: شیکسپیئر و غالب: کوفہ و بغداد: لندن و پیرس: نہرو و گاندھی، وغیرہ۔

واو عطف کا استعمال یا حذف اردو روزمرہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ دو لفظوں کے درمیان سے علامت عطف، خاص کر واو عطف کو کبھی کبھی حذف کرتے ہیں یا باقی رکھتے ہیں۔مثلاً حسب ذیل معطوف جوڑے بالکل فصیح ہیں:

خط کتابت/خط و کتابت: دل جگر/دل و جگر: رنگ روغن/رنگ و روغن: شکل صورت/شکل و صورت: صنائع بدائع/صنائع و بدائع: ہوش حواس/ہوش و حواس، وغیرہ۔

ان کے برخلاف، بعض معطوف جوڑے ایسے ہیں جن کے بیچ میں واوٗ عطف لانا ضروری ہے ورنہ فقرہ خلاف محاورہ ہو جائے گا۔ مثلاً حسب ذیل جوڑے اگر بے واوٗ لکھے جائیں تو غیر مناسب ٹھہریں گے:

باد و باراں؛ دست و پا؛ رنج و غم؛ شب و روز؛ صبح و شام؛ نام و نمود، وغیرہ۔

افسوس کہ اس روزمرہ کے لئے قاعدے نہیں بن سکتے۔

واوٗ عطف، ''ہندی'' اور ''غیر ہندی'' الفاظ کے درمیان دیکھئے: ''اضافت اور واوٗ عطف: ''ہندی'' اور ''غیر ہندی'' الفاظ کے مابین''؛ دیکھئے ''واوٗ عطف اور ''اور'' کا فرق''۔

واوٗ معدولہ اردو میں مستعمل بہت سے فارسی اور ترکی لفظوں میں حرف واوٗ کو لکھتے، یعنی مکتوب کرتے ہیں، لیکن اسے پڑھتے نہیں، یعنی ملفوظ نہیں کرتے۔ مثلاً: خواب؛ خوار؛ خواہش؛ خورد؛ خوش؛ یورش۔ ان سب الفاظ میں واوٗ نہیں پڑھی جاتی اور نہ تقطیع میں آتی ہے۔ ایسی واوٗ کو ''معدولہ'' کہتے ہیں، یعنی ایسی واوٗ جسے دبا کر برابر کر دیا گیا ہو۔ لیکن بعض لوگ مندرجہ بالا الفاظ اور ان کی طرح کے الفاظ میں، اگر واوٗ کے بعد الف ہو، واوٗ کا ہلکا سا تلفظ کرتے ہیں۔ یہ واوٗ تقطیع میں اب بھی نہیں آتی، لیکن سننے والے/بولنے والے واوٗ کی تھوڑی سی ''مہک'' [اشمام (اول مکسور)، بمعنی ''سونگھنا''] محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے ایسی واوٗ کو ''واوٗ اشمام'' کہا جاتا ہے۔ واوٗ معدولہ اور واوٗ اشمام میں کوئی اصولی فرق نہیں، عروضی اعتبار سے دونوں بے وجود ہیں، بس تلفظ کا ذرا سا فرق ہے جسے علاقائی سمجھنا چاہئے۔ جہاں تک سوال لکھنے کا ہے، واوٗ معدولہ (یا واوٗ اشمام) لکھنے میں ضرور آئے گی۔ یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ جب بولنے میں نہیں ہے تو لکھنے میں کیوں ہو؟ لکھنا اور شے ہے، بولنا اور شے۔

وتیرہ دیکھئے: ''وطیرہ''۔

وجہ کر بمعنی ''وجہ سے''۔ یہاں ''کر'' بمعنی ''سے، میں'' ہے۔ یہ روزمرہ اب صرف مشرقی اردو میں رائج ہے۔ اسے وہاں کا مقامی روزمرہ سمجھنا چاہئے۔

وراثت اول مکسور۔ اصل عربی کے اعتبار سے ''وراثت'' اور ''ورثہ'' میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اردو میں تھوڑا سا فرق ہے۔ یعنی (۱) وہ مال، یا کوئی بھی سامان، جو کسی کو ترکے میں ملے، خاص کر

اپنے اجداد سے، یا (۲) وہ مال یا کوئی بھی سامان جو کوئی شخص اپنے پیچھے چھوڑ جائے، دونوں کو ''ورثہ'' کہتے ہیں۔ لیکن ''وراثت'' کے معنی عموماً صرف اس مال یا کسی بھی چیز کے ہیں جو کسی شخص کو ترکے میں ملے۔

نامناسب: ہمارے بزرگوں نے کچھ وراثت نہیں چھوڑی۔

مناسب: ہمارے بزرگوں نے کچھ ورثہ نہیں چھوڑا۔

نامناسب: بچوں کے لئے ان کی وراثت کیا تھی، صرف چند کتابیں۔

مناسب: بچوں کے لئے ان کا ورثہ کیا تھا، صرف چند کتابیں۔

مناسب: ایک کوٹھی انھیں وراثت میں ملی تھی۔

مناسب: ایک کوٹھی انھیں ورثے میں ملی تھی۔

غلط: ہمارے لئے پنڈت نہرو کی وراثت ان کے سیاسی خیالات ہیں۔

مندرجہ بالا غلط جملے کے معنی ہوں گے، پنڈت نہرو کو جو کچھ ورثے میں ملا وہ ان کے سیاسی خیالات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس کا محل نہیں۔

صحیح: ۔۔۔کا ورثہ۔۔۔

ورثا ''وارث'' کی جمع ''ورثہ'' (اول دوم سوم مفتوح) اور ''ورثاء'' (اول دوم مفتوح) دونوں درست ہیں۔ اردو میں ''ورثا'' بے ہمزہ مستعمل ہے۔ ہمزہ پر اصرار کرنا غلط ہے۔ ''ورثہ'' اگرچہ صحیح ہے، لیکن زیادہ مستعمل نہیں۔

ورثہ ''وراثت'' کے معنی میں، عربی میں اول دوم مفتوح ہیں۔ لیکن اردو میں صرف اول مفتوح سے بولتے ہیں۔ پلیٹس نے اول مکسور بھی درج کیا ہے لیکن یہ اب بہت کم سننے میں آتا ہے۔ بہر حال، اردو کی حد تک اسے غلط نہ کہیں گے۔ دیکھئے: ''وراثت''۔

وصلت معنی کے لحاظ سے ''وصل'' اور ''وصلت'' بالکل ایک ہیں۔ عربی میں ''وصلت'' اول مضموم کے ساتھ ہے۔ اردو میں زیادہ تر اول مفتوح سنا گیا ہے۔ اردو کے لئے اول مفتوح ہی صحیح ہے، لیکن کوئی اول مضموم بولے تو فی الحال اسے غلط نہ کہیں گے۔ ''نور اللغات'' میں لکھا ہے کہ فصحائے لکھنؤ نے اب ''وصلت'' کو متروک قرار دیا ہے۔ اس قول میں کئی مسامحے ہیں۔ صاحب ''نور

اللغات'' نے ''وصلت'' کی سند میں امیر مینائی کا شعر درج کیا ہے۔ امیر مینائی بھی ممتاز فصحاے لکھنؤ میں ہیں اور اگر انھوں نے اس لفظ کو باندھا تو یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ فصحاے لکھنؤ نے اسے متروک کر دیا ہے؟ دوسری بات یہ کہ وہ فصحاے لکھنؤ ہوں، یا کہیں اور کے فصحا ہوں، کسی لفظ کو متروک قرار دینے کا حق کسی کو نہیں۔ الفاظ جمہور کی میراث ہیں اور جمہور کے عمل کے مطابق خود بخود متروک یا مقبول ہوتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ اگر کسی شخص یا طبقے کو یہ حق پہنچتا بھی ہو کہ وہ کسی لفظ کو متروک قرار دے، تو اس کے لیے مناسب دلائل اور وجوہ بھی اسے بیان کرنا چاہیے۔ صرف اپنے ''ذوق'' یا ''خیال'' کی بنا پر کسی لفظ کو متروک کہنا یا متروک کرنا زبان کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

وضو دبی پرشاد سحر بدایونی نے لکھا ہے کہ ''وضو'' بفتح اول غلط اور بضم اول درست ہے۔ ''آصفیہ'' میں بھی صرف بضم اول لکھا ہے، اور یہی بات شان الحق حقی نے دہرائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا تلفظ اول مفتوح کے ساتھ زیادہ رائج ہے۔ تامسن اور پلیٹس نے اول مفتوح اور مضموم دونوں دیے ہیں۔ ان کی بات اس طرح بھی ٹھیک ہے کہ عربی میں اول مفتوح اور اول مضموم دونوں ہیں، اگرچہ ان کے معنی مختلف ہیں۔ بہر حال، اردو کے لیے اس وقت مرجح تلفظ اول مفتوح سے ہے۔

وطیرہ بعض لوگ اس املا کو غلط قرار دیتے ہیں، کیونکہ عربی میں ''وتیرہ'' ہے، وطیرہ نہیں۔ عربی کی بات تو صحیح ہے، لیکن اصل معاملہ کسی زبان میں کسی لفظ کے رائج ہو جانے کا ہے۔ اگر اردو میں ''وطیرہ'' مع واو رائج ہے تو اردو کے لیے وہی درست ہے، فارسی عربی میں جو بھی ہو۔ اس وقت اردو میں اکثر لوگ ''وطیرہ'' لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ ''وتیرہ'' لکھتے ہیں، لہٰذا دونوں کو درست سمجھا جائے گا۔ لیکن کثرت استعمال کے لحاظ سے ''وطیرہ'' کو ترجیح ہے۔

ولندیز اول دوم مفتوح، واو مجہول۔ اردو میں یورپی ملک ہالینڈ (Holland) کا نام پہلے ''ولندیز'' تھا اور اس سے صفت ''ولندیزی'' بنتی تھی۔ چند دہائی پہلے تک کی کتابوں میں یہ لفظ ملتے ہیں لیکن اکثر لوگ ان کی اصل سے واقف نہیں کہ ''ہالینڈ'' اور ''ولندیز'' میں بظاہر کوئی مطابقت نہیں ہے۔ دراصل ''ولندیز'' ہم لوگوں نے ہالینڈ کے فرانسیسی نام Hollandais سے حاصل کیا ہے۔ فرانسیسی میں H کا تلفظ نہیں کیا جاتا، لہٰذا وہاں اسے ''اولاں دے'' پڑھتے ہیں۔ کسی بنا پر اردو

والوں نے فرانسیسی تلفظ اور املا کو خلط ملط کر کے "ونڈیز" بنا لیا۔

وہاں "یہاں" کے معنی میں "وہاں" مثلاً "ان کے وہاں آج دعوت ہے" اب بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا ترک بہتر ہے۔ دیکھئے "ہاں"؛ "یہاں"۔

وہی یہ لفظ "وہ" اور "ہی" کا مرکب ہے اور اس کا تلفظ اول مضموم مجہول سے ہے۔ ہندی میں چونکہ اس طرح کا مجہول ضمہ نہیں جیسا کہ اس لفظ ("وہی") میں ہے، اس لئے ہندی والے اسے اول مفتوح کے ساتھ "وہی" بولتے ہیں۔ بعض اردو والے، خاص کر بچے، اس تلفظ کو اختیار کرنے لگے ہیں۔ اردو میں "وہی" یعنی مع اول مفتوح بالکل غلط ہے۔

ہاں خواجہ عبدالرؤف عشرت نے لکھا ہے کہ "یہاں" کے معنی میں "ہاں" غلط ہے، مثلاً یہ کہنا غلط ہے: "ان کے ہاں جانا ہے/ آپ کے ہاں ان کو دیکھا/ غالب کے ہاں فارسی تراکیب بہت ہیں" وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان معنی میں "ہاں" سارے جنوبی ہند میں اور مغربی علاقوں میں رائج ہے۔ میں خود "یہاں" کے معنی میں "ہاں" نہیں لکھتا، لیکن مذکرہ معنی میں "ہاں" کو غلط نہیں کہہ سکتا:

صحیح: میں نے ان کے ہاں مشاعرہ پڑھا ہے۔

صحیح: ۔۔۔ یہاں ۔۔۔

صحیح: یہ لفظ میرے ہاں کوئی دس بار تو آیا ہوگا۔

صحیح: ۔۔۔ یہاں ۔۔۔

بعض لوگ انھیں معنی میں "وہاں" بھی بولتے ہیں، لیکن اب یہ بہت کم ہو گیا ہے۔ اس سے احتراز بہتر

ہائے مختفی فارسی میں ہائے ہوز دو طرح کی ہوتی ہے:

(۱) ملفوظی۔

(۲) غیر ملفوظی۔ اسے ہائے مختفی بھی کہتے ہیں۔

ہائے ملفوظی کی جگہ مقرر نہیں۔ یہ لفظ کے شروع میں، وسط میں، یا آخر میں، کہیں بھی آ سکتی ہے:

ہستی [اول لفظ] ہوش [اول لفظ] مہر [وسط لفظ] مرہم [وسط لفظ] وہ، ورہ [اخیر

لفظ [گرہ] [اخیر لفظ]

ہاے ملفوظی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اگر یہ لفظ کے آخر میں ہو اور فارسی قاعدے کے مطابق اس کی جمع "ہا" سے بنائیں تو اصل لفظ کی ہاے ہوز ساقط نہیں ہوتی، صاف سنائی دیتی ہے:

انبوہ/ انبوہ ہا؛ چاہ/ چاہ ہا؛ راہ/ راہ ہا؛ شبیہ/ شبیہ ہا؛ کوہ/ کوہ ہا؛ گرہ/ گرہ ہا

ہاے غیر ملفوظی، یعنی ہاے مختفی، لفظ کے صرف آخر میں آتی ہے۔ اس کی پہلی اور اہم ترین پہچان یہ ہے کہ کسی لفظ میں ہاے مختفی ہو اور اس کی جمع بنائیں تو ہاے مختفی ساقط ہو جاتی ہے۔

آزردہ/ آزردگاں؛ آئینہ/ آئینہا؛ پردہ/ پردہا؛ پیمانہ/ پیمانہا؛ جامہ/ جامہا؛ جلوہ/ جلوہا؛ خواجہ/ خواجگاں؛ زندہ/ زندگاں؛ شیشہ/ شیشہا؛ مردہ/ مردگاں؛ نامہ/ نامہا؛ تکیہ/ تکیہا

جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے، ہاے مختفی پر ختم ہونے والے لفظ کی جمع اگر الف ونون لگا کر بنے تو الف کے پہلے گ کا اضافہ کرتے ہیں: آزردہ/ آزردگاں۔

ہاے غیر ملفوظی، یعنی ہاے مختفی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ یہ اکثر اپنے ماقبل حرف کی حرکت (جو ہمیشہ فتحہ ہوتی ہے) پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اگر ہاے مختفی ہے تو اس کے پہلے والا حرف مفتوح ہوگا۔ اس ہاے غیر ملفوظ کا لفظ کے معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا:

آوازہ؛ بندہ؛ جامہ؛ چہرہ؛ خامہ؛ شگفتہ؛ شگوفہ؛ موجہ؛ نامہ

ہاے مختفی کی تیسری پہچان یہ ہے کہ ہاے مختفی والے لفظ کو جب حالت فاعلی میں لاتے ہیں تو علامت فاعلی [یاے تحتانی] کے پہلے کاف فارسی بڑھاتے ہیں:

آوارہ/ آوارگی؛ بندہ/ بندگی؛ بیچارہ/ بیچارگی؛ پردہ/ پردگی؛ ہمسایہ/ ہمسائیگی

ایک دلچسپ صورت "وغیرہ" کی ہے، کہ اردو میں اس کی جمع "وغیرہم" ہے۔ یعنی اسے مستقل عربی لفظ قرار دیا گیا ہے، اور یہ ٹھیک بھی ہے، کہ "وغیرہ" کی ہاے ہوز اور "وغیرہم" کا "ہم" مستقل شمار ہیں، یعنی خود ہی لفظ کا حکم رکھتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ مذکورہ بالا تینوں پہچانیں ایک لفظ میں اکٹھا ہوں، ایسا ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اہم ترین پہچان، جسے ہاے مختفی کا سنگ بنیاد کہنا چاہئے، اور جو یقیناً موجود ہوگی، یہ ہے کہ

جب ہاے مختفی والے لفظ کی جمع بنتی ہے تو ہاے مختفی ساقط ہو جاتی ہے۔ آج کے املا میں کہیں کہیں ممکن ہے کہ لکھنے کی آسانی کی خاطر ہاے مختفی کو ساقط نہ کیا جائے، لیکن پڑھی یا بولی وہ بہر حال نہیں جاتی، یعنی ملفوظ نہیں ہوتی۔ مثلاً ممکن ہے کہ کوئی ''جلوہ/جلوہا'' کی جگہ ''جلوہ ہا'' لکھے، ''دہنہ/دہنہا'' کی جگہ ''دہنہ ہا'' لکھے، ''ذرہ/ذرہا'' کی جگہ ''ذرہ ہا''، ''نامہ/نامہا'' کی جگہ ''نامہ ہا'' لکھے، لیکن بولنے میں وہی ہاے ہوز بولی جائے گی جو علامت جمع ہے۔

بعض حالتوں میں ہاے مختفی معنی پر بھی دلالت کرتی ہے، لیکن اس سے اس کی ملفوظی یا مکتوبی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ فارسی میں ہاے مختفی کسی بھی لفظ میں واقع ہو سکتی ہے۔ فارسی کا ''چہرہ'' یا ''سایہ'' ہو، عربی کا ''جلوہ'' یا ''شہرہ''، یا ترکی کا ''چامہ'' اور ''داروغہ''، فارسی کے قاعدے کے بموجب سب کا آخری حرف ہاے مختفی ہے۔ ایسا نہیں کہ چونکہ خود عربی یا ترکی میں ہاے مختفی کا وجود نہیں، اس لئے فارسی میں مستعمل عربی یا ترکی لفظ پر ہاے مختفی کا اصول نہ جاری ہو۔ جو لفظ فارسی میں داخل ہو گیا اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو اصل فارسی الفاظ کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔

فارسی میں ہاے مختفی کا یہ مختصر حال بیان ہوا۔ اب دیکھتے ہیں کہ اردو میں کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ ''ہندی'' میں ہاے مختفی نہیں ہے، اس لئے ''ہندی'' لفظوں کو ہاے مختفی سے نہ لکھا جانا چاہئے۔ ان لوگوں کی رائے میں حسب ذیل املا غلط ہیں:

بارہ، پتہ، پیسہ، ڈاکہ، گھنٹہ، مہینہ، میلہ

ان لوگوں کے خیال میں انھیں یوں لکھنا چاہئے:

بارا، پتا، پیسا، ڈاکا، روپیا، گھنٹا، مہینا، میلا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''ہندی'' سے کیا مراد ہے؟ اگر ''ہندی'' سے جدید ہندی مراد ہے جو ناگری حرفوں میں لکھی جاتی ہے تو وہ ایک الگ ہی زبان ہے، اس میں کسی حرف یا آواز کا ہونا نہ ہونا اردو کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یا اگر کچھ معنی رکھتا بھی ہو، تو یہ ہندی لکھی جاتی ہے ناگری رسم خط میں، اور اس رسم الخط میں تو ہاے مختفی کے حامل فارسی عربی الفاظ مثلاً ''پردہ، چہرہ،

دا، سکا'' وغیرہ لکھنے کا کوئی طریقہ بھی نہیں۔ وہاں تو انھیں '' پردا، چہرا، دایا، سکا'' ہی لکھا جاتا ہے۔ یعنی فارسی عربی الفاظ کی ہائے مختفی، جسے اردو والوں نے بڑے اہتمام سے قائم رکھا ہے، وہ بھی ناگری رسم الخط کی جدید ہندی میں زائل ہو جاتی ہے۔ جدید ہندی، جو ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس میں آخری ہائے ہوز اور آخری الف میں فرق کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ لہٰذا وہاں کا عمل اردو کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ بریں، اردو والے چاہے کتنا بھی شور کریں کہ '' ہندی'' میں ہائے مختفی کا وجود نہیں، لیکن ناگری رسم خط کی جدید ہندی لکھنے والوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہمیں فارسی عربی الفاظ کی ہائے مختفی کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی خاص علامت بنانی چاہئے۔ تمام ترقی یافتہ زبان والوں کی طرح وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم '' پردہ، جلوہ'' وغیرہ کی ہائے مختفی کو اپنی علامت ['' آ ''] کی علامت سے ظاہر کریں گے، فارسی میں کیا ہے یا کیا نہیں ہے، وہ فارسی کا معاملہ ہے۔ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں۔

اگر '' ہندی'' سے مراد لی جائے '' وہ زبان جسے آج اردو کہتے ہیں، اور جس کا ایک پرانا نام '' ہندی'' بھی تھا'' تو اس میں تو ہائے مختفی موجود ہے۔ '' چہرہ، شہرہ، مہرہ، پردہ، کیسہ، کینہ'' وغیرہ یہ سب لفظ تو اردو کے ہی ہیں، ان میں تو ہائے مختفی موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ الفاظ تو عربی فارسی کے ہیں، ان میں ہائے مختفی ہو سکتی ہے۔ تو سوال یہ بھی اٹھے گا کہ عربی میں بھی تو ہائے مختفی نہیں ہے۔ عربی تلفظ اور/ یا املا کے اعتبار سے '' شہرہ، جلوہ، غلبہ'' وغیرہ میں ہائے مختفی نہیں ہے۔ لیکن فارسی والے ان میں ہائے مختفی مانتے ہیں، تو اردو میں بھی ایسا کیوں نہ ہو؟ پھر یہ زبردستی کیوں کہ اردو کے دیسی الفاظ (مثلاً پیسہ، روپیہ، وغیرہ) میں ہائے مختفی نہیں ہے اور انھیں ہائے ہوز سے نہ لکھنا چاہئے؟ اس کا جواب آج تک نہیں دیا جا سکا۔ لیکن اگر کوئی جواب ہوگا تو یہی ہوگا کہ فارسی کو اپنے قاعدے بنانے کا حق ہے کہ وہ آزاد زبان ہے، اردو کو یہ حق نہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ کٹر سے کٹر عربی/ فارسی پرست کو یہ جواب قبول نہ ہوگا۔

اگر '' ہندی'' الفاظ سے مراد لی جائے وہ الفاظ جو غیر زبانوں کے الفاظ کو اردو سے منہا کر دینے پر بچ رہیں گے، تو سوال اٹھے گا کہ سنسکرت '' غیر زبان'' ہے کہ نہیں؟ اگر ہے، تو سنسکرت اور سنسکرت الاصل لفظوں کو نکال لینے کے بعد اردو میں شاید ہی کچھ بچے۔ اور اگر سنسکرت کو غیر

زبان نہ مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنسکرت اور ہندی ایک ہی ہیں۔ اس قول کا اہمال ظاہر ہے، کیوں کہ اگر ''ہندی'' میں ہندی وہی ہے جو سنسکرت ہے، اور باقی سب غیر زبانیں ہیں، تو پھر خود ''ہندی'' کیا ہے (یا ''اردو'' کیا ہے؟) دوسری بات یہ کہ اگر سنسکرت غیر زبان نہیں تو فارسی کو غیر زبان کیوں کہیں؟ آخر دونوں آپس میں بہن بہن ہی تو ہیں۔

غرض جس طرح سے دیکھیے، یہ بات مہمل ہے کہ ''ہندی'' (یعنی اردو کے دیسی الفاظ) میں ہائے مختفی نہیں، لہٰذا ''ہندی'' (یعنی اردو کے دیسی) الفاظ جیسے' باڑا، بتا، پیسا، ڈاکا، روپیا، گھٹنا، مہینا، میلا'' وغیرہ کا صحیح املا ہائے ہوز سے نہیں بلکہ الف سے ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ اردو میں اصل صورت حال کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ فارسی میں قاعدہ ہے کہ حالت جمع میں ہائے مختفی ساقط ہو جاتی ہے۔ کیا اردو میں ایسا ہی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں بھی عربی فارسی الفاظ کی ہائے مختفی کے ساتھ یہی قاعدہ برتا جاتا ہے:

آوارہ/آواروں، آوارے: آئینہ/آئینوں، آئینے: ارادہ/ارادوں، ارادے: اندیشہ/اندیشوں، اندیشے: پردہ/پردوں، پردے: پیمانہ/پیمانوں، پیمانے: جلوہ/جلووں، جلوے: چہرہ/چہروں، چہرے: خواجہ/خواجگاں: دائرہ/دائروں، دائرے: سکہ/سکوں سکے: مردہ/مردوں، مردے: نسخہ/نسخوں، نسخے: نقشہ/نقشوں، نقشے: وغیرہ۔

اب ذرا ''ہندی'' (یعنی اردو کے دیسی) الفاظ کو دیکھیے۔ یہاں بھی بعینہٖ یہی صورت ہے:

اماباڑہ/اماباڑوں/اماباڑے: پتہ/پتوں، پتے: پرنالہ/پرنالوں، پرنالے: پیسہ/پیسوں، پیسے: دھبہ/دھبوں، دھبے: ڈبہ/ڈبوں، ڈبے: روپیہ/روپیوں، روپئے: گولہ/گولوں، گولے: گھٹنہ/گھٹنوں، گھٹنے: میلہ/میلے، میلوں: نالہ/نالوں: وغیرہ۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ زبان کے بولنے اور برتنے والوں نے ان، اور ان کی طرح کے ان گنت ''ہندی'' (یعنی اردو) الفاظ کو ہائے مختفی کا حامل قرار دیا ہے۔ لہٰذا اردو میں ہائے مختفی موجود ہے، ورنہ حالت جمع میں ساقط ہونے والی ہائے ہوز پھر کیا ہے؟

یہاں ہم کہہ سکتے ہیں اردو میں بہت سے لفظ جو الف پر ختم ہوتے ہیں، ان کی بھی حالت جمع میں الف ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ''گھٹنہ، پیسہ، مہینہ'' میں آخری ہائے ہوز کا حالت جمع میں سقوط

بھی ثابت نہیں کرتا۔ لیکن یہی تو لطف کی بات ہے۔ لفظ کی حالت جمع میں آخری الف کا سقوط یہی ثابت کرتا ہے کہ اردو میں ہائے مختفی ہے۔ مندرجہ ذیل پر غور کریں:

بیٹا/ بیٹوں، بیٹے: ٹھکانا/ ٹھکانوں، ٹھکانے: جوتا/ جوتوں، جوتے: چچا/ چچوں، چچے: دھارا/ دھارا/ دھاروں، دھارے: ڈنڈا/ ڈنڈوں، ڈنڈے: کتا/ کتوں، کتے: لڑکا/لڑکوں لڑکے: وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا لفظوں اور مندرجہ بالا قسم کے لفظوں میں اردو والے چھوٹی ہ یعنی ہائے مختفی ہی فرض کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ ہائے مختفی کے ساتھ لکھے بھی جاتے تھے۔ لیکن پھر یہ بھی ہے:

ابا/ اباؤں: تایا/ تایاؤں، تائے: دادا/ داداؤں: گھٹا/ گھٹاؤں، گھٹائیں: مینا [اول مفتوح] / میناؤں، مینائیں: نانا/ ناناؤں: ناکا/ ناکاؤں، ناکائیں: وغیرہ۔

ان فارسی/ عربی الفاظ کو بھی سامنے رکھ لیجیے:

تمنا/ تمناؤں، تمنائیں: دریا/ دریاؤں: دلربا/ دلرباؤں، دلربائیں: دنیا/ دنیاؤں، دنیائیں: شیدا/ شیداؤں: صحرا/ صحراؤں: وغیرہ۔

مندرجہ بالا مثالوں کی روشنی میں حسب ذیل اصول قائم ہو سکتے ہیں:

(۱) الف پر ختم ہونے والے دیسی الفاظ اگر مذکر ہیں تو حالت جمع میں ان کا الف ساقط ہو جائے گا۔ ([مہا] راجا/ راجاؤں استثنائی ہے۔ لیکن "[مہا] راجوں" بھی سنا گیا ہے، کیونکہ "[مہا] راجہ" بھی مستعمل ہے)۔

(۲) الف پر ختم ہونے والے دیسی الفاظ اگر مونث ہیں تو حالت جمع میں ان پر نون غنہ یا نون غنہ بسقوط الف بڑھایا جائے گا:

ٹھلیا ٹھلیاں ٹھلیوں: چڑیا، چڑیاں، چڑیوں: کلبیا، کلبیاں کلبیوں

(۳) یا ان پر ہمزہ و واؤ نون غنہ/ ہمزہ یائے نون غنہ بڑھائے جائیں گے:

آتما، آتماؤں/ ئیں: جتا، جتاؤں/ ئیں: چتا، چتاؤں/ ئیں: سیوا، سیواؤں/ ئیں: مینا [اول مفتوح] میناؤں/ ئیں

ملحوظ رہے کہ ''بڑھیا، بڑھیاں، بڑھیوں'' اس حکم میں نہیں ہے کہ یہ دراصل ''بوڑھی، بوڑھیاں، بوڑھیوں'' ہے۔

(۴) الف پر ختم ہونے والے الفاظ اگر بزرگی کا رشتہ بیان کرتے ہیں (ابا، تایا، چچا، دادا، نانا، وغیرہ) تو حالت جمع میں ان پر ہمزہ واو نون غنہ/ ہمزہ یاے نون غنہ بڑھائے جائیں گے، وعام اس سے کہ وہ لفظ غیر زبان کے ہیں یا دیسی ہیں۔ لفظ ''خالہ'' بھی اسی حکم میں ہے، شاید اس لیے کہ اس کا املا الف سے بھی مروج ہے۔ لفظ ''آیا'' بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ ''آیا'' کے اصل معنی ''ماں'' کے ہیں۔

(۵) ہاے ہوز پر ختم ہونے والے الفاظ کی ہاے ہوز اگر حالت جمع میں ساقط نہ ہو تو وہ ہاے مختفی نہیں ہے۔ اور اگر ساقط ہو تو وہ ہاے مختفی ہے، وعام اس سے کہ وہ لفظ غیر زبان کے ہیں یا دیسی ہیں۔

(۶) الف پر ختم ہونے والے عربی فارسی الفاظ پر حالت جمع میں ہمزہ واو نون غنہ/ ہمزہ یاے نون غنہ بڑھائے جائیں گے۔

خدا، خداؤں: دریا، دریاؤں: دوا، دواؤں/ ئیں: نوا، نواؤں/ ئیں

اس کے بعض مستثنیات ہیں: تقاضا/ تقاضوں، تقاضے: تماشا/ تماشے، تماشوں، تماشاؤں: وغیرہ۔

یہ اطلاع دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ غلط اصول کہ ''ہندی'' میں ہاے مختفی نہیں ہے، ہمارے یہاں مدت سے دباؤ ڈالتا رہا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ وہ دیسی الفاظ، جو ہاے مختفی سے لکھے جاتے ہیں، انھیں الف سے لکھا جائے۔ یعنی ہاے مختفی کے حامل اردو کے دیسی الفاظ ہاے مختفی سے الف کی طرف انتقال پذیر رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آج کل کئی لوگ حسب ذیل املا اختیار کرنے کے حق میں ہیں، اگرچہ یہ املے سب یکساں طور پر مقبول نہیں ہیں، اور نہ ان میں کوئی ایسا ہے کہ سب نے اسے قبول کر لیا ہو:

املا؛ بارا، پتا [بتخفیف فوقانی]، پتا [بتشدید فوقانی]، پیسا، خاکا [کیوں کہ یہ فارسی میں نہیں ہے، ''ہندی'' ہے]، راستا، رستا، روپیا، سفیدا، گولا، گھنٹا، مہینا، نقشا [کیوں کہ یہ فارسی عربی میں نہیں ہے، ''ہندی'' ہے]، میلا، بلا [لام مفتوح مشدد]،

وغیرہ۔

مندرجہ بالا املے ابھی پوری طرح رائج نہیں ہیں، لیکن مندرجہ ذیل الفاظ کا املا چند دہائی پہلے تک ہائے مختفی سے بھی متداول تھا۔ اب الف نے ہائے مختفی کو کم وبیش بالکل باہر کر دیا ہے:

انڈا [انڈہ]، باجا [باجہ]، بھتیجا [بھتیجہ]، بیڑا [بیڑہ]، جوتا [جوتہ]، جھانسا [جھانسہ]، چونا [چونہ]، ڈبا [ڈبہ]، رسا [رسہ، ''رسہ کشی'' اب بھی متداول ہے]؛ کرتا [کرتہ]، کلیجا [کلیجہ]، وغیرہ۔

حسب ذیل الفاظ اب بھی دونوں طرح عام ہیں، لیکن مع الف زیادہ نظر آتے ہیں:

ٹھکانا، ٹھکانہ؛ دھبا، دھبہ؛ دھوکا، دھوکہ؛ راجا، راجہ؛ [بھی] کھاتہ: کھاتا؛ [حلوہ] مانڈہ: مانڈا؛ مہاراجا، مہاراجہ؛ وغیرہ۔

ملحوظ رہے کہ ''راجگان/مہاراجگان'' جمعیں اس لئے متداول ہیں کہ ''راجہ/مہاراجہ'' متداول ہیں۔

اردو میں ہائے مختفی کے وجود کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بے شمار جگہوں کے نام ہائے مختفی سے لکھے جاتے ہیں اور کسی نے کبھی انھیں غلط نہیں کہا:

آگرہ، بارہ، بارہہ، باندہ، بیانہ، پٹنہ، پٹیالہ، خورجہ، ستارہ [اول مفتوح]، سردھنہ، سنڈیلہ، سیالدہ، سیوہارہ، شملہ، کلکتہ [کولکتہ]، کھتہ، گونڈہ، مالدہ، مالوہ، وغیرہ۔

مزید تفحص کریں تو ''پورہ'' کا لفظ نظر آتا ہے جو سنسکرت ''پرم'' (اول مضموم) سے مخفف بنایا گیا ہے، [گورکھ پرم = پر = پور؛ رام پرم = پر = پور، وغیرہ]۔ ان گنت قصبوں، گاؤوں اور محلوں کے نام میں ''پورہ'' کا لفظ لاحقہ یا سابقہ کے طور پر ہے۔ ان ناموں کی بھی قدامت کچھ کم نہیں:

باغبان پورہ، بلوچ پورہ، بھوجی پورہ، پورہ مفتی، جوگی پورہ، شیخو پورہ، وغیرہ۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ اردو میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ ہائے مختفی کے حامل الفاظ بھی الف سے لکھے جائیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بعض کرم فرما اب ''امروہہ'' کو ''امروہا'' جیسا بدصورت املا دینے کے حق میں ہیں۔ ہائے مختفی کے خلاف یہ دباؤ خان آرزو کے وقت سے ہے۔ خان موصوف نے ''نوادر الالفاظ'' میں لکھا ہے کہ ہندیوں میں الف کے بجائے ہائے مختفی لکھنے کا رجحان ہے۔ انھوں نے ''بنگالہ، روپیہ، مالوہ'' کی مثال دی ہے کہ یہ تینوں الفاظ دراصل

الف سے ہیں، لیکن عہد عالمگیر سے ان کا املا ہائے مختفی سے رائج ہو گیا ہے۔ خان آرزو بہت بڑے آدمی ہیں لیکن کہنا پڑتا ہے کہ یہاں ان سے سہو ہوا ہے۔ ''بنگالہ'' تو حافظ کے مشہور شعر میں ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند　　زاں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس غزل کے قافیے ''لالہ، غسالہ'' وغیرہ ہیں، لہٰذا ''بنگالہ'' میں ہائے مختفی کا وجود قدیم الایام سے ہے۔ ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ایک غزل میں بہت سے دیسی الفاظ کو ہائے مختفی کے ساتھ قافیے میں نظم کیا ہے۔ ظفر صاحب نے چھ شعر کی نہایت پر لطف غزل نقل کی ہے، میں تین شعر پیش کرتا ہوں، ملاحظہ ہو

سروے چو تو دراچہ و در ستہ نہ باشد　　گل مثل رخ خوب تو البتہ نہ باشد

دوزیم قبا بہر قدت از گل سوری　　تا خلعت زیبائے تو ازلتہ نہ باشد

در جنت و فردوس کے رانہ گذارند　　تا داغ غلامی تو اش پتہ نہ باشد

اچہ = اچھا (شہر کا نام)؛ ستہ = ٹھٹھ (شہر کا نام)؛ لتہ = لتا، چیتھڑا؛ پتہ = پتا

ان قافیوں سے میری اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ شروع ہی سے اردو املا کا رجحان ہائے ہوز کی طرف رہا ہے لیکن کتابی لوگ یہی چاہتے رہے ہیں کہ دیسی لفظوں کی ہائے مختفی کو الف سے بدل دیا جائے۔ ''مالوہ'' کو الف سے لکھا ہوا میں نے نہیں دیکھا، اور ''شب مالوہ'' کی مشہور ترکیب ہے جس میں ''مالوہ'' سب لوگ ہائے مختفی سے لکھتے آئے ہیں۔ ''روپیہ'' کے بارے میں کچھ یقین سے کہنا مشکل ہے، لیکن خان آرزو خود ہی کہتے ہیں کہ عہد عالمگیر میں اسے ہائے مختفی سے لکھنا شروع کیا گیا۔ لہٰذا یہ املا کم سے کم تین سو برس سے رائج ہے، اس میں تبدیلی اب وہی کرنا چاہے گا جسے زبان میں خواہ مخواہ کے لئے چھیڑ کا سکہ چلانا منظور ہو۔ ''بنگالہ'' کو ''بنگالا'' لکھنے والا بھی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ لغت نگاروں اور بزعم خود ''مصلحان املائے اردو'' کے دباؤ کی وجہ سے اردو میں رجحان پیدا ہوا کہ ''ہندی'' [=دیسی] سے ہائے مختفی کو ''مخصوص بہ فارسی'' کہہ کر اردو سے خارج کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعض پرانے لغات میں درج املا کا تقابلی مطالعہ کارآمد ہوگا۔ میں یہاں بعض لغات سے الف تا ہائے فارسی کی تقطیع سے ہائے مختفی والے کچھ الفاظ پیش کرتا

ہوں:

غرائب اللغات (تقریباً ۱۶۹۰)	نوادر الالفاظ (تقریباً ۱۷۴۶)	شیکسپیئر (۱۸۳۴)	نفائس اللغات (تحریر ۱۸۳۷ء)	نور اللغات (۱۹۲۴ء۔۱۹۲۷ء)
اڈا	اڈا	موجود نہیں	اڈا	اڈا
اکھاڑا	اکھاڑا	اکھاڑا	اکھاڑا	اکھاڑا
باجرہ	باجرا	موجود نہیں	باجرہ	باجرا
باڈ گولہ	باڈ گولا	موجود نہیں	باڈ گولہ	باڈ گولا
بھپارہ	بھپارا	موجود نہیں	بھپارہ	بھپارا
پاڑہ	پاڈھا/ پاڑھا	موجود نہیں	پاڑہ	پاڑا/ پاڑھا
پتنگ	پتنگا	پتنگا	پتنگ	پتنگا
پرہ	پرا	پرہ/ پرہ باندھنا	پرہ	پرا
پنگھوڑہ	پنگھورا	موجود نہیں	پنگھوڑہ	پنگوڑا

مندرجہ بالا نقشے سے ظاہر ہے کہ ہائے مختفی کے بارے میں غلط فہمی نے اردو میں یہ دباؤ پیدا کیا کہ جو دیسی لفظ ہائے مختفی سے لکھے جاتے ہیں ان میں ہائے مختفی ترک کر کے الف لگایا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ''غرائب'' اور ''نوادر'' کی فہرست بالا میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کی ہائے مختفی شیکسپیئر اور ''نور'' نے باقی رکھی ہو۔ عام لکھنے والے، یعنی زبان کے اصل وارث، بھی اس دباؤ میں آ گئے اور کئی الفاظ کے مروج املا سے ہائے مختفی کا اخراج کر کے اس کی جگہ الف داخل کر دیا گیا۔

ڈونلڈ بیکر (Donald Becker) کے لغات معکوس اردو (Reverse Dictionary of Urdu) مطبوعہ ۱۹۸۰ میں حسب ذیل الفاظ ہائے مختفی سے دکھائے گئے ہیں:

چھاپہ پتہ بوتہ لتہ بچہ رندہ دھندہ

گذشتہ بیس پچیس برس میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ اب یہ الفاظ شاذ ہی الف مختفی سے لکھے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی بھی اسی بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے یہاں دیسی الفاظ سے ہائے مختفی کو ہٹا کر الف ڈالنے کا رجحان کارفرما رہا ہے، اور اب بھی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب بولنے لکھنے والوں میں ایک رجحان ہے تو ہم لوگ اس کی مذمت کرنے والے اور اسے روکنے کی کوشش کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ یہ اعتراض بالکل درست ہوتا اگر ہائے مختفی کو ہٹا کر الف رکھنے کا رجحان کسی تاریخی عمل، یا غیر شعوری جھکاؤ کے سبب ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ گذشتہ سوڈیڑھ سو برس سے ہمارے اساتذہ اور ماہرین نے یہ دباؤ پیدا کیا، یعنی اس وقت سے، جب سے ''ہندی'' اور ''اردو'' الگ الگ زبانیں قرار دی گئیں۔ (میں سیاسی طور پر الگ قرار دینے کی بات نہیں کہہ رہا ہوں، لسانی اور علمی سطح پر اس جھوٹی تفریق کے قائم ہو جانے کی بات کر رہا ہوں)۔ ''ہندی'' اور ''اردو'' کی تفریق کا آسان معیار یہ مقرر کیا گیا کہ جو الفاظ عربی فارسی سے آئے ہیں وہ اردو کا مابہ الامتیاز ہیں، اور جو الفاظ سنسکرت، پراکرتوں، اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے آئے ہیں، وہ ''ہندی'' ہیں۔ ظاہر ہے کہ لسانیات کی رو سے یہ مہمل ترین بات ہے۔ لیکن اسی بات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ''ہندی'' میں ہائے مختفی کے موجود نہ ہونے کا افسانہ تراشا گیا اور اردو کے اچھے، خوبصورت، بامعنی الفاظ جو ہائے مختفی سے لکھے جاتے اور خوبصورت معلوم ہوتے تھے، انھیں الف سے لکھ کر بدصورت بنانے پر اصرار کیا گیا، اور اس مہم میں جگہ جگہ کامیابی بھی ہوئی۔

لہٰذا ہائے مختفی کو ہٹا کر الف لکھنے کا رجحان ہماری زبان کا فطری رجحان نہیں، بلکہ اگر خان آرزو کی بات درست مانی جائے تو ہماری زبان کا فطری رجحان الف کو ہٹا کر ہائے مختفی لکھنے کی طرف ہے۔ میں خان موصوف کی یہ بات نہیں مانتا کہ ''ہندی'' لوگ فارسی عربی کی ہائے مختفی کو الف سے، اور اپنے اصل الفاظ کو الف کے بجائے ہائے مختفی سے لکھنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے بعض شاعروں نے بعض جگہ تلفظ کی پابندی کرتے ہوئے ہائے مختفی کو قافیے میں الف ضرور کر دیا ہے، لیکن وہ صورت استثنا کی ہے، عام املا کی نہیں۔ صوتی اعتبار سے اردو کا اصل رجحان یہ ہے کہ لفظ کے آخری الف کو عام بول چال میں بہت لمبا نہ کیا جائے، بلکہ لکھنے میں جس طرح عام ہو گیا ہے (الف سے یا ہائے ہوز سے)، اسی طرح لکھا جائے۔ اور اگر کسی لفظ کے بارے میں شک ہو کہ اس کا عام املا کیا ہے، تو جس طرح اچھا لگے اس طرح لکھا جائے، اس لحاظ کے ساتھ کہ تلفظ میں اگر ہائے مختفی ہے تو حتی الامکان اس کا لحاظ رکھا جائے۔ اور حتی الامکان یہ خیال

بھی رکھا جائے کہ ایک لفظ کا ایک ہی املا ہو اور سب اس کی پابندی کریں۔

لہٰذا اردو میں ہائے مختفی کے بارے میں صحیح فیصلے حسب ذیل ہیں:

(۱) اردو میں ہائے مختفی ہے۔ اور

(۲) اس کا اطلاق دیسی اور بدیسی ہر طرح کے الفاظ پر ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے۔

(۳) جن الفاظ میں کسی نہ کسی باعث ہائے مختفی کو ہٹا کر الف رائج کر دیا گیا ہے ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

(۴) جو الفاظ ہائے مختفی سے بھی لکھے جا رہے ہیں اور الف سے بھی، انھیں ہائے مختفی سے لکھا جائے تو بہتر ہے لیکن اس کے لئے دوسروں پر جبر نہ کرنا چاہئے۔

(۵) جن الفاظ کی ہائے مختفی ابھی قائم ہے، یا بہت ہی کم ایسا ہے کہ ہائے مختفی کو ہٹا کر الف لکھا جا رہا ہو (جیسے ''امروہہ'' کی جگہ ''امروہا'') تو ان الفاظ کو ہائے مختفی سے لکھنے پر اصرار کیا جائے۔

ہائے ہوز کا اضافہ، لفظ کے اخیر میں فارسی میں رواج ہے کہ کبھی کبھی لفظ کے آخر میں ہائے ہوز بڑھا دیتے ہیں۔ معنی وہی رہتے ہیں لیکن ایک نیا لفظ ہاتھ آ جاتا ہے، اور لفظ تازہ کا حسن اپنی جگہ پر ہے ہی، جیسے ''آواز/آوازہ''۔ فارسی نے عربی کے بہت سے الفاظ پر بھی یہی عمل کیا ہے، جیسے ''موج/موجہ''۔ اردو نے اس نہج کے تقریباً تمام الفاظ کو فارسی سے لے لیا ہے، اور خود اپنے بھی لفظ بنائے ہیں، جیسے ''خرچ/خرچہ؛ قرض/قرضہ''۔ اردو میں یہ بھی ہے کہ ہائے ہوز کے اضافے سے بعض اوقات معنی بدل جاتے ہیں، جیسے ''دہانہ'' اور ''دہان''، اور اکثر جنس بدل جاتی ہے، یعنی اصل لفظ اگر مونث ہو تو محرف لفظ مذکر ہو جاتا ہے، ''یا ''موج'' مونث ہے، اور ''موجہ'' مذکر۔ دیکھئے: ''آوازہ''۔

ہجڑا دیکھئے: ''ہیجڑا''۔

ہجے یہ لفظ جمع مذکر ہے۔ آج اس لفظ کو کسی اور طرح استعمال کرنا غیر مناسب ہوگا۔

غلط اور نامناسب: اس لفظ کا ہجے کرو۔

صحیح: اس لفظ کے ہجے کرو۔

غلط اور نامناسب: اس لفظ کی ہجے کیا ہے؟

صحیح: اس لفظ کے ہجے کیا ہیں؟

جلیل مانک پوری اپنے رسالہ ''تذکیر و تانیث'' میں تصدیق کرتے ہیں کہ یہ لفظ جمع مذکر ہے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' پلیٹس، اور فیلن بھی اسے مذکر قرار دیتے ہیں۔ شیکسپیر (Shakespear) نے بھی اپنے لغت (۱۸۳۴) میں اسے مذکر لکھا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کی تذکیر جدید زمانے میں نہیں شروع ہوئی، جیسا کہ بعض الفاظ (مثلاً ''آبشار'') کے ساتھ ہوا ہے۔ دیکھئے: ''املا''۔

ہد ہد مشہور چڑیا، یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

ہرج دیکھئے: ''حرج''۔

ہرجانہ دیکھئے: ''حرج''۔

ہرجہ اول مفتوح دوم ساکن۔ اردو والوں نے ''ہرج'' پر ہائے ہوز بڑھا کر بنالیا ہے، لیکن اس کے معنی محض ''نقصان'' کے ہیں، مالی نقصان یا وقت کا نقصان۔ یہ لفظ نہ فارسی میں ہے نہ عربی میں، لیکن اردو میں ہمیشہ ہائے ہوز سے لکھا جاتا ہے، الف سے نہیں۔

ہرن بمعنی ''آہو''۔ ''نور اللغات'' میں اس لفظ کا تلفظ بفتح اول و دوم (ہَرَن) اور بکسر اول وفتح دوم (ہِرَن)، دونوں طرح درج ہے۔ پلیٹس نے یہ دونوں تلفظ لکھے ہیں اور اول مفتوح، دوم مکسور (ہَرِن) بھی لکھا ہے۔ یہ تلفظ اب صرف آج کی ثقیل ہندی میں ملتا ہے۔ شیکسپیر نے بکسر اول وفتح دوم، اور بفتحتین، دونوں طرح لکھا ہے۔ لکھنؤ اور مشرقی علاقوں میں مع اول و دوم مفتوح عام ہے۔ باقی علاقوں میں اول مکسور اور دوم مفتوح ہی بولتے ہیں۔ شان الحق حقی نے صرف یہی تلفظ دیا ہے۔ اول دوم مفتوح کو لکھنؤ اور بلاد مشرق کا علاقائی تلفظ سمجھنا چاہئے۔ دیکھئے: ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''، دیکھئے: ''جانوروں کے نام''۔

ہزار ''بلبل''، اور ''ایک ہزار''، دونوں معنی میں یہ لفظ اول مفتوح کے ساتھ درست ہے۔ ''بلبل'' کے معنی میں بعض اہل اردو اول مکسور بولتے ہیں، لیکن یہ تلفظ ابھی رائج نہیں ہوا ہے۔ جدید ایرانی لہجے میں ''بلبل'' کے معنی میں اول مفتوح ہے اور گنتی، اول مکسور۔ یہ تلفظ اردو

کے لئے غلط ہیں۔ اردو کے لئے دونوں معنی میں اول مفتوح بولنا مرجح ہے۔

ہزار داستاں یہ فقرہ ''بلبل'' کے ساتھ کبھی کبھی استعمال میں آجاتا ہے (بلبل ہزار داستاں) کیوں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ''ہزاروں داستانوں والی بلبل''۔ لیکن بلبل کے ساتھ داستان کا کوئی تصور نہیں۔ بلبل تو گاتی ہے، داستان نہیں سناتی۔ یہ فقرہ در اصل ''بلبل ہزار دستاں'' ہے اور ''دستاں'' کے معنی ہیں ''نغمہ''، لہٰذا ''بلبل ہزار دستاں'' کے معنی ہوئے ''ہزاروں نغموں والی بلبل''۔

ہلاکت دیکھئے ''مہلوک''۔

ہما یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔ دیکھئے ''عنقا''۔

ہمت جٹانا انگریزی کا محاورہ ہے: To pluck up the courage۔ اسی مفہوم میں (کسی کام کو کرنے، یا کسی بات کو کہنے کے لئے کسی نہ کسی طرح ہمت کرنا) امریکی انگریزی میں محاورہ ہے: To pick up the courage۔ یہ محاورے عموماً اس وقت بولے جاتے ہیں جب ایک بار ہمت نہ ہوئی ہو، یا چھوٹ چکی ہو، اور دوبارہ ہمت کی جائے۔ شاید ان دونوں محاوروں کی دیکھا دیکھی ہندی والوں نے ''ہمت جٹانا'' بولنا شروع کر دیا ہے۔ اب بعض اردو والے بھی اس بدنما اختراع کو استعمال کرنے لگے ہیں۔ اردو میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کئی محاورے موجود ہیں: جرأت کرنا، ہیاؤ کھلنا، ہواؤ کھلنا (دونوں میں اول مکسور) بھی حسب ضرورت ''پڑنا، کھلنا، ہونا'' کے ساتھ بولے جاسکتے ہیں۔

غلط: میں چاہتا تھا کہ پوچھوں، پھر آپ نے مجھے بلایا ہی کیوں تھا لیکن ہمت نہ جٹا سکا۔
صحیح: میں چاہتا تھا کہ پوچھوں، پھر آپ نے مجھے بلایا ہی کیوں تھا لیکن جرأت نہ کرسکا/ جرأت نہ ہوئی/ ہواؤ نہ کھلا/ ہیاؤ نہ پڑا۔

غلط: میری تو جان ہی نکل گئی لیکن ہمت جٹا کر میں نے کہا۔۔۔
صحیح: میری تو جان ہی نکل گئی لیکن جرأت کر کے میں نے کہا۔۔۔

ہمزہ ہمزہ کی تعریف عربی میں وہ نہیں ہے جو اردو میں ہے۔ عربی میں متحرک الف کو ہمزہ کہتے

ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں الف کو ہمیشہ ساکن فرض کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ بے شمار عربی الفاظ میں الف متحرک ہوتا ہے، لہٰذا ایسی صورتوں میں الف کو ہمزہ کہہ دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، عربی میں ہمزہ کوئی مستقل حرف نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ فہرست ابجد میں ہمزہ نہیں ہے۔ اگر ہمزہ عربی میں حرف ہوتا تو اس کی بھی قیمت ہوتی اور ابجد کی فہرست میں بھی یہ شامل ہوتا۔ اس کے برخلاف، اردو میں ہمزہ ایک حرف ہے اور حروف تہجی کا حصہ ہے۔ اردو کے قاعدۂ ابجد میں ہمزہ داخل کرنا اور اس کی کوئی قیمت مقرر کرنا قطعاً صحیح ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف قیمتیں مقرر کی ہیں۔ دیکھئے ''الف''۔

ہمزہ کا ضروری استعمال اردو میں ہمزہ کو بعض ایسے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو عربی فارسی میں نہیں ہیں۔ ہمزہ کا ایک اہم تفاعل اردو میں یہ ہے کہ یہ دو حرفوں کے درمیان آواز کے پھسلنے یعنی Glide کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ یہ صفت فارسی اور عربی میں نہیں ہے۔ ''آئیو، آئے، جائیے، لیجئے، ہوئے'' وغیرہ الفاظ میں ہمزہ کی مدد سے جو آواز بنتی ہے وہ خالص واؤ یا خالص یائے کی نہیں رہ جاتی۔ یہ آواز اردو سے خاص ہے اور یہ الفاظ بھی اردو سے خاص ہیں۔ بعض لوگ ان الفاظ میں بھی ہمزہ نہیں لکھتے جہاں مدت مدید سے ہمزہ لکھا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے لسانیات کی رو سے اس میں کوئی خوبی ہو، لیکن اردو املا کی رو سے یہ عمل قطعی غلط ہے۔ مثلاً حسب ذیل الفاظ میں ہمزہ ضروری ہے:

آؤ [''آو'' غلط]: آئے [''آے'' غلط]: بھاؤ [''بھاو'' غلط]: بھائی [''بھای'' غلط]: جاؤ [''جاو'' غلط]: جائے ''جاے'' غلط]: جماؤ [''جماو'' غلط]: کوئی [''کوی'' غلط]: گئے [''گیے'' غلط]: تاؤ [''تاو'' غلط]: ہوئے [''ہوے'' غلط]: وغیرہ۔

ایک افسوسناک بات جو اب اکثر دیکھنے میں آرہی ہے، وہ اضافتوں کے درمیان ہمزہ کا حذف ہے۔ اس میں شاید کمپیوٹر کی مہربانی ہے، کہ بہت سے پروگرام، یا بہت سے لوگ، اس کا التزام نہیں رکھتے کہ اضافت کے مابین ہمزہ لگایا جائے۔ مثلاً حسب ذیل املے دیکھنے کو مل رہے ہیں، جو بالکل غلط ہیں اور طالب علم کے لئے الجھن پیدا کرتے ہیں:

پردۂ غفلت [صحیح : پردہ غفلت] : جامۂ احرام [صحیح : جامہ احرام] نقطۂ نظر [نقطہ نظر] : نمونۂ کلام [صحیح : نمونہ کلام] : وعدۂ شب [صحیح : وعدہ شب] ۔

اس غلط رجحان کی مذمت ہونی چاہیے اور اسے بالکل ترک کرنا چاہیے۔ دیکھیے: ''الف اور ہمزہ''۔

ہمزہ کا غیر ضروری استعمال

عربی کے صدہا لفظوں کے آخر میں الف اور ہمزہ ہے، مثلاً ''حکماء، انشاء، بناء، استدعاء، بلاء، دواء'' وغیرہ۔ اردو فارسی نے ایسے تمام لفظوں سے ہمزہ حذف کر دیا ہے، حتیٰ کہ شعر میں بھی ایسے لفظوں کے ہمزہ کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ادھر پاکستان میں یہ رسم چلی ہے کہ اس طرح کے الفاظ میں ہمزہ ضرور لکھا جائے۔ یہ بالکل غلط اور واجب الترک ہے، کہ اس سے صرف انتشار پھیلے گا۔ اس سے بدتر یہ کہ ہمزہ کے شوق میں ان لفظوں کے بھی آخر میں ہمزہ لگایا جا رہا ہے جہاں ہمزہ ہے ہی نہیں، مثلاً ''دنیا''، ''عطایا''، وغیرہ۔ اور تو اور، انگریزی لفظ Law، جس میں ہمزہ کا نام و نشان نہیں، اب پاکستان میں کچھ لوگ اسے ''لاء'' لکھتے ہیں۔ میری چھوٹی بہن لاہور سے مجھے خط لکھتی ہے تو مجھے ''بھیاء'' لکھتی ہے۔ ابھی ایک اردو اخبار نے ''آسٹریلیاء'' لکھا ہے۔ سبحان اللہ۔ ہمزہ کے اس غیر ضروری اور غلط استعمال کو بالکل ترک کرنا چاہیے۔

الف پر ہمزہ مزید علیہ لگانے سے بھی زیادہ ایک رسم چل پڑی ہے کہ جن لفظوں میں (خاص کر حاصل مصدر الفاظ میں اور جمع کے الفاظ میں)، جہاں ہمزہ ضروری ہے وہاں ہمزہ کی جگہ یائے تحتانی کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فارسی کے اساتذہ اور عربی کے علما اس میں پیش پیش ہیں۔ خیر، فارسی والے تو حتی الامکان ہمزہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں، لیکن عربی میں تو ہمزہ اہم ترین حروف میں ہے اور اکثر جہاں الف متحرک ہونا چاہیے، وہاں عربی والے ہمزہ لگا دیتے ہیں کیونکہ عربی میں الف ہمیشہ ساکن آتا ہے۔ افسوس یہ کہ اکثر عربی داں حضرات عربی جمعوں (مثلاً ''حقائق''، ''نفائس'') وغیرہ کو یائے سے لکھنے لگے ہیں (''حقایق، نفایس'') یہ بالکل غلط اور قاعدۂ جمہور اردو کے خلاف ہے۔ عربی جمعوں میں ہمزہ جزو لازم ہے، اور اردو والوں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر فارسی الاصل حاصل مصادر میں ہمزہ لگانا اختیار کیا ہے۔ یائے تحتانی کے جھگڑے میں پڑ کر تلفظ بگاڑنے سے اردو والوں نے انکار کیا ہے۔ مثلاً:

آزمائش؛ آسائش؛ پیدائش؛ چیائش؛ فرمائش؛ گنجائش، وغیرہ۔

بعض لوگ انھیں یوں لکھنا چاہتے ہیں:

آزمایش؛ آسایش؛ پیدایش؛ پیمایش؛ فرمایش؛ کشایش؛ گنجایش، وغیرہ۔

یہ بات سامنے کی ہے کہ ہم لوگ ان الفاظ میں ہمزہ سے الف کا کام لے رہے ہیں۔ اگر ہمزہ نہ ہوتا تو ہم لوگ یہ الفاظ یوں لکھتے:

آزمااش؛ آسااش؛ پیدااش؛ پیمااش؛ فرمااش؛ کشااش؛ گنجااش، وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ طرز نگارش بھونڈا بھی ہے اور غلطیوں کا کثیر امکان رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف ''آزمایش'' لکھیں تو یاے تحتانی پر کسرہ ہونے کے باعث اس لفظ کو ''آزمایِش'' پڑھنا پڑے گا، یعنی الف کی جگہ یاے تحتانی کو مل جائے گی۔ املا بھی بگڑا، تلفظ بھی بگڑا۔ لہٰذا جو لوگ ''آزمائش'' وغیرہ کی جگہ ''آزمایش'' لکھنے کی سفارش کرتے ہیں وہ اردو املا اور تلفظ کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ اور جو لوگ مفاعل کے وزن پر عربی جمعوں میں ہمزہ کی جگہ یاے لکھتے ہیں وہ دہری غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، حسب ذیل املے بالکل غلط ہیں:

جزایر؛ حدایق؛ حقایق؛ عقاید؛ فایدہ؛ فضایل؛ قراین؛ مصایب؛ معایب؛ ملایک؛ نقایص، وغیرہ۔

ان الفاظ کا صحیح املا حسب ذیل ہے:

جزائر؛ حدائق؛ حقائق؛ عقائد؛ فائدہ؛ فضائل؛ قرائن؛ مصائب؛ معائب؛ ملائک؛ نقائص، وغیرہ۔

اسی طرح، بعض لوگ ہمزہ لگانے کے جوش میں جہاں یاے تحتانی ہے وہاں بھی ہمزہ لگا دیتے ہیں۔ حسب ذیل املے سب غلط ہیں:

آئت [صحیح: آیت]؛ شائد [صحیح: شاید]؛ قائدہ [صحیح: قاعدہ]، وغیرہ۔

مزید دیکھیے، ''الف''۔

ہمشیر اردو میں اب یہ لفظ ''رشتے کی بہن'' اور ''سگی بہن'' دونوں معنی میں کبھی کبھی بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کے اصل معنی ''دودھ شریک بھائی یا بہن'' کے ہیں۔ پرانے زمانے میں صرف ''بھائی'' کے معنی میں بھی رہا ہوگا، جیسا کہ آبرو کے اس شعر میں ہے ؎

سارے معالجوں میں جلاب خوب تر ہے ہمشیر ان سموں کا پہچانتے ہو ہر ہے

غالب نے انوارالدولہ شفق کے نام ایک خط میں اس لفظ کو یوں استعمال کیا ہے کہ معنی بالکل واضح ہو گئے ہیں:

وہ میرا ہمشیر بھی تھا، یعنی میں نے اس کی ماں کا اور اس نے اپنی پھوپی کا دودھ پیا تھا۔

ہمشیرہ یہاں "دودھ شریک بھائی یا بہن" کے معنی میں ہائے ہوز زائد ہے، یعنی مذکورہ بالا معنی میں "ہمشیر" اور "ہمشیرہ" ایک ہیں۔ "لغت نامۂ دہخدا" میں وضاحت سے لکھا ہے کہ "ہمشیرہ" یعنی دودھ شریک بھائی یا بہن کے لئے ایک ہی دایہ کا دودھ پینا ضروری ہے، آپس میں رشتہ دار ہونا ضروری نہیں۔ آگے درج ہے کہ "در تداول امروز" [یعنی اس زمانے کے رواج میں] یہ لفظ "خواہر" [یعنی "سگی بہن"] کے معنی میں برتا جاتا ہے۔ لہٰذا ان معنی میں یہ ایک طرح سے "ہمشیر" کی تانیث ہوا۔ اردو میں "ہمشیرہ" بہ معنی "سگی بہن" بہت زمانے سے مستعمل ہے، لیکن فارسی میں بظاہر اس کا رواج گذشتہ آٹھ دس دہائیوں سے زیادہ پرانا نہیں، جیسا کہ "لغت نامۂ دہخدا" سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ فارسی کے کسی قدیم لغت میں "ہمشیرہ" بمعنی "خواہر" کا اندراج نہیں۔ لہٰذا کیا عجب کہ اس معنی میں یہ لفظ اردو سے فارسی میں گیا ہو۔

ہنس دینا عام خیال ہے کہ "ہنس دینا" کے ساتھ "نے" نہیں لگتا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے لکھا ہے کہ "میں نے ہنس دیا" ناجائز ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر "ہنس دینا" کے ساتھ "نے" لگانے کا محل ہو تو آج کل عبارت ایسی بناتے ہیں کہ "نے" کے بغیر کام چل جائے۔ لیکن "میں نے ہنس دیا" کو غلط کہنا مشکل ہے۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں (در بیان غالب، حالات قیام کلکتہ) لکھا ہے:

دوسرے نے "گلستاں" کا فقرہ پڑھا: یکے از صلحا رایاد مخالف در شکم پیچید؛ اور سب نے ہنس دیا۔

آج کل "سب ہنس پڑے/سب ہنس دیئے" لکھنا بہتر ہوگا، لیکن محمد حسین آزاد کی سند کے بعد اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔ حسرت موہانی نے بھی اسی طرح کا فقرہ "نوادر سخن" میں نقل کیا ہے اور اسے شاذ استعمال شمار کیا ہے، لیکن اسے غلط نہیں کہا۔ دیکھئے "رو دینا"۔

ہودہ اول مفتوح، مذکر۔ یہ لفظ اردو والوں نے ''حوض'' کی شکل بدل کر بنالیا ہے۔ بلاد مشرق میں اسے پانی کی بڑی ناند کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان معنی میں یہ لفظ نہ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں ہے، نہ ''نور''، یا ''آصفیہ''، یا شیکسپیر، یا کسی بھی بڑے لغت میں۔ دیکھئے ''ہودی''؛ مزید دیکھئے ''کھیل''۔

ہودی اول مفتوح، مونث۔ راہگیروں وغیرہ کے پانی پینے کی خاطر سر راہ بنا ہوا چھوٹا حوض دہلی میں ''ہودی'' کہلاتا ہے۔ بلاد مشرق میں یہ لفظ جانوروں کے پانی پینے کی ناند کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لفظ کا اندراج نہ ''آصفیہ'' میں ہے نہ ''نور'' میں۔ شیکسپیر اور پلیٹس میں بھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ ''ہودہ'' کی تصغیر ہے، اور ''ہودہ'' خود ''حوض'' کے عربی تلفظ کی نقل ہے۔ دیکھئے، ''کھیل''؛ دیکھئے، ''ہودہ''۔

ہو رہے دیکھئے ''ہوئے، جا رہے، وغیرہ''۔

ہوئے، جا رہے، وغیرہ ''جا رہے''؛ ''چکے''؛ ''گئے''؛ ''ہو رہے'' وغیرہ فعل مجہول کی غلط شکلوں کی ایک اور مثال ''ہوئے'' کا استعمال ہے۔ یہ بات غور کے قابل ہے کہ ''جا رہے''؛ ''ہوئے'' وغیرہ الفاظ انگریزی کی نقل میں لائے جا رہے ہیں اور اردو میں اکثر ان کے بغیر کام چل جاتا ہے:

غلط اور قبیح: کل رات کو ہوئے ایک جھگڑے میں۔۔۔

صحیح: کل رات کو ایک جھگڑے میں۔۔۔ یا ایک جھگڑے میں، جو کل رات واقع ہوا۔۔۔

غلط اور قبیح: دوشنبہ کو ہوئی ایک واردات۔۔۔

صحیح: دوشنبہ کی ایک واردات، یا ایک واردات میں، جو دوشنبہ کو واقع ہوئی۔۔۔

غلط: پانچ میچ کھیل چکے کھلاڑی۔۔۔

صحیح: پانچ میچ کھیلے ہوئے کھلاڑی۔۔۔/ پانچ میچوں کا تجربہ رکھنے والے کھلاڑی۔۔۔

اردو کھڑی بولی کی ادائگی اور اس کا صرف، دونوں آہستہ رو ہیں، انگریزی کی سی تیزی یہاں نہیں ہے۔ ہندی والے اس سے بے خبر ہیں، لہٰذا انھوں نے انگریزی کے صرف کی شکلیں اٹھالی ہیں، اگرچہ وہ کھڑی بولی اردو سے بالکل موافقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً انگریزی کی ایک خاص صفت

gerundial infinitive ہے جسے ماضی مطلق کے ساتھ جوڑ کر حال استمرار بناتے ہیں:

The tournament which is being played between three countries...

The reforms which are being implemented by the U.N.O...

The battle being fought in England..

اردو میں ان عبارتوں کا ترجمہ یوں ہوگا:

صحیح: ٹورنامنٹ، جو تین ملکوں کے درمیان کھیلا جا رہا ہے۔۔۔

صحیح: اصلاحات، جنھیں اقوام متحدہ عمل میں لا رہی ہے۔۔۔

صحیح: جنگ، جو انگلستان میں لڑی جا رہی ہے۔۔۔

ان کے برخلاف، ہم لوگ ہندی کی نقل میں یوں لکھنے لگے ہیں:

غلط: تین ملکوں کے درمیان کھیلے جا رہے ٹورنامنٹ۔۔۔

غلط: اقوام متحدہ کے ذریعہ لائی جا رہی اصلاحات۔۔۔

غلط: انگلستان میں لڑی جا رہی جنگ۔۔۔

ایسی ہی ایک صورت ''ہوئی/ہوئے'' کے ساتھ بھی ہم لوگوں نے اپنے اوپر عائد کر لی ہے۔

غلط اور قبیح: شاکھا لگانے پر ہوئے جھگڑے میں آر۔ایس۔ایس۔ کے کچھ ورکروں نے اس مسئلے پر ہوئی تکرار کے اگلے دن۔۔۔

صحیح: شاکھا لگانے پر جو اختلاف رائے ہوا تھا، اور اس وجہ سے اس مسئلے پر جو تکرار ہوئی تھی، اس کے اگلے دن آر۔ایس۔ایس۔ کے کچھ کارکنان نے۔۔۔

غلط اور قبیح: گویوں کے ذریعہ گایا جا رہا گیت۔۔۔

صحیح: گیت، جسے گویے گا رہے تھے۔۔۔

حسب ذیل جملہ دونوں عیوب، فعل ناقص اور صیغۂ ماضی کے غلط استعمال، کے باعث حد درجہ قبیح و غلط ہے:

براتیوں کو لے جا رہی جیپ بس سے ٹکرائی۔

یہاں اور کچھ نہیں تو ''جاتی ہوئی'' اور ''ٹکرا گئی'' لکھنا چاہئے تھا۔ افسوس ہے کہ اردو جیسی سڈول

اور کل زبان کے ذمہ دار حضرات ایک پیچھے سے تھے ایسی غلطیاں کریں۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ دوسرے افعال اور افعال کے دوسرے صیغوں پر بھی صادق آتا ہے: ہوا؛ کھیل چکا / بچھے؛ گرا / گرے؛ مچا / مچے، وغیرہ افعال کی بھی صورت بگاڑنے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ایک اردو ادیب نے حال میں فرمایا:

[فلاں معاملے] پر مچے بوال کے تناظر میں کافی کارآمد اور پر مغز مضمون ہے۔

''بوال'' کا وبال اپنی جگہ پر، ''مچے'' کے ساتھ ''ہوئے'' لکھنا بھی جسے گوارا نہ ہو وہ اردو کیوں لکھے؟ اسی طرح ہم حسب ذیل طرح کے فقرے جملے پڑھتے ہیں تو تکلیف ہوتی ہے:

دس میچ کھیل چکے کھلاڑی نے کہا۔

زمین پر گرے بچوں نے رونا شروع کیا۔

انھیں یوں کہنے میں کچھ مشکل نہ تھی:

دس میچ کھیلے ہوئے کھلاڑی نے کہا۔

زمین پر گرے ہوئے بچوں نے رونا شروع کیا۔

لیکن ہم اردو والے اب ہندی سے اس قدر مغلوب نظر آتے ہیں کہ یہی لیل ونہار رہے تو ہم اپنی زبان ہی بھول جائیں گے۔

ہوئی، ہو رہی، وغیرہ دیکھیے ''ہوئے، جا رہے، وغیرہ''۔

ہی حرف حصر یا حرف تاکید کے طور پر ''ہی'' کا ایک ہی قاعدہ ہے۔ اسے اس لفظ کے فوراً بعد آنا چاہیے جس پر تاکید یا جس کا حصر (محدود کرنا) مقصود ہو۔ حسرت موہانی نے داغ کے اس شعر پر بجا اعتراض کیا ہے

ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گذاری ہمیں نے رات ہم نے ہی انتظار کیا تم نے کیا کیا

حسرت موہانی کہتے ہیں کہ جس طرح مصرع اولیٰ میں ''ہمیں نے'' [= ہم ہی نے] تھا، اسی طرح مصرع ثانی میں ''ہم ہی نے'' ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ممکن ہے داغ نے تکرار سے بچنے کے لیے ''ہم نے ہی'' لکھا ہو۔ بہر حال، داغ کے صرف کو ہم تصرف کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ایسے تصرفات کئی بڑے شعرا نے کیے ہیں۔ لیکن ان دنوں ''ہی'' کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اسے تصرف

نہیں کہا جا سکتا:

غلط: آپ کے ہی عزیزوں میں ایک صاحب ہیں، ان نے ہی یہ دو الکھی تھی۔

صحیح: آپ ہی کے۔۔۔ان ہی/انھیں/انھی نے۔۔۔

غلط: نہ ہی وہاں جانا ٹھیک تھا، اور نہ ہی ان کا آنا ٹھیک تھا۔

صحیح: نہ وہاں جانا ہی۔۔۔آنا ہی۔۔۔

جب ''ہی'' خود حرف تاکید ہے تو اس کے ساتھ کوئی اور حرف تاکید، مثلاً ''صرف'' لانا غیر ضروری ہے:

غلط: صرف ایک ہی شخص کی گواہی پر سزا ہو گئی۔

صحیح: صرف ایک شخص/یا، ایک ہی شخص۔۔۔

غلط: انھوں نے صرف ایک ہی روپیہ دیا۔

صحیح: انھوں نے صرف ایک روپیہ۔۔۔/انھوں نے ایک ہی روپیہ۔۔۔

ہیجڑا وہ مرد جو اپنے اعضاے مردمی قطع کر کے عورتوں کے طور اور بود باش اختیار کرتے ہیں انھیں ''ہیجڑا'' یا ''ہجڑا'' کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ''زنانہ'' اس مرد کو کہتے ہیں جس کا بدن علی حالہ رہتا ہے لیکن جو عورتوں کے طریق اور بود و باش اختیار کرتا ہے، مصحفی ؎

نہیں آدمیت کا دلی میں چرچا جدھر دیکھو ہجڑے زنانے بہت ہیں

اس لفظ کے دونوں تلفظ اور املا رائج ہیں، مع تحتانی [ہیجڑا] بھی اور بدون تحتانی [ہجڑا] بھی، لیکن آخر میں ہاے ہوز لگانا [ہجڑہ/ہیجڑہ] اب غلط ہے۔

ہیچ یہ لفظ بہت پرانا ہے، لیکن بعض قدیم ترین فارسی لغات جو میں نے دیکھے، ان میں نہیں ملا۔ ''موید الفضلا'' (۱۵۱۹) غالباً سب سے قدیم فارسی لغت ہے جس میں ''ہیچ'' درج ہے۔ ''موید'' میں اس لفظ کے حسب ذیل معنی لکھے ہیں: ''معدوم، چیزے، و چیزے نہ''۔ ''موید الفضلا'' میں سند شاذ و نادر ہی دی گئی ہے، وہاں ''ہیچ'' کے کسی معنی کی سند نہیں۔ لیکن نظیری کا شعر ہے، اگرچہ ''موید'' کے ذرا بعد کا ہے ؎

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اردو میں "ہیچ" کے معنی کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ "معدوم" اور "چیزے نہ" کے مفہوم میں تو اسے کثرت سے برتتے ہیں، لیکن "چیزے"، یعنی "کچھ، کوئی چیز" کے معنی میں اردو کی سند بہت مشکل سے ملے گی، لیکن بالکل معدوم بھی نہیں۔ میر سوز ؎

بس سوز کے پہلو سے سرک جاؤ طبیبو عاشق کی نہیں مرگ سوا اور دوا ہیچ

یہاں "ہیچ" بمعنی "چیزے" قرار دے سکتے ہیں، لیکن دو امکانات اور بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصرعے کی نثر یوں بھی ہو سکتی ہے: عاشق کی [دوا] مرگ سوا نہیں، اور دوا ہیچ [ہے]، یعنی "اور سب دوائیں معدوم ہیں، کوئی دوا نہیں۔" دوسرا امکان یہ ہے کہ یہاں "ہیچ" دکنی معنی میں کلمۂ تاکید یا حرف حصر ہو، یعنی "ہی" کے معنی رکھتا ہو۔ اب نثر یوں ہوگی: مرگ سوا عاشق کی دوا ہیچ نہیں، "یعنی" دوا ہی نہیں۔"

کلمۂ تاکید یا حرف حصر کے طور پر جنوبی ہند میں "ہیچ" کثرت سے بولا جاتا ہے، اور وہاں نفی کی بھی شرط نہیں: "یہ توئی اچ" بمعنی "یہ تو ہے ہی"؛ "یہ تو اس کا گھر اچ ہے" بمعنی "یہ تو اس کا گھر ہی ہے" طرح کے فقرے وہاں عام ہیں۔ دکنی کا امکان میں نے اس لئے ظاہر کیا کہ اس بات سے کم لوگ واقف ہیں کہ اٹھارویں صدی کی دہلی اور دکن میں بہت سے استعمالات و محاورات مشترک تھے۔ "ہیچ" کی ردیف میں بہادر شاہ ظفر کے دیوان اول میں ایک غزل کے بعض شعر ہمارے مفید مطلب ہوں گے ؎

جن نامور وں کے کہ جہاں زیر نگیں تھا
اب ڈھونڈے تو ان کا ہے کہیں نام و نشاں ہیچ

یہاں کئی امکانات ہیں:

(۱) استفہام و استعجاب: "اب تو ڈھونڈے تو کہیں ہے ان کا نام و نشاں؟ کچھ بھی نہیں، کہیں بھی نہیں۔"

(۲) "ہیچ" حرف تاکید: "۔۔۔ کہیں نام و نشاں ہیچ [ہی] ہی؟"

(۳) "ہیچ" بمعنی "کچھ": "۔۔۔ کہیں کچھ نام و نشاں ہے؟"

مندرجہ ذیل میں "معنی" "کچھ، چیزے" بالکل صاف ہیں ؎

جو ہوتی ہے ہوگی نہیں امکاں کہ نہ ہووے   پھر فکر سے کیا فائدہ غیر از خفقاں ہیچ

یعنی: "خفقاں کے سوا کچھ/کوئی فائدہ نہیں۔" لیکن ان معنی میں اب "ہیچ" شمالی ہند کی زبان میں بہت اجنبی معلوم ہوتا ہے، شاعری میں شاید چل جائے۔

یسین/ یاسین "نوراللغات" میں درج ہے، اور صحیح درج ہے، کہ یہ قرآن پاک کی ایک مشہور سورۃ ہے۔ وہاں یہ بات درج ہونے سے رہ گئی کہ یہ حضور سرور کائناتؐ کے اسمائے پاک میں سے ایک نام بھی ہے۔ "آصفیہ" میں لکھا ہے کہ یہاں "سین" دراصل "سید" کا مخفف ہے، اور "یاسین" کے معنی ہیں "یا سید [البشر]"۔ اس تفسیر کے بارے میں کچھ کہنا میرے لئے فی الوقت ممکن نہیں۔ جناب عقیل الغروی نے مجھے بتایا ہے کہ "اکثر عرفا اس کے معنی 'اے انسان کامل' بتاتے ہیں۔ بعض نے 'یا سامع الوحی' بھی لکھا ہے۔" اردو میں "یسین" اور "یاسین" دونوں مستعمل ہیں اور مذکر اسما بھی ہیں۔

یائے اضافت یائے اضافت چونکہ کسرۂ اضافت کی قائم مقام ہے لہٰذا اس کے ساتھ ہمزہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اب اس پر ہمزہ لگانے کا رواج بہت عام ہے، اس لئے اسے درست کہنا چاہئے۔ مثلاً حسب ذیل دونوں صورتیں ٹھیک ہیں:

افشاے راز/ افشائے راز؛ بالاے بام/ بالائے بام؛ براے خدا/ برائے خدا؛ دعواے الفت/ دعوائے الفت؛ صحراے اعظم/ صحرائے اعظم

اس پر اور اضافتوں کو قیاس کر لیجئے۔ بس یہ خیال رہے کہ جو طرز اپنائیں (بلا ہمزہ یا مع ہمزہ) اس کی پابندی ہمیشہ کریں۔ مزید دیکھئے: "الف"۔

یائے زائدہ فارسی میں حسن کلام یا ضرورت کلام کے لئے یائے زائدہ کا استعمال عام ہے، خاص کر ایسے الفاظ میں جو الف یا واو پر ختم ہوتے ہیں:

آمدند/ آمدندے [دونوں ہم معنی]؛ بفرما/ بفرمائے؛ پا/ پاے؛ جا/ جاے؛ جو/ جوے؛ خدا/ خداے؛ فرما/ فرماے؛ مومیا/ مومیائی؛ مو/ موے؛ ہما/ ہماے، وغیرہ۔

فارسی سے یائے زائدہ کی کچھ مثالیں ذیل میں درج ہیں:

ہر ورقے دفترے ست معرفت کردگار (سعدی، گلستان)

ز گوش پنبہ بروں آر و داد خلق بدہ

اگر تو می ندہی داد روز دادے ہست (سعدی، گلستان)

ہر کارے و ہر مردے (کہاوت)

شاہد آن نیست کہ موئے و میانے دارد

شاہد آنست کہ ایں دارد و آنے دارد (حافظ)

درد آنست کہ صیاد مرا چیدا نے

در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم رفت (نعمت خان عالی)

گر نہ نوا ہا سرودے چہ غم است

من کہ یتیم گر نبودے چہ غم است (غالب)

اردو والوں نے اسے چند ہی الفاظ پر جاری کیا ہے۔ دیکھئے ''بلائے''، دیکھئے ''جائے''۔ حقیقت یہ ہے کہ یائے زائدہ کی مدد سے کلام میں خوبی اور آسانی بے تکلف حاصل ہوتی ہے۔

یتیم اول مفتوح، جس بچے کا باپ نہ ہو اسے اردو میں ''یتیم'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں یہ صورت نہیں، وہاں جس بچے کے باپ ماں دونوں نہ ہوں اسے Orphan کہا جاتا ہے۔ بے ماں کے بچے کو اردو میں ''یسیر'' (اول مفتوح، یائے معروف) کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لئے کوئی لفظ مروج نہیں۔ ''در یتیم'' بمعنی ''بہت بڑا [لہذا بہت چمک دار بھی] موتی'' اس لئے وضع ہوا کہ سیپ میں اکثر ایک سے زیادہ چھوٹے موتی ہوتے ہیں۔ اگر کسی صدف میں ایک ہی موتی ہو تو وہ قدرتاً بڑے حجم اور وزن کا ہوگا۔ لہذا ''در یتیم'' اصلاً وہ موتی ہے جو سیپ میں اکیلا ہو۔

یسیر دیکھئے ''یتیم''۔

یشب اول دوم مفتوح، یا بقول بعض، دوم ساکن۔ ایک قیمتی پتھر، اسے ''یشم'' بھی کہتے ہیں۔ دینی پرشاد سحر بدایونی مرحوم نے لکھا ہے کہ صحیح لفظ بائے فارسی کے ساتھ ''یشپ'' ہے، لیکن اس کی سند نہ ملی۔ اردو میں تو بہر حال ''یشب'' ہی درست ہے۔ ''یشم'' اردو میں بہت کم برتا گیا ہے۔

یکسانیت ''ایک طرح کا ہونا؛ مشابہ ہونا'' کے معنی میں ''یکسانی'' کے ہوتے ہوئے ''یکسانیت'' غیر ضروری ہے بلکہ الجھن پیدا کرتا ہے۔ لیکن اب بعض لوگ ''یکسانیت'' کو ''عدم تنوع'' کے معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً:

ان کے اشعار میں یکسانیت بہت ہے [یعنی سب ایک ہی انداز کے ہیں، کوئی تنوع نہیں]۔

ان معنی میں ''یکسانیت'' کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض لوگ اسے اس لئے غلط سمجھتے ہیں کہ فارسی لفظ ''یکساں'' پر یائے فاعلی لگا کر ''یکسانی'' تو بن سکتا ہے، لیکن اس پر عربی کی تائے مصدری لگا کر ''یکسانیت'' بنانا غلط ہے۔ یہ استدلال صحیح نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کئی بار کہہ چکے ہیں، زبان میں وہ سب صحیح ہے جو رائج ہو گیا، خواہ کسی اور زبان کے لحاظ سے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ ''اپنائیت'' اس کی بہت اچھی مثال ہے، کہ اس میں دیسی ''اپنا'' پر اپنے دیسی انداز میں ہمزہ لگایا، اور پھر عربی یائے مصدری لگا کر ''اپنائیت'' بنا لیا۔ دیکھئے ''اپنائیت''۔

یگانگت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''یگانہ'' فارسی لفظ پر عربی کی تائے مصدری لگانا غلط ہے، لہٰذا ''یگانگت'' درست نہیں، ''یگانگی'' ہونا چاہئے۔ یہاں پہلی بات تو وہی ہے جو میں جگہ جگہ لکھ چکا ہوں، کہ یہ لفظ عربی کا ہے ہی نہیں، ہمارا بنایا ہوا ہے اور رائج ہو چکا ہے۔ میکش اکبر آبادی نے اعجاز صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں ''احساس یگانگت'' لکھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''یگانگی'' ہمارے یہاں دوسرے معنی میں ہے۔ ''یگانگی'' کے معنی ہیں ''یگانہ ہونا''، یعنی یہاں یائے مصدری لگا کر فعل بنایا گیا ہے۔ ''یگانگت'' کے معنی ہیں ''قرابت، دوستی، مونسی، جذباتی ہم آہنگی'' وغیرہ۔ ''نور اللغات'' میں بھی یہ لفظ انھیں معنی میں درج ہے۔ وہ الگ الگ معنی میں یہ دو الگ الگ لفظ ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک لفظ کو کم کرنے میں نقصان ہے۔

یگانگی دیکھئے ''یگانگت''۔

یورش ترکی میں واؤ معدولہ اور سوم مضموم کے ساتھ اس لفظ کا تلفظ ''یُرش'' بروزن ''پُرش'' ہے۔ اردو میں واؤ معدولہ اور حرف سوم کے ساتھ ''یُرش'' بروزن ''خورش'' صحیح اور رائج تلفظ ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اردو/ترکی میں اس کا صحیح املا واؤ معدولہ کے بغیر ''یرش'' ہے۔ اس کی کوئی

سند نہیں۔ واؤ معدولہ اس لفظ میں اعراب بالحرف کا کام کر رہی ہے۔ اردو کے لوگ اسے ''یورش'' (واؤ ملفوظ و معروف، سوم مکسور) بھی بولتے ہیں۔ یہ تلفظ اس قدر مروج ہے کہ اسے بھی صحیح قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ امکان ہے کہ کچھ مدت میں ''یورش'' (واؤ ملفوظ و معروف، سوم مکسور) ہی ہر طرف رائج ہو جائے گا۔

یوروپ اس براعظم (Europe) کا تلفظ اردو اور انگریزی میں ایک ہی ہے، یعنی واؤ معروف کے ساتھ سوم مفتوح، بر وزن ''صورت''۔ ہندی میں اسے ایک واؤ مزید کے ساتھ یوں لکھتے بولتے ہیں کہ پہلی واؤ کو معروف اور دوسری واؤ کو مجہول ادا کرتے ہیں۔ اردو میں ہندی تلفظ اور املا کو اختیار کرنا اردو سے بے خبری اور ہندی کی اندھی تقلید کے ثبوت کے سوا کچھ نہیں۔ اردو میں ''یوروپ'' قطعاً غلط ہے۔

یوز اول مفتوح۔ تیندوے کی طرح کا ایک شکاری جانور۔ یہ لفظ ہمیشہ مذکر ہے، اس کا مونث کچھ نہیں۔ دیکھئے ''تانیث سے عاری نام، جانوروں کے''۔

یونانی الفاظ کا املا، انگریزی میں دیکھئے: ''گذرنا''۔

یوون اول سوم مفتوح، بمعنی ''جوبن''، ہندی میں ہے۔ اردو میں صرف ''جوبن'' ہے (اول سوم مفتوح)۔ لیکن بعض لوگ ''خالص'' زبان کے چکر میں، یا ہندی کے زیر اثر اردو میں بھی ''یوون'' لکھنے لگے ہیں۔ اردو میں ''یوون'' غلط ہے۔ لیکن یہ لفظ اس لئے دلچسپ ہے کہ اس میں اصل سنسکرت (تت سم) سے اردو (تدبھو) بنانے کے بارے میں دو اصولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تت سم کی ''یائے''، تدبھو (یعنی اردو) میں جیم بن جاتی ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تت سم کی واؤ، تدبھو (یعنی اردو) میں ب بن جاتی ہے۔ چنانچہ ''یوون'' تت سم ہے، اس کا تدبھو ''جوبن''۔ ''یمنا'' تت سم ہے، اس کا تدبھو ''جمنا'' ہے۔ ''وِش'' تت سم ہے، ''بِس'' تدبھو ہے۔ ''ویش'' تت سم ہے، ''بھیس'' تدبھو ہے۔ ''ایودھیا'' تت سم ہے، ''اجودھیا'' تدبھو ہے۔ ''ورشا'' اور ''ورش'' تت سم ہیں، ''برکھا'' اور ''برس'' تدبھو ہیں۔ ''خالص پسند'' لوگ تت سم کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ زبان کی حرکی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں، ان کی نظر میں تدبھو ہی زندہ لفظ ٹھہرتا ہے۔ اردو نے سنسکرت تت سم لفظوں کو اکثر تدبھو بنا لیا ہے یا تت سم کی شکل اپنی

آسانی کے موافق کر لی ہے، جیسے ''کشیتر'' کی جگہ ''کھیت''، ''برکش'' کی جگہ ''برکھ''، ''مترا'' کی جگہ ''میت''، اور کبھی کبھی تدبھو کو بالکل ترک کر دیا ہے، جیسے ''مرگ'' کی جگہ ''ہرن/آہو'' قبول کیا، لیکن ''ہرن کی کھال کی بنی ہوئی چٹائی کے لئے ''مرگ چھالا'' بنا کر رائج کر لیا۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو سنسکرت سے اردو کا استفادہ انتہائی تخلیقی رہا ہے اور سنسکرت تدبھو الفاظ ہماری زبان کی بڑی شانوں میں سے ایک شان ہیں۔ دیکھئے ''تت سم''۔

یہاں دیکھئے ''ہاں''۔

تمام شد بحمد اللہ

الحمد للہ الخلاق اللوح والقلم کہ ایں کتاب مستطاب موسوم
بہ ''لغات روزمرہ'' من تصنیفات بندۂ عاجز بارگاہ ایزدی المشتہر بہ
شمس الرحمن فاروقی در شہر فرخندہ بنیاد و مینو سواد جہان آباد بہ اہتمام
دکتور خلیق انجم طال اللہ عمرہ و زیر انتظام و انصرام انجمن ترقی اردو
(ہند) دہلی نو در ۱۴۳۲ سنہ ہجرت رسالت مآب و ۲۰۱۱ میلادی
انطباع یافت

اشاریۂ الفاظ

(الف)

(چ)

(خ)

(ڈ)

اشاریۂ اسما

الف اور ب کے نام

کہ وہ بڑی ہو کر ان اوراق کو پڑھیں

دوسری زبانوں کے ناول

خیمہ
میرال الطحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
لیلیٰ العلمی
انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن
Rs.100

سرزمین مصر میں جنگ
یوسف القعید
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.125

پہلی بارش
خولیولیا مازاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

درخت نشیں
اتالو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

انگی کے دیس میں
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

قلب ظلمات
جوزف کونریڈ
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

تمس
بھیشم ساہنی
ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.100

نوکر کی قمیض
ونود کمار شکل
ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال
Rs.75

بوفِ کور
صادق ہدایت
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
(نیا ایڈیشن زیرِ طبع)

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت :80روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت :90روپے

انیس
(سوانح)
قیمت:375روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت:280روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت:70روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت:200روپے

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن زیر طبع)

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی
معاشرت کا ایک مطالعہ
مؤلف: اختر حسین بلوچ
Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)
(تیسرا ایڈیشن)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

تبادلہ
(ناول)
وبھوتی نرائن رائے
ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی
Rs.200

انکی کے دیس میں
(ناول)
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن زیرِ طبع)

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی
معاشرت کا ایک مطالعہ
مولف: اختر حسین بلوچ
Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)
(تیسرا ایڈیشن)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

تبادلہ
(ناول)
وبھوتی نرائن رائے
ہندی سے ترجمہ: ثریا علوی
Rs.200

انگلی کے ویس میں
(ناول)
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

زندہ زبانیں بدلتی رہتی ہیں۔ الفاظ و استعمالات کے رد و قبول کا مسلسل عمل اس تبدیلی، اور اس کے باعث زبان کی زندگی کا ضامن ہے۔ لیکن کسی وقت کسی زبان میں کیا ہو رہا ہے، جو تبدیلیاں آ رہی ہیں وہ کس نوعیت کی ہیں، وہ صحت مند رجحانات کی آوردہ ہیں یا سہل انگاری اور لاعلمی کا نتیجہ ہیں؟ ان سوالوں پر غور کرنا اور نئے پرانے الفاظ و استعمالات کو چھان بین کے عمل سے گزارنا بھی زبان کے سنجیدہ طالب علم کے اہم ترین فرائض میں ہے۔ تبدیلی کو آنکھ بند کر کے قبول کرنا، یا نئے پرانے لفظوں کو کسی مصنوعی تصورِ اصلاح یا تصورِ ارتقا کے دباؤ میں آ کر مسترد کرنا، یہ دونوں رجحانات ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والوں کا شیوہ نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ کوئی زبان بھی "بالکل خالص حالت" میں نہیں ہوتی۔ لیکن "معیاری زبان" کا ایک خیالی تصور ہر ترقی یافتہ زبان میں ہوتا ہے۔ اردو میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ زبان کو برتنے والے وقتاً فوقتاً اسی خیالی تصورِ زبان سے استفادہ کرتے ہیں، اور ہر ترقی یافتہ زبان اسی تصور کے مطابق ارتقا کرتی ہے۔ زبان ایسی شے ہے جو بیک وقت ماضی اور حال میں موجود رہتی ہے اور اپنی دونوں حیثیتوں میں ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے اندراجات میں زیادہ تر بحث ان ناپسندیدہ الفاظ، فقروں اور لسانی اختراعات سے ہے جو غیر ضروری طور پر، یا کچھ بولنے والوں کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے باعث ہماری زبان میں در انداز ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں، بہت سے لغات کے مختلف فیہ تلفظ، یا ہجے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کچھ اندراجات ایسے ہیں جن کا براہِ راست تعلق جدید روزمرے سے شاید نہ ہو، لیکن جو لسانی یا تاریخی حیثیت سے دلچسپی کے حامل ہیں اور زبان کے طالب علم، یا اس کے سنجیدہ استعمال کرنے والے کے لیے سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رواجِ عام کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، یعنی بااصالت بولنے والوں کے قول اور عمل کو کتبی اور کتابی رایوں پر تفوق دیا گیا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں علاقائی تلفظ اور استعمالات کو مناسب جگہ دی گئی ہے۔ کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں نئے اندراجات کثرت سے بڑھائے گئے ہیں اور پرانے اندراجات کے لیے بھی حسبِ ضرورت توضیحی عبارتیں شامل کی گئی ہیں۔ اشاریہ الفاظ کو نئے اندراجات کی روشنی میں دوبارہ مرتب کیا گیا ہے اور ایک نیا اشاریہ اسما بھی شامل کیا گیا ہے۔

ISBN 978-969-8380-83-0
9 789698 380830 >

Rs.400